ہماری ویب ڈیجیٹل بک

سعید اللہ سعید

SAEED ULLAH

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Saeed Ullah"
at Hamariweb.com

امریکی فوج نے قرآن پاک کیوں جلاے؟

افغانستان میں موجود امریکی فوج کے اہلکاروں کی جانب سے بگرام ائیر بیس پر قرآن مجید کے کئی نسخے شہید کرنے کے بعد افغانستان کے غیور عوام قابض فوجوں کے خلاف سخت احتجاج کر رہے ہیں،اور احتجاج کے دوران اب تک تقریبا ایک درجن مظاہرین شہید جبکہ درجنوں دیگر زخمی ہو چکے ہیں۔ گو کہ افغان عوام کے غیض و غضب دیکھنے کے بعد افغانستان میں تعینات نیٹو افواج کے امریکی کمانڈر جنرل جان ایلن اور اسکے بعد امریکی وزیر دفاع لیون پنیٹا اور وہائٹ ہاؤس کے ترجمان جے کارنی نے بھی افغان عوام سے مذکورہ اقدام پر معافی مانگی ہے۔ لیکن افغان عوام اور افغان اراکین پارلیمنٹ نے نہ صرف امریکی معافی کو مسترد کر دیا ہے بلکہ افغان اراکین پارلیمان نے افغان حکومت سے مطالبہ کیا ھے کہ وہ امریکہ کے خلاف اعلان جہاد کرے اور اس ضمن میں انہوں نے ایک قرارداد بھی جمع کرادی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بلا کر امریکہ کے خلاف اعلان جہاد کیا جائے۔

قارئین کرام ! آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کا تجزیہ ضروری ہے کہ آخر وہ کیا وجہ تھی کہ جسکی وجہ سے امریکی فوج نے مسلمانوں کی مقدس ترین کتاب کے کئی نسخے جلا ڈالے۔۔۔۔۔۔؟؟؟ قارئین محترم ! امریکہ نے جس وقت افغانستان پر حملہ

کیا تھا تو امریکہ کا خیال یہ تھا کہ بس چند ہفتوں میں ہم افغانستان کے سیاہ و سفید کے مالک ہو جائینگے، یہ خیال نہ صرف امریکہ کا تھا بلکہ بلکہ دنیا کے کئی ممالک بالخصوص مسلم ممالک بھی یہی سوچ رکھتے تھے کہ نہتے افغان کہاں تک جدید ٹیکنالوجی اور ہر قسم کے جدید ہتھیاروں سے لیس امریکہ کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اور اسی زعم میں مبتلا ہو کر امریکہ نے ۴۱ حواریوں کو ساتھ ملا کر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اور اس حملے کے لیے پاکستان کے اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے امریکہ کو ہر طریقے سے بھرپور سپورٹ دیا۔ امریکہ نے حملہ تو کر دیا لیکن یہ نا سوچا کہ دنیا کے دیگر مسلم ممالک کی طرح افغان عوام اپنے دین سے بے خبر نہیں بلکہ وہ تو آج بھی قرآنی احکامات پر جان دینا اپنے لیئے قابل فخر بات سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لہذا امریکی حملے کے بعد افغان عوام نے قرآن پاک کو اپنے لیئے مشعل راہ بناتے ہوئے سپرپاور امریکہ کے خلاف مزاحمت شروع کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ امریکہ اور اسکے حواریوں کے قدم افغانستان میں ڈگمگانے لگے اور آج دس سال کے بعد دنیا دیکھ رہی ہے کہ امریکہ آج انہی طالبان سے مذاکرات کے بھیک مانگ رہا ہے جنھیں کل تک وہ انسان بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ قارئین کرام! آج یہ سوال اٹھتا ہے کہ بے سرو سامانی کے عالم میں لڑنے والے طالبان عالم کفر کے مقابلے میں کامیاب کیسے ہوئے؟ تو اسکا جواب نہایت آسان اور سیدھا سا ہے کہ طالبان نے ہر قسم کے لالچ اور دھمکیوں کے باوجود جب احکام قرآنی کو ترجیح دی تو پھر اللہ پاک رب العزت نے بھی

قرآن میں کیے ہوئے اپنے وعدے کو پورا کیا اور ظالم امریکہ اور اسکے ساتھیوں کو ذلیل و خوار کر دیا۔۔۔۔امریکہ نے جب دیکھا قرآن میں آج سے چودہ سو سال قبل اللہ پاک نے اپنے وعدے کو پورا کیا اور ہماری جدید ٹیکنالوجی مکمل طور پر ناکام ہوئی۔تو ۔انہوں نے قرآن شریف سے بدلہ لینے کی کوشش کی اور قرآن پاک کو شہید کر ڈالا

قارئین گرامی ! امریکیوں کی جانب سے قرآن پاک کی بے حرمتی کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں بلکہ بد بخت امریکیوں نے اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ

افغانستان، عراق، گوانتاموبے اور خود امریکہ کے اندر قرآن مجید کی بے حرمتی کی ہے۔

گوکہ امریکی بدمعاشیوں کے جواب افغان عوام خوب دے رہے ہیں لیکن مسلمانوں ! یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ قرآن کا حفاظت صرف افغانوں کے ذمے نہیں بلکہ ہماری بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم بھی قرآن کی حفاظت کے لیے میدان میں نکلے۔ لہٰذا مسلمانوں ! اور بالخصوص مسلم جوانوں ! آئیں قرآن پاک سیکھیں اور سمجھیں اور اس پر عمل کرکے اسکا پیغام دنیا بھر میں پہنچائیں تاکہ دنیا سے امریکہ سمیت تمام ظالم قوتوں کا ۔خاتمہ ہو جاۓ اور دنیا میں اسلام کا بول بالا ھو جائے۔اللہ پاک ہمارا حامی و ناصر ہو

!!! یہ ھم کہاں جا رہے ہیں-----

یہ اللہ تعالٰی کا ھم مسلمانوں پر بے انتہا رحم و کرم ھے کہ اس عظیم رب نے نہ صرف ہمیں مسلمان پیدا کیا بلکہ ھمیں ایک ایسا دین یعنی دین اسلام بھی عطاء کیا کہ جو ھمارے لیے پیدائش سے لیکر قبر کی آغوش تک مشعل راہ ھے۔

قارئین گرامی ! دین اسلام نہ صرف ہمیں زندگی کے ھر معاملے میں مثلا:۔ والدین کے حقوق،اولاد کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق پڑوسیوں، رشتہ داروں کے حقوق، میدان جنگ سے لیکر زمانہ امن تک غیر مسلموں کے حقوق کے ساتھ ساتھ زراعت سے لیکر تجارت تک کے اصول الغرض زندگی کے ہر ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت اور گائیڈ لائن دیتا ھے بلکہ اسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ھے کہ جب تم میں سے یعنی مسلمانوں میں سے کوئی انتقال کر جائے تو اس کے بعد کیا کرنا ھے۔یعنی مردے کو کیسے غسل دینا ھے،کیسے دفنانا ھے اور کب تک اسکا غم منانا ھے۔الغرض دین اسلام ہمیں پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر کے لیے مکمل رہنمائی فراہم کرتا ھے۔ اور تاریخ اس بات کا گواہ ھے کہ جب تک بحثیت مجموعی مسلمانوں نے دین اسلام سے اپنا تعلق جوڑے رکھا وہ اس دنیا میں ھر لحاظ سے کامیاب رھے۔ اور اج بھی اگر ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑا کے دیکھے

تو ہمیں نظر آ جائیگا کہ اسلام اور اس کے اصولوں پر کاربند لوگ آج بھی سکون واطمینان کی زندہ گی گزار رھے ھیں۔۔۔۔۔اسلام کی انہی مندرجہ بالا خوبیوں سے متاثر ھو کر آج اہل کفر جوق در جوق مسلمان ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ھو رہے ہیں اور جب بھی آپ کسی نو مسلم سے انکے چھوڑے ہوئے دین اور پھر دین اسلام کے متعلق پوچھیں گے تو وہ یہی کہے گا کہ پہلے زندگی میں سب کچھ ھونے کے باوجود سکون میسر نہ تھا جب کہ اسلام قبول کرنے کے بعد سکون ھی سکون ھے۔ لیکن اور صد افسوس کہ مندرجہ بالا تمام تر حقائق کے باوجود ھم مسلمان دین سے دور ھوتے جا رہے ہیں۔ قارئین ! یہ ایک کڑوا سچ ھے کہ آج ھم مسلمانوں میں سے اکثریت نے دین کو اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے بلکہ المیہ تو یہ ھے کہ آج ہم اپنے مردوں کو بھی غیر مسلموں کی طرح خراج عقیدت پیش کرنے لگے ہیں۔آج ہم اپنے فوت شدہ احباب کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی ،نوافل اور صدقات دینے کی بجائے ان کے یاد پھول چڑھا رھے ہیں اور شمعیں روشن کر رہے ہیں۔اور قارئین ! ایسے مناظر آج کل اکثر و بیشتر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔اور ایک ایسا ہی منظر جمعرات یکم مارچ ۲۰۱۲ کے دن سوات سے شائع ہونے والے ایک روزنامے ۔۔ روزنامہ آزادی سوات،، میں میری نظروں سے گزرا جس میں پاک آرمی کے کرنل رینک کا ایک افسر،ملالہ یوسفزئی کے ہمراہ ایک تقریب میں آج سے ۴سال قبل حاجی بابا سکول نزد حاجی بابا چوک مینگورہ سوات میں ہونے والے حملے کے نتیجے میں جاں بحق افراد کی یاد میں شمع روشن کر رہے تھے۔ اور یہ کام اب

تقریباً کافی سارے علاقوں میں اب ھونے لگا ھے۔ لیکن میرا ان تمام لوگوں سے صرف اور صرف ایک ھی سوال کہ کیا آیا آپ لوگوں کے ان حرکتوں سے یعنی مردوں کی یاد میں شمعیں روشن کرنے ان مردوں یعنی وفات شدگان کو کوئی اجر و ثواب بھی ملتا ھے، یا یہ کہ صرف آپ لوگوں کو کفار کی نقالی مقصود ہیں۔۔۔۔۔۔؟

آخر میں صرف اتنا کہ خدارا انگریز کی نقالی کو چھوڑ کر نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے غلامی میں آجائیں کہ یہی ایک راستہ ہے جو باعث افتخار بھی ہے اور باعث نجات بھی۔۔۔۔۔۔!!!

فریال کا قبول اسلام

پاکستان ایک ایسا واحد اسلامی ملک ھیں کہ جو ایک نظریئے کی بنیاد پر بنا ھے۔ اور وہ نظریہ کیا ہے؟ قارئین محترم وہ نظریہ یہ ھے کہ اس ملک میں کوئی کام اسلامی قوانین کے خلاف نھیں ھوگا،اور نا ہی اسلامی قوانین سے متصادم کوئی قانون یہاں بن سکتا ھے - قارئین میں جب بھی قرارداد پاکستان ۔۔ جو کہ مارچ ۱۹۴۰ کو منظور ھوا تھا۔۔ کے وقت اپنے اس وقت کے قائدین کے خطبات ۔۔جو کہ انہوں نے قرارداد پاکستان کے منظوری کے وقت دیئے تھے ۔۔پڑھتا ھوں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ھے -اور میں سوچنے لگتا ھوں کہ ھم کیسی قوم ھیں اور ھمارے حکمران بھی بھلا کیسے حکمران ھیں کہ جو ۶۵ سال گزرنے کے باوجود بھی اپنے اکابرین کے خوابوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔

قارئین ! آج ھم جس پاکستان میں رہ رہے ہیں یہ وہ پاکستان ھرگز نہیں کہ جسکا خواب ھمارے بزرگوں نے دیکھا تھا- ھمارے اکابرین تو ایک وہ ایسا پاکستان چاھتے تھے کہ جہاں نہ صرف اسلام کا بول بالا ھوتا بلکہ وہ اپنے پیچھے رہ جانے والے مظلوم ھندوستانی مسلمانوں کی نا صرف خبرگیری کرتے بلکہ انکو ھندوؤں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیئے بھی ھر ممکن کوشش کرتے۔۔۔۔۔۔۔۔ ! لیکن

افسوس کہ آزادی ملنے کے بعد ھم نے اپنے مقاصد سے پہلو تہی کرکے نہ صرف آدھا پاکستان گنوادیا بلکہ باقی آدھے پاکستان کو بھی اسلامی اصولوں کے بجائے انگریزوں کے حکم پہ آج تک چلا رہے ہیں ۔

قارئین اس ملک کے کرتا دھرتا لوگوں نے جن میں حکمران ، میڈیا خصوصا الیکٹرانک میڈیا ،این جی اوز اور نام نہاد سول سوسائٹی شامل ھیں ھر ھر موقع پر ثابت کردیا ھے کہ وہ اسلام اور پاکستان سے زیادہ اغیار کے وفادار ہیں ۔اور اسکی مثالیں ھمارے سامنے موجود ہیں مثلا: ریمنڈ ڈیوس کیس،ڈرون حملوں پر مجرمانہ خاموشی ،پارلیمنٹ کے قراردادوں کو نظر انداز کردینااور ابھی تازہ مثال نو مسلمہ فریال کی شکل میں ھمارے سامنے ہیں ۔

قارئین کرام ! عالمی اور پاکستانی قوانین کے مطابق ھر عاقل،بالغ اور باشعور لڑکی کو یہ حق حاصل ھے کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاھے شادی کرکے زندگی گزار سکتی ھے ۔

جہاں تک فریال بی بی کا قبول اسلام کا تعلق ھے تو فریال صاف کہہ چکی ھے کہ اس نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ھوکر اسلام قبول کیا ھے اور اس کے اوپر کسی نے اسلام قبول کرنے کہ لیئے دباؤ نہیں ڈالا ۔فریال کی اپنی مرضی سے قبول اسلام کے بعد تو میرے خیال میں خود حکومت پاکستان کو چاہیئے تھا کہ وہ نو مسلمہ کو سرکاری سطح پر مبارک باد دیتے اور انکو ھر قسم کی تحفظ دیتے

کیونکہ کسی غیر مسلم کا قبول اسلام اس ملک کے لیئے کسی سعادت اور اعزاز سے کم نہیں لیکن یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے، یہاں تو فریال شاہ کو حاصل حقوق اور اسکی مرضی کے خلاف ان پر یہ دباؤ ڈالا جارھا ھے کہ وہ دوبارہ ھندو بن جائے۔ اور اس کام میں میڈیا کے بعض گروپ، حکومت کے اعلی عہدیدار، بعض وکلاء، انسانی حقوق کی نام نھاد تنظیمیں، ھندوستانی حکومت اور پاکستان میں موجود ھندو لوگ سب کے سب شریک ھیں۔ لیکن میرا ان تمام گروپس اور لوگوں بالخصوص اس سازش میں شریک مسلمانوں سے صرف اور صرف ایک ہی سوال ھے کہ کیا پاکستانی قانون میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنا یا اپنی مرضی سے شادی کرنا کوئی جرم ھے۔۔۔ اگر تو یہ کام جرم ھے تو برائے مہربانی دلیل سے جواب دے کہ کیسے ؟ لیکن اگر فریال نے کوئی جرم نہیں کیا ھے بلکہ صرف اپنا وہ حق استعمال کیا ھے جو کہ اسلام اور پاکستانی قانون نے اسے دیا ھے، تو پر آپ سب کی خدمت میں عرض ھے کہ کسی کے دباؤ یا لالچ میں آکر اپنا آخرت برباد مت کیجیئے۔ بلکہ فریال اور اسکے شوھر کی مدد کرکے اپنا دینی اور ملی فریضہ پورا کیجیئے۔ آخر میں صرف اتنا کہ اللہ پاک فریال سمیت تمام نو مسلموں کو دین اسلام پر ثابت قدم رکھے اور انکے ھر طرح سے مدد فرمائے۔ آمین

مبارکباد کے مستحق بچے

جب سے پاکستان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں شریک ھے تب سے پاکستان کے سابق و موجودہ حکومتوں نے امریکہ و یورپ کی طرح یہاں بھی باعمل مسلمانوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ھے اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ ایک ایسا ملک جو کہ بنا ہی اس لیئے تھا۔ تاکہ یہاں پر اسلام کا ترویج و اشاعت آزادانہ طریقے سے ھوسکے'' میں آج اسلام پر عمل کرنے کے سوا باقی تمام کاموں کی آزادی حاصل ھیں ۔مثلا :۔ اگر آپ پاکستان میں بنے کسی شراب خانے سے شراب حاصل کرنا چاھے تو آپ یہ کام باآسانی کر سکتے ہیں ۔ بس اتنا خیال رہے کہ آپ کے جیب میں سو،پچاس روپے ھونے چاہییے تاکہ اگر ،، محافظین عوام" یعنی پولیس اکو پکڑے تو آپ یہ رقم انکے حوالے کرکے منزل ،، مقصود" باآسانی پہنچ سکے۔ اسی طرح اگر آپ کی کوئی گرل فرینڈ ھے تو آپ انکو بنا کسی روک ٹوک کے کسی بھی پارک یا ریستوران میں لے جا سکتے ھیں ۔اور اس کام کے لیئے آپکو وردی پوش بھائیوں کو چائے پلانے کی بھی ضرورت نہیں پڑیگی ۔اور وہ اس لیئے کہ بھائی آجکل ۔۔روشن خیالی "کا زمانہ ہے ۔ لہذا کوئی بھی اتنا پاگل پن تو نہیں کرے گا کہ آپکے رنگ میں بھنگ ڈال کر انتہا پسندی کا تمغہ اپنے سینے پر سجا لے ۔

لیکن اگر کہیں آپ نے مندرجہ بالا باتوں کے برعکس رویہ اپنایا تو یاد رکھیں آپ کے اوپر انتہا پسندی کا لیبل بھی لگ سکتا ھے ۔اگر کہیں آپکی داڑھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ھے اور آپکے شلوار کے پائینچے ٹخنوں سے اوپر ھیں تو پھر خوب یاد رکھیں کہ حکومت وقت کی نظر میں یا تو آپ طالبان آتنک وادی ھے ،یا پھر القاعدہ کے رکن ھیں ۔اگر کہیں آپ کے دل میں یا ذھن میں بے جا امریکی مداخلت پر تشویش ھے تو پھر اپکا شمار حزب التحریر کے کارندوں میں بھی ھو سکتا ھے ۔اس کے علاوہ اگر آپکی بیوی بہن یا بیٹی باپردہ رھنے کے لیئے برقعہ استعمال کرتی ہیں یا اگر آپ نے اپنے کسی بچے ، کو دنیاوی تعلیم کی بجائے دینی تعلیم دیا اور اسے حافظ قرآن بنادیا ۔ تو پھر تو آپ پرانے خیالات کا مالک ، انتہائی دقیانوسی اور تنگ نظر شخصیت کے مالک ہیں اور ۔۔ موجودہ ۔ معاشرے میں میں آپکی کوئی عزت نہیں

لیکن قارئین کرام ! الحمداللہ جتنا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ مہم پوری دنیا میں بڑھتا چلا جارہاہے ،اس سے کہیں زیادہ لوگوں کی دلوں میں اسلام کو سمجھنے اور اس ۔پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ھورہا ھے

قارئین کرام ! آج اگر ھم جائزہ لے تو ھمیں معلوم ھوتا ھے کہ دہشت گردی کے

خلاف نام نہاد جنگ جو کہ دراصل مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے ۔شروع کرنے کے بعد دنیا بھر میں جس تیزی سے غیر مسلم اسلام قبول اور مسلمان اسکو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کررھے ھیں ۔اسکی مثال ماضی میں بہت کم ملتی ہیں -اور یہ سلسلہ دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی جاری ہیں ۔

قارئین کرام ! پاکستان میں جہاں ایک طرف آج کل اللہ کے خصوصی فضل و کرم غیر مسلم بڑی تعداد میں مسلمان ھورہے ہیں ،تو وہی عام الناس کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کو ترجیح دیتے ہیں ۔اور شاید یہی وجہ ھے کہ پاکستان میں گزشتہ چند سالوں میں حفاظ کرام کی تعداد میں ماضی کے نسبت بہت تیزی سے اضافہ ھورھا ھے ' میرا آج کا یہ مضمون بھی ایسے ہی دو کم سن لڑکوں کے بارے میں ہیں جنھوں نے بہت کم عمری میں قرآن پاک حفظ کرکے نہ صرف اپنے والدین ، اساتذہ بلکہ پاکستان کا نام بھی روشن کردیا ھے ۔ میں نے جب ان ہونہار بچوں کے بارے میں روزنامہ جناح اسلام آباد کے ایڈیشن میں خبر پڑھی تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ان بچوں کے اس عظیم کامیابی کو اپنے فورم یعنی ۔۔ہماری ویب۔کام " کے پلیٹ فارم سے قارئین کرام کے لیئے پیش کردوں ۔ لہٰذا قارئین کرام ! آپ بھی ان بچوں کے کارنامے ملاحظہ فرمائیں-

فتح جنگ کے معروف دینی درسگاہ دارالعلوم پیر احمد شاہ سیالوی کے طالبعلم

قاضی اعتصام اعجاز ولد حافظ غلام سرور (مرحوم) نے ۸ ماہ ۷ دن جبکہ اسی مدرسے کے ایک اور طالبعلم سید یمتاب شاہ ولد عابد حسین شاہ جسکی عمر سات سال ہے نے ۱ سال ۲ ماہ میں قرآن پاک حفظ کرنے کا سعادت حاصل کیا۔

قارئین کرام! خبر آپ نے ملاحظہ فرمائی، اب میں مضمون کے آخر میں حکومت پاکستان سے صرف اتنا گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان ہونہار طالب علموں کے لیئے بھی کسی ایوارڈ کا اعلان کردے اور ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان تقریب کا انعقاد کرکے ان میں انکو وہ ایوارڈ دیے جائیں۔آپ کے اس کام سے نا صرف ان بچوں کا حوصلہ بلند ہوگا بلکہ آپ کے اس کام سے اللہ پاک بھی خوش ہوگا جو کہ بہت بڑی کامیابی ہے-

لیاری آپریشن اور اسکے ممکنہ تباہ کن اثرات

میں اس بات سے انکار نہیں کر رہا کہ لیاری میں بھتہ خور، منشیات فروش یا دیگر جرائم میں ملوث افراد نہیں ہونگے لیکن اسکے باوجود بھی میں سمجھتا ہوں کہ لیاری میں گذشتہ چند روز سے جاری آپریشن غیر ضروری اور حکومتی نا عاقبت اندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہے، میں یہ باتیں اس لیئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ مجھے لیاری کے جرائم پیشہ افراد سے کوئی ہمدردی ھے یا میں انکا حامی ھوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی ایک مسلمان اور ایک محب وطن پاکستانی کے حیثیت سے یہ چاہتا ھوں کہ وطن عزیز سے ہر قسم کے جرائم اور ان جرائم پیشہ عناصر کے سرپرستوں کا مکمل خاتمہ ھوں تاکہ وطن عزیز میں ہر طرف امن و سکون ھو۔

جہاں تک لیاری آپریشن کا تعلق ھے تو میں سمجھتا ھوں کہ یہ ایک سیاسی آپریشن ھے جس میں حکومت اپنی بعض اتحادیوں کے کہنے پر مفاھمت کے نام پر لیاری سے کالعدم پیپلز امن کمیٹی (کہ جسکو اہل علاقہ کی بھرپور تعاون حاصل ہیں) کا خاتمہ کرکے وہاں اسکے مخالفین کو بٹھانا چاہتے ہیں،اس لیئے آپریشن کے حوالے سے حکومتی دعوؤں پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں اور اب تو آپریشن کے خلاف کراچی کے علاوہ اندرون سندھ اور بلوچستان میں بھی احتجاج زور پکڑ رہا ھے

۔اس لیئے حکومت وقت کی ذمہ داری بنتی ھے کہ وہ لوگوں کی آواز سنے اور لیاری میں کشت و خون کے اس کھیل کو فوری روکے ۔

جہاں تک جرائم پیشہ افراد کے خاتمے کا تعلق ھے تو اس پر اہل وطن متفق ھیں کہ ایسے لوگوں کا خاتمہ نہایت ضروری ھے لیکن سوال یہاں پر یہ پیدا ھوتا ھے کہ کیا اسلحے کا بھر مار اور جرائم پیشہ لوگ صرف لیاری میں ھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟ تو اسکا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ اسلحہ اور دہشت گرد خود حکومتی اتحادی جماعتوں میں موجود ہیں ،جس سے حکومتی اتحادی وقتاً فوقتاً کراچی کو یرغمال بناتے رہتے ہیں ۔لہذا زرداری اینڈ کمپنی کی خدمت میں گزارش کہ اگر آپکا مقصد واقعی امن وامان کو قائم کرنا ھے تو اسکے لیئے لازم ہے کہ پہلے بڑے مگرمچھوں پر ھاتھ ڈالا جائے اور اسکے بعد چھوٹے درجے کے دہشت گردوں سے نمٹا جائے۔لیکن اگر آپ (حکومت وقت) کا مقصد محض اتحادیوں کو خوش کرنا ھے تو پھر یاد رکھیں کہ لیاری میں جو آگ حکومت نے بھڑکائی ہے اسکے شعلے اندرون سندھ اور بلوچستان تک بھی پھیل سکتے ہیں اور اگر یہ آگ وہاں تک پھیل گئی تو پھر یاد رکھیں کہ اسکو بجھانا حکومت وقت سمیت کسی کے لیئے بھی ممکن نہیں ھوگا اسی لیئے اہل اقتدار سے گزارش ھے کہ لیاری میں جاری غیر ضروری آپریشن کو فوری بند کیا جائے۔اس سلسلے میں تمام محب وطن پاکستانیوں اور سیاستدانوں سے بھی گزارش ھے کہ وہ آگے بڑھیں اور

-اپنا کردار ادا کریں۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ھو

امریکی عدالت میں ایک پاکستانی "دہشت گرد" کی تقریر

امریکی عدالت میں ایک پاکستانی "دہشت گرد" کی تقریر جس نے بہت سے لوگوں کو رلا دیا

طارق مھنا ایک پاکستانی مصری امریکن ہیں ان کے والدین پاکستان اور مصر سے امریکہ ہجرت کر گئے تھے اور طارق وہیں پیدا ہوئے اور پیدائش سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ انہیں کچھ ہفتے قبل ہی امریکی حکومت نے انٹرنیٹ پر جہادیوں کی حمایت کرنے کے الزام میں کئی سال کے لئے جیل بھیج دیا ہے۔ جس وقت جج انہیں سزا سنا رہا تھا انہوں نے بھری عدالت میں ایک بیان دیا تھا۔ اس جذباتی بیان نے عدالت میں موجود بہت سے لوگوں کو مبہوت کر دیا تھا اور کئی لوگ اپنی آنکھیں پونچھتے دیکھے گئے۔ اس تقریر کے بعد جج نے کہا کہ عدالت صرف قانون کے دائرے میں رہ کر فیصلہ دیتی ہے قانون بناتی نہیں اور امریکی قانون یہی کہتا ہے کہ آپ مجرم ہیں۔ ذیل میں دی گئی تحریر دراصل وہ تقریر ہے جو طارق مھنّا نے ۱۲ اپریل ۲۰۱۲ء کو سزا سنائے جانے پر امریکی جج کے سامنے کی، طارق مھنّا ان بہت سارے لوگوں میں سے ہیں جو اپنی حق گوئی کی بابت امریکی عقوبت خانوں میں قید ہیں اور امریکہ کی اسلام دشمنی کا ہدف بن رہے ہیں۔ آپ ابو سبایا کے نام سے انٹرنیٹ پر جانے جاتے تھے اور بہت موثر مقرر ہیں۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج سے چار سال قبل یہی اپریل کا مہینہ تھا جب میں ایک مقامی ہسپتال میں اپنا کام ختم کرکے گاڑی کی طرف جارہا تھا کہ میرے پاس امریکی حکومت کے دو ایجنٹ آئے ۔ انہوں نے کہا کہ مجھے دو راہوں میں ایک کا انتخاب کرنا ہوگا، ایک راستہ آسان تھا اور دوسرا مشکل۔ 'آسان' راستہ ان کے مطابق یہ تھا کہ امریکی حکومت کا مخبر بن جاؤں اور یوں کبھی عدالت یا قید خانے کی صورت نہ دیکھنی پڑے گی اور دشوار راستہ، سو وہ آپ کے سامنے ہے۔تب سے اب تک ان چار سالوں کا اکثر حصہ میں نے قید تنہائی میں ایک ایسے کمرے میں گزارا ہے جس کا حجم ایک چھوٹی سی الماری جتنا ہے اور مجھے دن کے تئیس گھنٹے اسی میں بند رکھا جاتا ہے۔ایف بی آئی اور ان وکلاء نے بہت محنت کی، حکومت نے مجھے اس کوٹھری میں ڈالنے، اس میں رکھنے، مقدمہ چلانے اور بالآخر یہاں آپ کے سامنے پیش ہونے اور اس کوٹھری میں مزید وقت گزارنے کی سزا سننے کے لئے لوگوں کے ادا کردہ ٹیکسوں کے سینکڑوں ڈالر خرچ کئے۔

اس دن سے ما قبل ہفتوں میں لوگوں نے مجھے بہت سے مشورے دیئے کہ مجھے آپ کے

سامنے کیا کہنا چاہئے۔ کچھ نے کہا کہ مجھے رحم کی اپیل کرنی چاہئے کہ شاید کچھ سزا میں تخفیف ہو جائے، جبکہ دوسروں کی رائے تھی کہ کچھ بھی کرلوں میرے ساتھ سختی ہی کا معاملہ کیا جائے گا۔ تاہم میں بس یہ چاہتا ہوں کہ چند منٹ اپنے بارے میں گفتگو کروں۔

جب میں نے مخبر بننے سے انکار کردیا تو حکومت نے ردعمل کے طور پر مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے دنیا بھر میں مسلم ممالک پر قبضے کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کی حمایت کا 'جرم' کیا ہے۔ یا 'دہشتگردوں' کی جیسا کہ وہ انہیں کہنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ میں کسی مسلمان ملک میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں یہیں امریکہ میں پلا بڑھا ہوں اور یہی بات بہت سے لوگوں کو غضبناک کرتی ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ میں امریکی ہونے کے باوجود ان باتوں پر یقین رکھوں جن پر میں رکھتا ہوں اور وہ موقف اختیار کروں جو میں نے کر رکھا ہے؟ آدمی اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے وہ ایک جز بن جاتا ہے جو اس کا نقطہ نظر تشکیل کرتا ہے، اور یہی حال میرا بھی ہے۔ لہٰذا، ایک نہیں بلکہ بہت سی وجوہات کے سبب میں جو کچھ ہوں امریکہ ہی کی وجہ سے ہوں۔

کا ذخیرہ جمع کرنا شروع کردیا۔ بیٹ مین comic books چھ سال کی عمر میں میں نے میرے ذہن میں ایک تصور بویا، میرے سامنے ایک نمونہ رکھا کہ کس طرح دنیا

کا نظام چل رہا ہے، بعض ظالم ہوتے ہیں، بعض مظلوم ہوتے ہیں اور بعض وہ جو مظلومین کی حمایت کے لئے آگے آتے ہیں۔ یہ چیز میرے ذہن میں اس طرح پیوست رہی کہ اپنے بچپن کے پورے دور کے اندر میں ہر اس کتاب کی طرف کھنچا چلا جاتا جس میں یہ نمونہ پیش کیا جارہا ہو Uncle Tom's Cabin, TheAutobiography of Malcolm X اور مجھے تو The Catcher in the Rye میں بھی ایک اخلاقی پہلو نظر آتا تھا۔

پھر میں ہائی اسکول پہنچ گیا اور تاریخ کے اسباق پڑھے ،اور مجھ پر یہ واضح ترہوگیا کہ دنیا کا یہ اصول کتنا حقیقی ہے۔ میں نے امریکہ کے اصل باشندوں اور یورپی آبادکاروں کے ہاتھوں ان پر ہونے والے ظلم کے بارے میں پڑھا۔ میں نے پڑھا کہ پھر ان یورپی آبادکاروں کی نسلوں کو کس طرح کنگ جارج سوم کی جابرانہ حکومت کے دوران ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ میں نے پال ریور اور ٹام پین کے بارے میں پڑھا اور یہ کہ کس طرح امریکیوں نے برطانوی فوج کے خلاف مسلح بغاوت کی، وہ بغاوت جس کا اب ہم امریکہ کی انقلابی جنگ کی حیثیت سے جشن مناتے ہیں۔ آج جہاں ہم بیٹھے ہیں بچپن میں اس سے کچھ دور ہی اسکول کی فیلڈ ٹرپ پر جایا کرتے تھے۔ میں نے ہیریٹ ٹب مین، نیٹ ٹرنر، جان براؤن اور اس ملک میں غلامی کے خلاف جنگ کے بارے میں پڑھا۔ میں نے ایما گولڈ مین، یوجین ڈیبز، مزدوروں کی انجمنوں، ورکنگ کلاس اور غرباء کی جدوجہدوں کے بارے میں

پڑھا۔ میں نے این فرینک اور نازیوں کے بارے میں پڑھا کہ وہ کس طرح اقلیتوں کو اذیتیں دیتے تھے اور مخالفین کو قید کردیتے تھے۔ میں نے روزا پارکس، میلکم ایکس، مارٹن لیوتھر کنگ اور شہری حقوق کی جدوجہد کے بارے میں پڑھا۔ میں نے ہوچی منھ کے بارے میں پڑھا کہ کس طرح ویت نام کے باشندگان نے کئی دہائیاں یکے بعد دیگرے آنے والے غاصبین کے خلاف لڑنے میں گزاردیں۔ میں نے نیلسن منڈیلا اور جنوبی افریقہ میں نسلی عصبیت کے خلاف جنگ کے بارے میں پڑھا۔ میں نے ان سالوں میں جو کچھ پڑھا وہ چھ سال کی عمر میں سیکھی گئی بات کی مزید تصدیق کررہا تھا، کہ پوری تاریخ میں ظالم اور مظلوم کے درمیان ایک مستقل جنگ جاری رہی ہے۔ میں نے جس بھی جدوجہد کے بارے میں پڑھا، میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مظلوم کا طرفدار پایا، اور ان کی حمایت میں کھڑے ہونے والوں کو میں نے ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا، خواہ وہ کسی بھی ملک سے ہوں، کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ میں نے کبھی بھی اپنی کلاسوں کے نوٹس نہیں پھینکے۔ آج بھی جبکہ میں یہاں کھڑا ہوں وہ میرے کمرے کی الماری میں سلیقے سے رکھے ہیں۔

جتنی بھی تاریخی شخصیات کے بارے میں میں نے پڑھا ان میں سے ایک سب میں ممتاز تھی۔ میلکم ایکس کے بارے میں بہت سی چیزوں نے مجھے متاثر کیا لیکن جس چیز نے سب سے زیادہ دلچسپی بڑھائی وہ کایا پلٹ تھی، ان کی کایا پلٹ۔ مجھے

معلوم نہیں کہ آپ نے سپائک لی کی فلم 'X' دیکھی ہے یا نہیں، یہ تقریبا ساڑھے تین گھنٹے کی ہے، اور ابتدا میں نظر آنے والا میلکم آخر میں نظر آنے والے میلکم سے بہت مختلف ہے۔ وہ ایک ان پڑھ مجرم ہوتا ہے جو بعد ازاں ایک شوہر، ایک باپ، اپنے لوگوں کا محافظ اور فصیح البیاں لیڈر بن جاتا ہے، ایک اصولی مسلمان جو مکہ میں حج کا فریضہ ادا کرتا ہے اور بالآخر شہید ہو جاتا ہے۔ میلکم کی زندگی نے مجھے یہ سبق دیا کہ اسلام کوئی وراثتی دین نہیں ہے؛ یہ کسی نسل یا تہذیب کا نام نہیں ہے۔ یہ تو طریقہ زندگی ہے، ایک فکری حالت ہے جو کوئی بھی اپنا سکتا ہے چاہے وہ کہیں سے بھی تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی ماحول میں پلا بڑھا ہو۔ اس چیز نے مجھے اسلام کو بنظر غائر دیکھنے کی ترغیب دی اور بس پھر میں اس کا دلدادہ ہو گیا۔ میں تو صرف ایک نوجوان تھا اور اسلام اس سوال کا جواب پیش کرتا تھا جو بڑے بڑے سائنسی ذہن دینے سے قاصر ہیں۔ اور جس کا جواب نہ پا کر امراء اور مشہور و معروف لوگ ڈپریشن اور خودکشیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کائنات میں ہمارا وجود کیوں ہے؟ اسلام نے جواباً بتایا کہ کس طرح ہمیں زندگی گزارنی ہے۔ کیونکہ اسلام ہمیں کسی پیشوا یا راہب کا محتاج نہیں کرتا لہذا میں نے براہ راست قرآن اور سنت کی گہرائیوں میں جانا شروع کر دیا، تاکہ اس فہم کے سفر کا آغاز کر سکوں کہ اسلام کیا ہے، بحیثیت انسان اسلام میرے لئے کیا پیش کرتا ہے، ایک فرد کی حیثیت سے، میرے اردگرد کے لوگوں کے لئے، ساری دنیا کے لئے، اور جتنا جتنا

میں یکھتا گیا، مجھے اسلام کی قدر و قیمت کا اتنا ہی احساس ہونے لگا گویا وہ کوئی ہیرا ہے۔ یہ میرے عنوان شباب کی بات ہے، لیکن آج بھی پچھلے چند سالوں کے دباؤ کے باوجود، میں یہاں آپ کے اور اس کمرہ عدالت میں موجود تمام لوگوں کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے کھڑا ہوں، الحمدللہ۔

اس کے ساتھ ہی میری توجہ دنیا بھر میں مسلمانوں کے حالات کی طرف گئی۔ اور جدھر بھی میں نے نگاہ ڈالی میں نے دیکھا کہ نام نہاد طاقتیں میری محبوب شے کے درپے ہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ سویت نے افغانستان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ سربوں نے بوسنیا کے مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی۔ مجھے روسیوں کے ہاتھوں چیچن مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے متعلق پتہ چلا۔ مجھے پتہ چلا کہ اسرائیل نے لبنان میں کیا کیا تھا، اور اب امریکہ کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ فلسطین میں کیا کچھ کر رہا ہے۔ اور مجھے پتہ چلا کہ خود امریکہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ مجھے جنگ خلیج کے متعلق اور ان یورینیم بموں کے متعلق علم ہوا جن سے ہزاروں لوگ مر گئے اور عراق میں کینسر کی شرح آسمان کو پہنچ گئی۔ میں نے امریکہ کے صادر کردہ ان احکامات و قوانین کے بارے میں جانا جن کے باعث عراق میں کھانا، دوائیں اور طبّی سامان جانے سے روک دیا گیا اور کس طرح، اقوام متحدہ کے مطابق، نتیجتاً پانچ لاکھ سے زائد بچے ہلاک ہوئے۔ مجھے میڈیلائن ایلبرائٹ کے '۶۰ منٹ' کے انٹرویو کا ایک حصہ یاد ہے

جس میں اس نے اپنا یہ اظہار خیال کیا تھا کہ یہ بچے اسی قابل تھے۔ میں نے گیارہ ستمبر کو دیکھا کہ کس طرح کچھ افراد نے ان بچوں کی ہلاکتوں پر ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے اور انہیں عمارتوں میں اڑادینے کی صورت میں اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ امریکہ نے براہ راست عراق پر حملہ کردیا ہے۔ میں نے حملے کے پہلے روز آپریشن 'Shock and Awe' کے نتیجے میں ہونے والی تباہی دیکھی، ہسپتال کے وارڈوں میں وہ بچے تھے جن کے سروں میں امریکی میزائلوں کے ٹکڑے کھبے ہوئے تھے (ظاہر ہے یہ سب کچھ سی این این پر نہیں دکھایا گیا)۔ مجھے حدیثہ کے قصبے کے بارے میں علم ہوا جہاں چوبیس مسلمانوں کو جن میں ایک چھیتر سالہ ویل چیئر پر بیٹھا بوڑھا، عورتیں اور ننھے بچے شامل ہیں، ان کے بستروں میں ہی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ مجھے عبیر الجنبی کے بارے میں پتہ چلا، ایک چودہ سالہ عراقی بچی جسے پانچ امریکی فوجیوں نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا، جنہوں نے پھر اس کے اور اس کے گھر والوں کے سروں میں گولیاں ماریں اور ان کی لاشوں کو جلا دیا۔ میں بس اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، آپ دیکھتے ہی ہیں کہ مسلم خواتین نامحرم مردوں کو اپنے بال تک نہیں دکھاتیں۔ ذرا تصور کریں ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والی بچی کو بے لباس کیا جائے اور پھر ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں یکے بعد دیگرے پانچ فوجی اسے بے عزت کریں۔ آج بھی جبکہ میں اپنے سیل میں بیٹھا ہوتا ہوں، ان ڈرون حملوں کے بارے میں پڑھتا ہوں جو پاکستان، صومالیہ اور یمن جیسے

ممالک میں روزانہ مستقل بنیاد پر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ پچھلے ماہ ہی ان سترہ افغان مسلمانوں کے بارے میں سنا جن میں اکثریت ماؤں اور ان کے بچوں کی تھی، جو ایک امریکی فوجی کی گولیوں کا نشانہ بنے اور اس نے ان کی لاشوں کو بھی جلا دیا۔ یہ تو صرف چند کہانیاں ہیں جو شہ سرخیوں تک پہنچ پاتی ہیں، تاہم اسلام کے جو تصورات میں نے سب سے پہلے سیکھے ان میں بھائی چارہ اور وفاداری بھی شامل ہے، کہ ہر مسلمان خاتون میری بہن ہے اور ہر مرد میرا بھائی اور مل جل کر ہم سب ایک جسم کی مانند ہے اور ہمیں ایک دوسرے کی حفاظت کرنی ہے۔ بالفاظ دیگر، میں یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میرے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہے، امریکہ بھی ظالموں میں شامل ہو اور میں غیر جانبدار رہوں۔ مظلوموں کے لئے میری حمایت جاری رہی تاہم اس بار اس میں اپنائیت بھی تھی، اور یہی احساسات ان لوگوں کے لئے بھی تھے جو ان مظلومین کے دفاع میں اٹھے۔

میں نے پال ریور کا تذکرہ کیا تھا، وہ آدھی رات کو لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے نکلا کہ برطانوی سام ایڈمز اور جان ہینکاک کو گرفتار کرنے کے لئے لیگزنگٹن کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں اور اس کے بعد کانکورڈ جائیں گے تاکہ وہاں آزادی کے لئے لڑنے والی ملیشیا کے ذخیرہ کردہ اسلحہ کو ضبط کریں۔ جس وقت تک برطانوی کانکورڈ پہنچے آزادی کے لئے لڑنے والے لوگ اپنے ہاتھوں میں

اسلحہ لئے ان کے سامنے مقابلے کے لئے کھڑے تھے۔انہوں نے برطانویوں پر گولیاں چلائیں، ان سے لڑائی کی اور انہیں ہرا دیا۔ اسی جنگ سے امریکی انقلاب کا آغاز ہوا۔ جو کام ان لوگوں نے کیا اس کے لئے ایک عربی لفظ ہے ،اور وہ لفظ ’جہاد ‘ ہے، اور میرا مقدمہ بھی اسی سے متعلق تھا۔ وہ ساری ویڈیوز اور تراجم اور بچکانہ بحثیں کہ ’ اوہ ! اس نے اس جملے کا ترجمہ کیا تھا ‘اور ’اوہ ! اس نے اس جملے پر نظر ثانی کی تھی ! ‘،اور وہ تمام پیش کردہ باتیں ایک ہی معاملے کے گرد گھومتی تھیں : وہ مسلمان جو امریکہ کے خلاف اپنا دفاع کر رہے تھے جو ان کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو برطانیہ نے امریکہ کے ساتھ کیا تھا۔پیشیوں کے اندر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ میں کبھی بھی بازاروں میں امریکیوں کے قتل‘ کے کسی منصوبے میں شامل نہیں رہا، یا جو بھی کہانی بنائی گئی تھی ‘ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔حکومتی گواہوں نے خود بھی اس دعوے کا رد کیا، اور ایک کے بعد دوسرا ماہر اس جگہ آ کر کھڑا ہوتا رہا، جنہوں نے میرے تحریر کردہ ہر ہر لفظ کے حصے بخرے کرنے میں کئی گھنٹے گزارے کہ میرے عقائد کو بیان کر سکیں۔ اس کے بعد جب میں آزاد ہوا تو حکومت نے اپنا ایک خفیہ ایجنٹ بھیجا کہ وہ مجھے اپنے کسی چھوٹے سے ’دہشتگردانہ منصوبے‘ میں ملوث ہونے کی ترغیب دے سکے، لیکن میں نے شمولیت سے انکار کر دیا۔ تاہم حیرت کی بات ہے کہ جیوری کو اس بارے میں کوئی خبر نہیں۔

لہٰذا، میرا یہ مقدمہ امریکی شہریوں کے قتل پر میرے موقف کے لحاظ سے نہیں تھا، بلکہ یہ امریکیوں کے ہاتھوں مسلمان شہریوں کے قتل کے لحاظ سے میرے موقف پر تھا، اور وہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اراضی پر غاصب قوتوں کے خلاف دفاع کرنا چاہئے چاہے وہ امریکی ہوں، روسی ہوں یا مریخی ہوں۔ میں اسی بات پر یقین رکھتا ہوں، ہمیشہ سے میرا یہی یقین رہا ہے اور ہمیشہ یہی یقین رہے گا۔ یہ نہ دہشت گردی ہے، نہ انتہا پسندی ہے۔ یہ تو بس دفاع نفس کی سادہ سی منطق ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی نمائندگی آپ کے اوپر موجود علامت کے تیر کر رہے ہیں، وطن کا دفاع۔ چنانچہ میں اپنے وکلاء کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ آپ کو میرے عقائد ماننے کی ضرورت

نہیں۔ نہیں، بلکہ جس کے اندر بھی تھوڑی سی عقل اور انسانیت ہوگی لا محالہ اسے یہ بات ماننی ہی پڑے گی۔ اگر کوئی آپ کے گھر میں گھس کر چوری کرنا چاہے اور آپ کے اہل و عیال کو نقصان پہنچانا چاہے تو عقل یہی کہے گی کہ اس جارح کو باہر نکالنے کے لئے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کیا جائے۔ لیکن جب وہ گھر کوئی مسلم سرزمین ہو، اور وہ جارح امریکی فوج ہو، تو کسی وجہ سے یہ اصول بدل جاتے ہیں۔ عقل کا نام 'دہشت گردی' رکھ دیا جاتا ہے، اور جو لوگ سمندر پار سے آئے قاتلوں کے خلاف اپنا دفاع کرتے ہیں وہ 'دہشت گرد' بن جاتے ہیں جو 'امریکیوں کو قتل' کر رہے ہیں۔ ڈھائی صدی پہلے امریکہ جس ذہنیت کا شکار تھا جب برطانوی ان سڑکوں پر چل رہے تھے وہی ہے جس کا شکار آج مسلمان ہیں جن کی سڑکوں پر امریکی فوجی مٹر گشت کر رہے ہیں۔ یہ

استعماریت کی ذہنیت ہے۔جب سرجنٹ بیلز نے پچھلے مہینے ان افغانوں کو قتل کیا تو ذرائع ابلاغ کا سارا زور اس کی ذات پر تھا، اس کی زندگی، اس کی پریشانی، اس کے گھر کا گروی ہونا، گویا وہی ظلم کا نشانہ بنا ہے۔اور جن لوگوں کو اس نے مارا تھا ان کے لئے کم ہی ہمدردی دکھائی گئی، گویا وہ حقیقی لوگ نہیں تھے، انسان نہیں تھے۔بدقسمتی سے یہی ذہنیت معاشرے کے ہر فرد میں راسخ ہو چکی ہے، چاہے اسے اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔حتی کہ میرے وکلاء بھی، دو سال گفتگو کرنے، سمجھانے اور وضاحتیں پیش کرنے میں لگے اور پھر کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے خول سے باہر جھانک سکیں اور کم از کم میری بات میں موجود منطق و عقل کو بناوٹی طور پر ہی قبول کر سکیں۔دو سال! اگر اتنے ذہین لوگوں کو اتنا وقت لگا، جن کا کام میرا دفاع کرنا تھا، اپنی ذہنیت تبدیل کرنا تھا اور پھر مجھے یونہی کسی جیوری کے سامنے پیش کر دیا گیا اس بات کے تحت کہ وہ ، میرے 'غیر جانبدار موکل' ہیں ، مطلب یہ کہ مجھے اپنے ساتھیوں کی جیوری کے سامنے نہیں پیش کیا گیا کیونکہ جو ذہنیت امریکہ پر چھائی ہوئی ہے اس کی وجہ سے میرے کوئی ساتھی ہی نہیں۔اسی حقیقت کو بنیاد بناتے ہوئے حکومت نے مجھ پر مقدمہ چلایا، اس لئے نہیں کہ انہیں کوئی حاجت تھی، بس صرف اس لئے کیونکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔

میں نے تاریخ کی کلاسوں میں ایک اور بات بھی سیکھی تھی۔امریکہ نے تاریخ

میں ہمیشہ اپنی اقلیتوں کے خلاف غیر منصفانہ ترین حکمت عملیاں اپنائی ہیں، ایسے افعال جنہیں قانون کا تحفظ بھی حاصل تھا، اور پھر بعد میں پیچھے دیکھ کر یہی کہا گیا'آخر ہم کیا سوچ رہے تھے ؟'غلامی، جم کرو، جنگ عظیم دوئم میں جاپانیوں کی نظر بندی، یہ سب امریکی معاشرے میں بالکل قابل قبول تھا، اور سپریم کورٹ کی پشت پناہی کے ساتھ تھا۔لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور امریکہ بدل گیا، عوام اور عدلیہ دونوں نے پیچھے دیکھ کر یہی کہا کہ 'آخر ہم کیا سوچ رہے تھے ؟' جنوبی افریقہ کی حکومت نیلسن منڈیلا کو دہشت گرد سمجھتی تھی، اور اسے قید حیات کی سزا سنائی گئی تھی۔لیکن وقت گزر گیا اور دنیا بدل گئی،انہیں احساس ہوا کہ ان کی پالیسی کتنی ظالمانہ تھی، کہ دراصل وہ دہشت گرد نہیں تھا، اور اسے قید سے آزاد کر دیا گیا۔ وہ صدر بھی بن گیا۔ لہٰذا ہر چیز ذہنیت سے تعلق رکھتی ہے، یہ 'دہشت گردی' کا سارا معاملہ بھی اور یہ کہ کون دہشت گرد' ہے۔یہ سب تو وقت اور مقام پر منحصر ہے اور یہ کہ کون اس وقت 'عالمی قوت' ہے۔

آپ کی نظروں میں میں دہشت گرد ہوں، صرف ایک میں ہی یہاں پر ایک زرد لباس میں کھڑا ہوں اور میرا یہاں زرد لباس میں کھڑا ہونا بالکل معقول ہے۔ لیکن ایک دن امریکہ بدل جائے گا اور لوگوں کو اس دن کی حقیقت کا احساس ہوگا۔وہ دیکھیں گے کہ کس طرح ہزاروں لاکھوں مسلمان غیر ممالک میں امریکی فوج کے

ہاتھوں قتل ہوئے اور اپاہج ہوئے۔ تاہم کسی طریقے سے آج میں ہوں جسے ان ممالک میں 'قتل اور اپاہج کرنے کی سازش' کی وجہ سے قید میں بھیجا جا رہا ہے، کیونکہ میں ان لوگوں کا دفاع کرنے والے مجاہدین کی حمایت کرتا ہوں۔ لوگ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے کہ کس طرح حکومت نے مجھے 'دہشتگرد' کی حیثیت سے قید کرنے کے لئے لاکھوں ڈالر خرچ کیے، لیکن اگر ہم کسی طرح امیر الجنبی کو اس موقع پر زندہ کرکے لا کھڑا کریں جب وہ آپ کے فوجیوں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی تھی، اسے اس گواہی کے کٹھہرے میں کھڑا کریں اور اس سے پوچھیں کہ دہشت گرد کون ہیں، تو یقیناً اس کا اشارہ میری طرف نہیں ہوگا۔

حکومت کا کہنا ہے کہ مجھ پر شدت کا بھوت سوار ہے، 'امریکیوں کے قتل' کا بھوت سوار ہے۔ لیکن اس دور میں رہنے والے مسلمان کی حیثیت سے، میں اس سے زیادہ طعن آمیز جھوٹ سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔

نوٹ یہ کالم فیس بک سے لیا گیا ہے اور اسے پوسٹ کرنے والے محمد صالح میر جت صاحب ھے لہٰذا شکریئے کے ساتھ یہ کالم ہماری ویب کے قارئین کے لیئے پیش خدمت ھیں۔

مکہ اور مدینے پر ایٹمی حملے کا امریکی منصوبہ اور مسلمان حکمران

جس دن میں نے یہ خبر پڑھی کہ " دنیا کا بدمعاش اول یعنی امریکہ عالم اسلام کے مقدس ترین مقامات یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر ایٹمی حملے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اور اپنی فوجی اکیڈمیز میں مستقبل کے امریکی فوجی افسران اور دیگر اہلکاروں کو عالم اسلام کے خلاف مکمل جنگ کی تعلیم دی جارہی ہے اور انہیں یہ باور کرایا جارہا ہے کہ اگر اس دنیا میں رہنا ہے تو اس کے لیئے لازم ہے کہ پہلے مسلمانوں کا جڑ سے خاتمہ کیا جائے اور اپنی ذہنوں سے اچھے اور برے مسلمان کے فرق کو نکال دے کیونکہ مسلمان سب کے سب برے اور ھمارے دشمن ہیں اسلیئے یہ بات ضروری ہے کہ ہم سب (یعنی امریکی) خود کو مسلمانوں کے خلاف ایک مزاحمتی تحریک کا حصہ سمجھے اور انکی خاتمے کو یقینی بنائے چاہے اس کے لیئے ہمیں یعنی امریکی افواج کو ایٹم بم کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے " تو مجھے نا تو کوئی تعجب ہوا اور نا ھی کسی دکھ اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور یہ اسلیئے نہیں کہ میں کہیں خدانخواستہ انکا "اتحادی" ہوں بلکہ مجھے تعجب اس لیئے نہیں ہوا کہ جو سازشیں امریکہ اور دیگر کفار مسلمانوں کے خلاف کر رہے ہیں انکے متعلق تو ہمیں صدیوں پہلے قرآن مجید نے خبردار کیا ھے کہ یہ لوگ یعنی یہود و نصاریٰ تمہارے یعنی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے ۔ لیکن

آفسوس اور صد آفسوس کہ قرآن کریم کی اتنی واضح ہدایت کے باوجود مسلم حکمران ٹس سے مس نہیں ہورہے بلکہ انہوں نے اپنی پوری توانائیاں مذمتی بیانات پر لگائی ہوئی ہیں مثلا: اہل کفر نے جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے چاہے وہ محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکے بنانے کی شکل میں ہو' چاہے قرآن حکیم کی شہادت کی شکل میں ہو' چاہے دنیا بھر سے مسلمان مرد وزن کے غیر قانونی طریقوں سے غائب کرانے یعنی اغوا کے معاملات ہو یا چاہے دنیا بھر میں مثلا: عراق، افغانستان ، پاکستان، کشمیر، چیچنیا، سوڈان ،اور صومالیہ میں مسلمانوں پر مسلط کی گئ امریکی اور اسکے حواریوں کی دہشت گردی ہو مسلم حکمرانوں نے صرف مذمتی بیانات پر اکتفا کیا ہوا ہیں بلکہ کئی کو تو اسکی بھی توفیق نہیں ہوئی اور الٹا امریکہ کا ساتھ دیکر اپنے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین کردئیں حالانکہ وقت کا تقاضہ تو کل بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے کہ مسلمان حکمران مذمتی بیانات کو چھوڑ کر اقدامات کے طرف آئے تاکہ ایک طرف امریکی ااور دیگر اہل کفر کو یہ پیغام دیا جاسکے ۔ کہ ابھی ہمارے (مسلم حکمرانوں) کے دل میں ایمان کی حرارت موجود ہے

آخر میں صرف اتنا کہ اگر مسلمان حکمرانوں نے اپنے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے اہل کفر کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تو انشاء اللہ نہ صرف اس دنیا میں

انکی عزت و وقار میں اضافہ ہوگا بلکہ بعد از موت زندگی میں بھی کامیاب و کامران رہینگے۔ لیکن اگر مسلم حکمرانوں نے امریکہ سے ڈر اور خوف کی موجودہ پالیسی کو جاری رکھا تو پھر انکو یاد رکھنا چاہیئے کہ فتح تو انشاءاللہ اسلام اور مسلمانوں کی ہوگی کیونکہ اسلام نے تو غالب ہونا ہے نا کہ مغلوب، البتہ وہ روز محشر اللہ پاک کو کیا جواب دینگے اس بارے وہ سوچ ضرور۔

صدر زرداری کا خطاب اور مصری ماڈل

گزشتہ دنوں لاڑکانہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی مقتول چیرپرسن بینظیر بھٹو کی برسی کے موقع پر منعقدہ جلسے میں جیالوں کا جوش و خروش کیسا تھا یا جلسے میں عوام کی تعداد کیا رہی یہ ہمارے آج کے کالم کا موضوع نہیں بلکہ ہمارے آج کے کالم کا موضوع صدر مملکت کا وہ بیان ہے جس میں صدر نے کہا تھا کہ ہمیں مصری ماڈل قبول نہیں؛سوال یہ ہے کہ جناب صدر کو یہ بیان دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور کیا جناب صدر کے اس بیان کے پیچھے کہیں کوئی نادیدہ قوت تو کارفرما نہیں ان سوالوں کے جواب جاننے سے پہلے لازم ہے کہ تھوڑی سی روشنی مصری صورتحال پر ڈالی جاتے تا کہ یہ پتہ چلے کہ آخر مصری ماڈل میں ایسی کیا.برائی ہے کہ جس سے ہمارے صدر صاحب کو اتنی الرجی ہے۔

اگر آج سے تھوڑا عرصہ پیچھے جا کہ ہم مصر کی صورتحال کا جائزہ لے تو حیرت انگیز طور پر اس وقت کی مصری صورتحال پاکستان کی موجودہ صورتحال سے بہت مماثلت رکھتے تھے یعنی جو کام آج پاکستان میں ہو رہا ہے کل یہی کچھ مصر میں ہو رہا تھا مثال کی طور پر آج پاکستان میں اقربا پروری کا دور دورا ہے کل یہی کچھ مصر میں ہو رہا تھا,آج پاکستان میں ہر طرف لوٹ مار ہو رہا ہے جس کے نتیجے

میں غربت روز بروز بڑھ رہی ہے، کل یہی کچھ مصر میں ہو رہا تھا آج اگر ہماری خارجہ پالیسی غیروں کی تابع بنی ہوئی ہے تو کل یہی کچہ مصر میں ہو رہا تھا آج جو پاکستان میں روشن خیالی کی نام پر دینی شعائر کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو کل یہی کچھ مصر میں ہو رہا تھا آج پاکستان میں اسلام پسندوں کا گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے تو کل یہی کچھ مصر میں ہو را، ہو رہا تھا. مصری عوام اس صورتحال کو تبدیل کرنے کے لیے عرصہ دراز سے کوشش کر رہے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں -

مصری عوام کو اس وقت زبردست امید پیدا ہوئی جب تیونس کے عوامی انقلاب کے آگے وہاں کے حکمران زین العابدین نے ہتھیار ڈال کر ملک سے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت جانی، تیونسی عوام کے کامیاب کوششوں نے مصری عوام کو ایک نئی جلا بخشی اور انہوں نے مصری صدر حسن مبارک کے خلاف اپنی جدوجہد تیز کر دی اور بے پناہ قربانیوں کے بعد بالاخرانہوں نے حسن مبارک سے چھٹکارا حاصل کر لیا، حسن مبارک کی جانے بعد گو کہ انکے وفاداروں نے گڑبڑ کرنے کی بہت کوشش کی کہ ملک میں کوئی اسلام پسند قیادت سامنے نہ آجاتے لیکن انکی یہ کوشش اس وقت بری طریقے سے ناکام ہوئی جب انتخابات میں مصر کی اسلام پسند جماعت اخوان المسلمون نے بھرپور کامیابی حاصل کی ،اخوان کی کامیابی کے بعد عام خیال یہ کیا جارہا تھا کہ وہ حکومت کی تمام کلیدی عہدے اپنے پاس رکھیں

گے لیکن اخوان المسلمین نے اس وقت دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا جب انہوں نے کئی اہم اور کلیدی عہدے اپنے نظریاتی مخالفین کو دے دیے ،اسکے علاوہ اخوانی صدر جناب محمد مرسی کے بارے میں یہ اطلاعات وقتا فوقتا اتی رہتی ہے کے وہ انتہائی شریف النفس اور مزاجا سادہ طبیعت کے مالک ہے اسکے علاوہ محمد مرسی کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حالیہ فلسطین اسرائیل جنگ میں مسلمانوں کے ازلی دشمن اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا ۔

مندرجہ بالا تمام وجوہات کے بنیاد پر آج نہ صرف مصری عوام بلکہ دنیا بھر کے مسلمان مصری صدر کو اپنا روحانی سربراہ اور مصری حکومت کو اپنے لیے ایک ماڈل کے طور پر دیکھتے ہیں ،دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرح پاکستانی مسلمان بھی صدر مرسی کو اپنا ہیرو تصور کرتی ہیں اور انکی یہ دلی خواہش بھی ہے کی انکے اوپر بھی مرسی جیسا خداترس اور عوام دوست سربراہ ہونا چاہیے ۔

لیکن سوال پھر وہی سامنے آرہا ہے کہ آخر صدر زرداری کے بیان کو کس پیرائے میں لیا جاتے ؟تو میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان میں ہمارے صدر محترم کی زبان اگرچہ استعمال ہوئی ہے لیکن اس بیان کی پیچھے وہی قوتیں کارفرما ہیں جو عراق اور افغانستان میں بری طرح ناکام ہونے کے بعد تیونس اور مصر میں بھی ناکام ہوچکی ہیں اور اب پاکستان میں خود کو بچانے کی تگ و دو کر رہے ہیں

اسکے علاوہ اس بیان کے پیچھے ہمارے کچھ دوست ممالک کی سوچ بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ مندرجہ بالا تمام قوتیں یہ سمجھتے ہیں کے اگر پاکستان میں مصری طرز حکومت قائم ہوئی تو انکے مداخلت کی تمام راستے مسدود ہو جائینگے۔

مندرجہ تمام تر حقائق کو سامنے رکھتے ہوے میں اس کالم کی توسط سے جناب صدر کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کے دنیا کی بدلتے ہوتے حالات کی پیش نظر ایسے بیانات سے گریز کرنا چاہیے کہ جس سے ایک طرف تو عرب ممالک "جو کہ ہمارے بہترین دوست ہیں،، کے ناراضگی کا خطرہ تو دوسری طرف عوامی غیض و غضب کا۔

طالبان سے مذاکرات وقت کی اہم ضرورت

تحریک طالبان پاکستان کی جناب سے حکومت کو مذاکرات کی پیش کش کرنے کے بعد وہ تمام دانشور اور تجزیہ نگار کہ جنکو تحریک پاکستان ، قبائل کی تاریخ ،اور دیشت گردی کی خلاف نام نہاد امریکی جنگ " دار اصل اسلام کے خلاف امریکی جنگ ؛؛کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہے اس بات پر متفق ہے کے ایک ایسے وقت میں جبکہ تحریک طالبان پاکستان کو بشیر بلور کے قتل کے بعد ایک نفسیاتی برتری حاصل ہے ان کی طرف سے مذاکرات کی پیشکش نہ صرف مخلصانہ پیشکش ہے بلکہ انکی یہ خواہش بھی ہے کہ معاملات باہم افہام و تفہیم کے ساتھ حل ہو کیونکہ مندرجہ بالا لوگوں کا یہ خیال ہے جو کہ میری نظر میں درست خیال ہے کہ اگر حکومت اور ٹی .ٹی پی کے مابین کامیاب اور دیرپا مذاکرات ہوجاتے ہیں تو اسکے اس ارض وطن اور اہل وطن کو بہت فائدے ہو سکتے ہیں مثلا (۱)حکومت اور ٹی ٹی پی کے مابین مفاہمت ہوجانے کے بعد ہمارے ملک میں موجود دوسرے دشمن ممالک کے ایجنٹوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے میں مدد ملے گی جس سے یقینا ملک میں آمن وامان پیدا ہوگی (۲)اس سے طالبان اور فوج کے درمیان موجود دشمنی اور عدم اعتماد کا رشتہ اعتماد اور محبت کے رشتے میں بدل سکتا ہے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوتے دونوں فریق دشمنان اسلام کے خلافخود کو مضبوط کر سکتے ہے (۳) اس اقدام سے نہ صرف

افغانستان میں موجود امریکیوں کے قدم جلدی اکھڑ سکتے ہے بلکہ مقبوضہ کشمیر کا محاذ ایک بار پھر گرم ہو سکتا ہے .اس لے تمام محب وطن دانشور اور تجزیہ نگار یہ چاہتے ہے کہ جتنا جلدی ممکن ہو ٹی پی اور حکومت میں مذاکرات ہونے چاہیے۔ لیکن بد قسمتی سے کچھ تجزیہ کار اس ملک میں ایسے بھی موجود ہے جو نہ تو قبائل اور دیگر پختونوں کی روایت سے واقف ہے نہ ہی وہ اس وقت کے قومی اور بین الاقوامی صورتحال سے اس لیے وہ چاہتے ہے کے افواج پاکستان یونہی مزاحمت کاروں سے گتھم گتھا رہے اور اسی وجہ سے انھوں نے طالبان کی حالیہ پیشکش اپر سخت تنقید کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ حکومت وقت اور عسکریت پسندوں کے مابین مفاہمت کی جتنی ضرورت آج ہے اس سے پہلے کبھی نہیں رہی کیونکہ آج حکومتی زعما اور ملکی سلامتی کے ذمہ دار لوگ یہ بات خود تسلیم کر رہے ہے کہ کفریہ طاقتیں پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہیں .اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حکومت ہو یا کل کو آنے والی نئی حکومت اگر وہ چاہتی ہے کہ پاکستان میں آمن و امان ہو تو انکو صدق دل سے طالبان سے مذاکرات کرنے ہونگے کیونکہ یہ بات اٹل ہے کہ یہ لوگ محب وطن اور محب اسلام ہے نہ کہ وطن دشمن ، اس لیے مقتدر قوتوں کو چاهیئے کہ وہ آپنے ذاتی مقاصد یا امریکی ایجنڈے کی خاطر فوج کو ان لوگوں سے لڑا کر مزید کمزور کرنے کی بجائے ان لوگوں کو گلے لگا کر فوج کی طاقت میں اضافہ کیجئے تاکہ پاکستان سمیت دنیا بھر میں اسلام کے جھنڈے گاڑے جاسکے۔

پولیو ورکرز پر حملے اور پس پردہ حقائق

عالمی طاقتیں جب بھی اپنے مخصوص ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ اس کے لئے سب سے پہلے خود یا اپنے کارندوں سے مخصوص حالات پیدا کردیتے ہیں۔ اس بات کو باآسانی سمجھنے کے ایک دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

افغانستان میں طالبان کے دور میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد جن عوام الناس کو اسلامی نظام کے ثمرات ملنا شروع ہوگئے تو امریکہ نے اس نظام کو تلپٹ کرنے کے لئے اپنے ہی ملک میں 11/9 کا ڈرامہ رچا کر الزام اسامہ بن لادم پر لگایا لیکن جب اسامہ بن لادن کے میزبان طالبان حکومت نے ثبوت مانگے تو امریکہ نے ثبوت دینے کے بجائے افغانستان پر ساڑھے تین درجن اعلانیہ اور غیر اعلانیہ دوستوں کو ملا کر یلغار کردی۔ اور یوں ایک بڑے ڈرامے کی آڑ لے کر طالبان حکومت کو ختم کردیا۔

خیبر پختون خواہ کے شہر سوات میں 2008ء میں افواج پاکستان اور تحریک طالبان سوات کے مابین کئی ماہ لڑائی لڑنے کے بعد جب اس وقت کے صوبے سرحد حکومت موجودہ (K.P.K) نے نظامِ شریعت محمدی کے امیر مولانا صوفی محمد کے ذریعے طالبان سے کامیاب مذاکرات کرنے کے بعد نظامِ عدل نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ ابھی اس پر پورری طرح سے عمل درآمد بھی نہیں ہوا

تھا کہ سازشی اذہان نے بھانپ لیا کہ اگر یہ نظام ایک بار چل گیا تو پھر تو پورے ملک سے اس نظام کو لاگو کرنے کے لئے آوازیں اٹھنی شروع ہو جائیں گی۔ اسی وجہ سے سیکولر اذہان رکھنے والے لوگوں کے ذریعے وہاں پر ایک لڑکی کو کوڑے مارنے کی جعلی ویڈیو کو منظرِ عام پر لایا گیا۔ اس ویڈیو کے بھرپور طریقے سے مشتہر ہونے کے بعد حکومت نے طالبان کے خلاف ایک بہت بڑا آپریشن لانچ کیا اور یوں اس مخصوص طبقے کا مقصد پورا ہوگیا۔

مذکورہ بالا دونوں واقعات بتانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ پچھلے دنوں کراچی میں پولیو ورکرز پر حملوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس واقعے کی آڑ لے کر وہ مخصوص سوچ اب کراچی میں شب خون مارنے کی تیاری کر رہی ہے۔ کیونکہ کراچی میں پولیو ورکرز پر حملے ایک ایسے وقت میں ہوئے ہیں جب ہم مسلسل حکومتی کارندوں اور ان کے اتحادیوں سے کراچی میں طالبانائزیشن کے حوالے سے بیانات سن اور پڑھ رہے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ کاروائی کے پیچھے طالبان یا کسی اور مذہبی گروپ کا ہاتھ ہے تو فی الحال اس واقعے کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن حقائق یہ بتاتے ہیں کہ مذکورہ کاروائی کے پیچھے طالبان یا کسی دوسرے اسلامی گروپ کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ

2000ء سے لے کر 2012ء کے آخر تک پورے پاکستان میں نہ تو پولیو کے قطرے پلانے والوں پر کسی نے حملہ کیا ہے اور نہ ہی کوئی دھمکی دی ہے۔ سوائے حالیہ واقعات کے خود تحریک طالبان پاکستان کے زیر اثر قبائلی علاقوں کا ہم اگر جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ طالبان اس مہم کے خلاف نہیں بلکہ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر اقوام متحدہ کو ہمارے بچوں کی اتنی ہی فکر ہے تو پہلے ڈرون حملے بند کرا کے بعد میں قطرے پلائے جائیں تو پھر یہ آخر حملے کس نے کیے؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے ایک مخصوص لابی ہے جو اپنے مخصوص مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں مثلاً ایک مقصد کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اس مخصوص واقعے کو آڑ بنا کر کراچی میں طالبان آئزیشن کی افوا پھیلا کر حالات خراب کیے جائیں۔ دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی نے پولیو ویکسینیشن کی آڑ لے کر امریکہ کے لئے اسامہ بن لادن کی جو جاسوسی کی اس کے بعد عوام الناس میں اس مہم نے مذید شکوک و شبہات پیدا کر دئے ہیں لہذا اس حملے کے ذریعے سے لوگوں کے ذہنوں سے اس واقعے کی یادیں محو کر کے اس کی جگہ لوگوں کے دلوں میں اس مہم کے لئے ہمدردی پیدا کرنا بھی ہو سکتا ہے۔

تیسری وجہ جو کہ اہم وجہ ہے اور وہ یہ کہ پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں یہ ویکسینیشن فائدے کے بجائے نقصان کا باعث بن رہی ہے۔ مثال کے طور پر

بدین کے علاقے باغ محلہ کے رہائشی اختر چانڈیو کے شیر خوار بچے علی رضا کو 16 اکتوبر 2012ء کو پولیو قطرے پلائے گئے۔ جس کے نتیجے میں بچے کو انفیکشن ہوگیا اور اس کے جسم کی کھال اترنے لگی۔ بچے کو فوری طور پر ایک نجی اسپتال لے جایا گیا۔ تاہم کافی دیر تک اس کی حالت سنبھل نہ سکی۔ پاکستان میں یہ کوئی واحد کیس نہیں ہے بلکہ ایسے کیسز درجنوں کے حساب سے ہونگے۔ چونکہ پاکستان میں اس حوالے سے کوئی تحقیق نہیں ہو رہی اس لئے ایسے کیسز کا درست اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن جن ممالک میں اس حوالے سے تحقیق ہو رہی ہے وہاں پولیو ویکسینیشن کے نقصانات بڑے پیمانے پر سامنے آرہے ہیں مثال کے طور پر نیویارک ٹائمز نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ انڈیا میں ہر سال 150 سے 200 بچے پولیو کے قطرے پینے کے بعد انفیکشن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایک معروف بین الاقوامی جریدے جرنل آف ہیومینٹیرین گروپ کا اپنی ایک رپورٹ میں کہنا ہے کہ اس حوالے سے نائجریا میں صورتحال انتہائی تشویش ناک ہے جہاں 2007ء میں 1300 کیسز سامنے آئے ہیں اس کے علاوہ ہیٹی میں 2001ء میں 22 بچے پولیو ویکسینیشن پینے کے باوجود پولیو کا شکار ہوگئے۔ عالمی ادارہ صحت (W.H.O) جو کہ پولیو کے کیسز پر نظر رکھنے والے ادارے پولیو گلوبل ایریڈکشن انسٹیٹیوٹ کا ماننا ہے کہ پولیو ویکسینیشن پینے کے بعد انڈیا میں کئی بچوں پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ میڈیا ذرائع کے مطابق امریکہ اور برطانیہ میں منہ کے ذریعے قطرے پلانے پر پابندی ہے۔ پاکستان میں اس حوالے

سے کام کرنے والی تنظیم "پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لیجلیسٹیو ڈیپارٹمنٹ اینڈ ٹرانسپرنسی" کا ماننا ہے کہ پولیو کے خلاف 16 سالہ مہم چلانے کے بعد صورتحال یہ ہے جس وقت 16 سال پہلے کام شروع کیا تھا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی وہیں کھڑے ہیں یعنی سال 2000ء میں سالانہ کیسز 199 تھے۔ 2011ء میں 198 کیسز سامنے آئے ہیں اور اگر 2012ء کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان کے صرف 7 اضلاع اور قبائلی علاقہ جات میں ستمبر تک 56 کیسز ریکارڈ کیے جاچکے ہیں۔ مذکورہ واقعات سامنے آجانے کے بعد چونکہ پاکستان میں اس مہم پر اعتبار کرنے کو کوئی تیار نہیں اور اس پوری مہم پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے لہٰذا اس حملے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے سے پولیو مہم اپنا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کرسکے۔ اس کے علاوہ ایک اور خاص وجہ جس نے عوام کو کشمش میں ڈال دیا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں پولیو سے سالانہ ایک درجن بچے بھی جاں بحق یا معذور نہیں ہوتے جبکہ اس کے مقابلے میں صرف نمونیہ سے پاکستان میں سالانہ 30,000 افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں اور ہر ایک 1000 میں سے 75 وہ ہوتے ہیں جن کی عمریں 5 سال سے کم ہوتی ہیں۔ نمونیہ کے علاوہ ہیپاٹائٹس اور دیگر کئی مہلک بیماریوں سے ہزاروں پاکستانی موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ پاکستانی گورنمنٹ اقوام متحدہ اور W.H.O اپنا سارا زور پولیو مہم پر صرف کر رہے ہیں لیکن ان تمام تر ان کے ادارے نقصانات، شکوک و شبہات کے باوجود پاکستان کے کسی عالم، مفتی کسی

دینی ادارے یا تنظیم نے پولیو مہم کی مخالفت میں آواز نہیں اٹھائی اس لئے میں اس کالم کے توسط سے حکومتِ وقت اور متعلقہ اداروں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کرواکے اس واقعے کے ذمہ داران کو سامنے لائیں، تاکہ وہ بے نقاب ہوں اور ان کا ٹرائل ہو اور وطن عزیز کو مذید افراتفری سے بچایا جاسکے۔

عالم اسلام ایک عظیم قائد سے محروم ہو گئیں

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہم میں سے ہر ایک نے ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہے لیکن ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی کہ انکے وفات سے معاشرے میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ اسکی کمی کو تا دیر محسوس کرتے ہیں ،ایک ایسی شخصیت معروف مذہبی اسکالر ،جماعت اسلامی کے سابق امیر یکجہتی کونسل کے موجودہ صدر قاضی حسین کا بھی تھا جو ہفتے اور اتوار کے درمیانی شب اسلام آباد میں دل کا دورہ پڑنے جانبر نہ ہو سکے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

قاضی صاحب 1938ء میں ضلع نوشہرہ (خیبر پختونخوا) کے گاؤں زیارت کاکا صاحب میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد مولانا قاضی محمد عبدالرب صاحب ایک ممتاز عالم دین تھے اور اپنے علمی رسوخ اور سیاسی بصیرت کے باعث جمعیت علمائے ہند صوبہ سرحد کے صدر چنے گئے تھے۔ قاضی صاحب اپنے 10 بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عتیق الرحمٰن اور مرحوم قاضی عطاالرحمٰن اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل تھے۔ قاضی حسین احمد بھی ان کے ہمراہ جمعیت کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگے۔ لٹریچر کا مطالعہ کیا اور پھر اپنا سب کچھ اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے وقف کر دیا۔ قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والدِ محترم سے

حاصل کی۔ پھر اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کے بعد پشاور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم ایس سی کی۔ بعد ازاں جہانزیب کالج سیدو شریف سوات میں بحیثیت لیکچرار تعیناتی ہوئی اور وہاں 3برس تک پڑھاتے رہے۔ جماعتی سرگرمیوں اور اپنے فطری رجحان کے باعث ملازمت جاری نہ رکھ سکے اور پشاور میں اپنا کاروبار شروع کردیا۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی موجودگی کے نقوش ثبت کیے اور سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ دورانِ تعلیم اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان میں شامل رہنے کے بعد آپ 1970 ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے، پھر جماعت اسلامی پشاور شہر اور ضلع پشاور کے علاوہ صوبہ سرحد کی امارت کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ 1978 ء میں آپ جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل بنے اور 1987ء میں آپ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر منتخب کر لیے گئے۔ وہ 4 مرتبہ (1999ئ،1994ئ، ئ،2004ئ) میں امیر منتخب ہوئے۔وہ 22 سال تک جماعت اسلامی پاکستان 1992 کے امیر رہے۔ قاضی حسین احمد 1985 ء میں 6 سال کیلیے سینیٹ آف پاکستان کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1992 ء میں وہ دوبارہ سینیٹر منتخب ہوئے،تاہم انہوں نے حکومتی پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے بعد ازاں سینیٹ سے استعفٰی دے دیا۔ 2002 ء کے عام انتخابات میں قاضی صاحب 2 حلقوں سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تاہم 2007 ء میں جامعہ حفصہ میں فوجی آپریشن اور جامعہ کی طالبات کے بہیمانہ قتل عام پر احتجاجاً اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہوگئے۔ واضح رہے کہ قاضی حسین احمد نے لال مسجد سانحے

سے پہلے وہاں جا کر لال مسجد انتظامیہ سے اظہارِ یکجہتی کے طور پر ایک دن بطور اعتکاف لال مسجد میں گزارا" قاضی حسین احمد نے ہمیشہ اپنی ایک ہی شناخت پر فخر و اصرار کیا ہے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کی حیثیت سے شناخت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اتحاد کی سعی کی۔ تمام مکتبہ ہائے فکر کی اہم پارٹیوں کا اتحاد متحدہ مجلس عمل آپ کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ کسی منصب یا عہدے کی خواہش نہ رکھنے کے باوجود مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ کی وفات کے بعد آپ کو اتفاق رائے سے اس کا صدر چنا گیا۔ اس سے پہلے شیعہ و سنی اختلافات کی بنیاد پر بھڑکائی جانے والی آگ پر قابو پانے کے لیے آپ کی کوششوں سے ملی یکجہتی کونسل کا قیام عمل میں آیا، آپ اس کے روح رواں تھے۔ جماعت اسلامی کی امارت سے فراغت کے بعد انہوں نے قومی اور بین الاقوامی امور پر مشاورت کے لیے ادارہ فکر و عمل کی بنیاد ڈالی۔ 80ء کے عشرے میں متحدہ شریعت محاذ وجود میں آیا تو آپ اس کے سیکرٹری جنرل تھے کراچی میں لسانی تعصبات کے شعلے بلند ہوئے تو اپریل 1988ء میں آپ پشاور سے کاروانِ دعوت و محبت لے کر کراچی پہنچے اور پورے ملک کو محبت و وحدت کا پیغام دیتے ہوئے واپس پشاور آئے۔ تحریک نظام مصطفیٰ میں امت متحد ہوئی تو آپ نے صوبہ سرحد کا محاذ سنبھالا اور پسِ دیوارِ زنداں بھی رہے۔ اتحاد امت کی ان کوششوں کا دائرہ پاکستان تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ قاضی صاحب نے یہ پیغام دنیا بھر میں عام کیا۔ قاضی حسین احمد نے دنیا بھر

کی اسلامی تحریکوں کے قائدین اور علما و مفکرین کو ساتھ ملا کر ان اختلافات کو پاٹنے کی مسلسل کوششیں کیں' اتحاد و وحدت کی یہی کاوشیں کشمیر میں بھی جاری رکھیں' سوڈان میں اسلامی تحریک کے بانی ڈاکٹر حسن ترابی اور صدر مملکت جنرل عمر حسن البشیر کے درمیان قاضی صاحب کے حکم پر صلح کا معاہدہ عمل میں آیا' عراق کویت جنگ ہو یا مسئلہ فلسطین، بوسنیا اور کوسوو میں مسلم کشی ہو یا چیچنیا میں قتل عام، برما کے خون آشام حالات ہوں یا اریٹریا کے غریب عوام کے مصائب، قاضی حسین احمد نے پورے عالم میں امت کی توانائیوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمیشہ امت کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ 1997ء میں ممبر سازی کی ملک گیر مہم شروع کی گئی اور 45 لاکھ افراد نے جماعت اسلامی کی دعوت و پروگرام کی حمایت کرتے ہوئے تنظیم جماعت کا حصہ بننے کا اعلان کیا۔ قاضی حسین احمد صاحب نے بھی ہر حق گو کی طرح قید و بند کی صعوبتوں اور گرفتاریوں کا سامنا کیا۔ تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران گرفتاری کے علاوہ افغانستان پر امریکی حملوں اور یورپ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی پر مبنی خاکوں پر احتجاج کرنے کی پاداش میں بھی انہیں گرفتار کیا گیا۔ دوران گرفتاری انہوں نے متعدد اہم مقالہ جات لکھے، جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ قاضی حسین احمد کے 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ اور وہ سب اپنی والدہ سمیت جماعت اسلامی کی دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں پوری طرح فعال رہتے ہیں۔ قاضی صاحب کو اپنی مادری زبان پشتو کے علاوہ

اردو، انگریزی، عربی، فارسی، پنجابی اور ہندکو پر عبور حاصل تھا۔ وہ شاعرِ اسلام علامہ محمد اقبالؒ کے بہت بڑے خوشہ چین تھے، انہیں فارسی و اردو میں ان کا اکثر کلام زبانی یاد تھا اور وہ اپنی تقاریر و گفتگو میں اس سے استفادہ کرتے تھے۔

آج قاضی صاحب کے فوت ہوجانے سے نہ صرف اہل پاکستان مغموم ہیں بلکہ دنیا بھر کے اسلامی مزاحمتی تحریکیں اپنے روحانی قائد سے محروم ہو گئیں۔

آخر میں کالم کا اختتام اس دعا سے کرتا ہوں کہ اللہ پاک قاضی صاحب مرحوم کے درجات بلند کرکے ان جنت الفردوس میں مقام عطاء فرمائے اور اہل پاکستان سمیت پورے عالم اسلام کو یہ غم سہنے کی توفیق عطاء فرمائے آمین۔

لاتوں کے بھوت

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر بے پناہ قربانیوں کے بعد وجود میں آیا، لیکن بد قسمتی سے شروع دن سے ایک مخصوص طبقہ اس ملک میں ایسا بھی رہا ہے کہ وہ دو قومی نظریے پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔اس کے علاوہ ہماری ایک بد قسمتی یہ بھی ہے کہ گزشتہ کافی عرصے سے حکومتی سطح پر بھی دو قومی نظریئے کی جس طرح دھجیاں اڑائی جارہی ہے اسکی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی،مثال کے طور پر اگر ہم گزشتہ دور حکومت یعنی پرویز مشرف کے دور حکومت کو دیکھتے ہے تو انہوں نے پاکستان کی لیے زندگی اور موت سے بھی زیادہ اہم مسئلے یعنی مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے اصولی موقف سے مکمل روگردانی کرتے ہوے کشمیر کو ہندوستانی جھولی میں ڈالنے کی پوری کوشش کی لیکن بفضلہٖ تعالیٰ وہ اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے میں ناکام رہا۔مشرف کے جانے کے بعد جب موجودہ حکومت بر سر اقتدار آئی تو انہوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور انڈیا کے حوالے سے وہ فیصلے کئیں کہ اس سے پاکستان کی جڑیں تک ہل گئی،مثال کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

ا . آج سے چند سال پہلے سابق انڈین وزیر اعظم اور کانگریس پارٹی کی چیر

پر سن سونیا گاندھی نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ہمیں پاکستان کو جنگ کے ذریعے نہیں بلکہ ثقافتی یلغار کے ذریعے شکست دینا ہے۔ سونیا گاندھی کے اس بیان کے بعد ہونا تو یہ چاہئیے تھا کہ پاکستانی ارباب اقتدار اس بیان کو سنجیدگی سے لیتے اور قوم کے معماروں کی دینی خطوط پر تربیت کرتے تاکہ ممکنہ ہندوستانی ثقافتی جنگ سے بچنے میں آسانی ہوتی . لیکن افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ حکومت نے اس جنگ کو روکنے کی بجاتے اسے اپنی قوم پر زبردستی مسلط کیا جس کے نتیجے میں ثقافتی وفود کے نام پر ہندوستانی طوائفوں کا ملک میں آنا جانا شروع ہوگیا اور یوں ہمارا نوجوان نسل اپنوں کی ناعاقبت اندیشی اور دشمن کی چالوں کی شکار ہو کر اپنے بنیادی مقاصد سے دور ہوتی چلی گئی ۔

۲ . ہندوستان شروع دن سے پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی پوری کوشش کر رہا ہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے دیگر ذرائع استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر برباد کرنے کے لیے مسلسل سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوے پاکستانی دریاؤں پر دھڑا دھڑ ڈیم بنا رہا ہے ،اس کے جواب میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان ہندوستان کو اپنے خطرناک مقاصد سے روکنے کے لیے نہ صرف متعلقہ فورمز پر آواز اٹھا تا بلکہ عالمی برادری کی بھی توجہ مبذول کراتا لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی مسند اقتدار پر براجمان حکمرانوں نے اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتے ہوے نہ صرف اس اہم ایشو کو نظر انداز کر دیا

بلکہ الٹا ہندوستان کو تجارت کے لیے انتہائی پسندیدہ ملک قرار دینے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ تو بلا ہو دفاع پاکستان کونسل اور اس میں شامل جماعت الدعوہ کا کہ انہوں نے قوم کو مسلسل حقائق سے آگاہ رکھا جس کے بناہ پر حکومت فی الوقت حکومت کو سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔

۳۔ ایک طرف ہندوستان پوری دنیا میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلانے میں مصروف ہے اور پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دینے کے لیے پورا زور لگا رہا ہے تو دوسری طرف پاکستان کو دیکھیں کو وہ ہندوستانی طوفان کے آگے بند باند ھنے کی بجائے خیر سگالی کے نام پر انکے جاسوس چھوڑے جا رہے ہیں۔ اسکے علاوہ اور بھی بہت سارے ایشوز ہے کہ جس پر پاکستانی حکومت اپنے اصولی اور دو ٹوک موقف کو چھوڑ کر ہندوستان کے آگے بچھا جا رہا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستان آج بھی پاکستان کو اپنا دشمن اول سمجھتا ہے اور اسکی مثال کنٹرول لائن پر حالیہ کشیدگی کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں کہ اس صورتحال پر پاکستان نے ہندوستان کو ہر قسم کی تعاون حتی کہ اقوام متحدہ سے بھی تحقیقات کرانے کی پیش کش کرچکا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستان کے عسکری قیادت سے لیکر سیاسی قیادت اور اپوزیشن سمیت تمام لوگ پاکستان کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف ہیں۔

مندرجہ بالا تمام تر باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے میں اس کالم کے توسط سے پاکستان کے سیاسی، عسکری قیادت اور امن کی آشا کی علمبرداروں سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ خدارا آپ سب ہندوستان کی سازشوں کو سمجھے اور اپنی تیاری مکمل رکھے کیونکہ بچ بہر حال یہی ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

میلاد منانے کے بعد

گو کہ میرے آج کے کالم کا تعلق ۱ ۲ بارہ ربیع الاول یا میلاد کے حوالے سے نہیں لیکن ان سے جڑا ضرور ہے۔ وہ کیسے ؟ تو ملاحظہ فرمائیں ۔ کراچی سمیت پاکستان کے مختلف علاقوں میں ایک مکتبہ فکر کے لوگ ہر سال بارہ ربیع الاول کو جشن عید میلاد النبی صلی علیہ وسلم مناتے ہیں جس کے وہ لوگ کئی دن پہلے سے تیاریاں شروع کرتے ہیں دیگر تیاریوں اور چراغاں کے انتظامات کے ساتھ ساتھ بڑے پیانے پر بینرز ، پینا فلیکس ، پمفلٹ بڑے بڑے جھنڈے اور چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں تیار کرواکر انہیں مختلف شاہراہوں ، چوراہوں ، گلی محلوں میں آویزاں اور سائیکل ، موٹر سائیکل سمیت دیگر گاڑیوں پر لہرادئیں جاتے ہیں اور جب بارہ ربیع الاول کا دن آتا ہے تو یہ سلسلہ اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ دنیا کے دیگر حصوں کی طرح پاکستان میں بھی عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منانے یا نہ منانے کے حوالے اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف کسی ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے نہیں بلکہ خالص علمی اور شرعی وجہ سے ہے اس لیے وہ طبقہ جو عید میلاد النبی صلی علیہ والہ وسلم کے منانے کے حق میں نہیں وہ مختلف شرعی دلائل سے اس کی نفی کرتے ہیں جس کے جواب میں دوسرا فریق یہ نعرہ لگاتا نظر آتا ہے کہ ''جہاں میں ابلیس کے سوا سبھی تو خوشیاں منارھے ہیں ؛؛ لہذا وہ طبقہ جو اس کو درست

اور لازمی سمجھتا ہے انکی کی طرف سے بھرپور تیاریاں کرنا کوئی انہونی بات نہیں، لیکن ایک بات ایسی ضرور ہے جو کہ افسوسناک ہونے کے ساتھ ساتھ فوری توجہ طلب بھی ہے۔

جیسے کہ اوپر عرض کرچکا ہوں کہ بارہ ربیع الاول کو اس مکتبہ فکر کی تمام تیاریاں اپنی عروج پر ہوتی ہیں اور انکے زیر اثر علاقوں کے سڑکوں، دیواروں، ٹیلیفون اور بجلی کے کھمبوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی گلیاں جھنڈوں اور بینرز وغیرہ سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور ان پر اللہ تعالی اور نبی مہربان محسن انسانیت رحمت العلمین جناب محمد رسول اللہ کے اسمائے گرامی پرنٹ ہوتے ہیں چونکہ بارہ تاریخ گزر جانے کے بعد ان تمام بابرکت ناموں والے جھنڈے اور بینرز وغیرہ کے اتارنے کا معقول انتظام نہ ہونے کے باعث وہ یونہی رہ جاتے ہیں، اور چند دن گزرنے کے بعد وہ ہوا سے اڑ کر نہ صرف کچرا کنڈیوں اور گندے نالوں کی نظر ہوجاتے ہیں بلکہ یہ خدشہ بھی پیدا ہوجاتا ہے کہ کہیں وہ ہمارے پیروں کے نیچے نہ آجاتے، اسی لیے میرا یہ مخلصانہ گزارش ہے میلاد مصطفیٰ منانے والوں کو بالخصوص اور ان تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کہ جنکے بینرز اور جھنڈوں وغیرہ میں اللہ پاک یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک موجود ہوان کو بالعوم کہ مطلوبہ مقاصد حاصل ہونے کے بعد بابرکت اور قابل عزت ناموں والی بینرز، پوسٹرز اور جھنڈوں وغیرہ کی حرمت

اور تقدس کو یقینی بنائیں۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

کشمیر ڈے اور ہماری ذمہ داری

آج ۵ فروری ہے اور آج کا دن ہم اپنے ان مظلوم کشمیری بھائیوں سے بطور اظہار یکجہتی مناتے ہیں جو گذشتہ کئی دہائیوں سے هندوستانی مظالم صرف اس لیئے سہ رہے ہیں کہ انکو هندوؤں کی غلامی قبول نهیں،اور وہ آج بھی اس نعرے کی بنیاد پر پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے هیں،کہ جو تحریک پاکستان کے وقت مسلمانان ہند نے بلند کیا تھا۔یعنی ''لاالہ الا اللہ،،اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے کشمیری عوام نے نہ صرف خون کی کئی ندیاں عبور کیئں بلکہ وہ آئندہ بھی ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیئے تیار نظر آتے ہیں۔دوسری طرف اگر بات کی جائے موجودہ پاکستانی حکومت کا تو وہ کشمیر کے حوالے سے ایک شرم ناک پوزیشن کے ساتھ منظر نامے میں موجود هے۔حالانکہ بابا قوم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کا شہ رگ قرار دیا تھا،اور اپنے شہ رگ کو هندوستانی چنگل سے چھڑانے کے لیئے بابائے قوم نے آزاد قبائل کو مشن سونپا جنهوں نے بہت کم عرصے میں انڈین آرمی کو ناکوں چنے چبوا کر کشمیر کے ایک بڑے حصے کو هندوستان کے غاصبانہ قبضے سے چھڑایا۔انڈیا نے جب کشمیر کو اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھا توانهوں نے نے اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھایا۔جہاں سے یہ فیصلہ آیا کہ کشمیریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرے جب سلامتی کونسل نے

کشمیریوں کو یہ حق دیا کہ ﷺ ہ استصواب رائے کے ذریعے اپنے مستقبل کا چناؤ کرنے میں آزاد ہے تو اسکے بعد اصولا تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہندوستان یہ فیصلہ تسلیم کرتا کیونکہ اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھانے والا ہندوستان خود ھی تھا۔ لیکن بد قسمتی سے یہاں بھی ہندوستان نے اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے کی مینڈیٹ کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کشمیر پر اپنا غاصبانہ قبضہ بر قرار رکھا۔

ہندوستان کے ظالمانہ قبضے کہ خلاف جہاں ایک طرف اہل کشمیر نے شجاعت و بہادری کی کئی داستانیں رقم کی تو وہی پاکستانی عوام اور ماضی کی پاکستانی حکومتیں اپنے کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ رہے۔ گو کہ پاکستانی عوام کے دل تو آج بھی اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں لیکن نائن الیون کے بعد حکومتی مؤقف دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا جارہا ہے اور اس بات کا اندزہ اپ اس بات سے لگائیں کہ اپنے ظالمانہ دور حکومت مٰیں سابق امر پرویز مشرف نے کشمیر کے بٹوارہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اپنے ناپاک عزائم پورے کرنے مین کامیاب نہ ہو سکا۔ مشرف سے تو خیر اتنا گلہ بھی نہیں کہ وہ تو ناجائز طریقے سے زبردستی بزور قوت اس ملک پر مسلط ہوا تھا۔ لیکن ہمیں اگر دکھ ہے تو وہ موجودہ جمہوری حکومت کے رویے پر ہے۔ کیونکہ موجودہ حکومت نہ صرف عوام کا منتخب کردہ حکومت ہے بلکہ یہ حکومت خود کو پیپلز پارٹی کے بانی ذہالفقار

علی بھٹو کے پیرو سمجھتے ہیں، حالانکہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کا مؤقف کشمیر کے حوالے سے بڑا ٹھوس اور واضح تھا۔ جبکہ موجودہ حکومت نے نہ صرف اپنے بانی کے مؤقف کو نظر انداز کردیا ہے بلکہ یہ حکومت ہندوستان کے حوالے سے وہ فیصلے کرنے کے لیئے بھی بے تاب نظر آتی ہے کہ جن کا تصور کرنا بھی پاکستان اور اہل پاکستان کے لیئے ممکن نہ تھا۔

دوسری طرف اگر ہندوستان کو دیکھا جائے تو وہ ہماری ناکام داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کا بھرپور فائدہ اٹھا کر ایک طرف کشمیری عوام کا خون چوسنے مین مصروف ہے تو دوسری طرف تجارت کا لالچ دے کر تو کبھی دھمیاں دے کر ہم پر رعب جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ اگر پاکستانی حکومت تھوڑی بہت بھی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرے تو اس سے نا صرف انڈیا کا بگڑا ہوا دماغ ٹھکانے آسکتا ہے بلکہ کشمیر کو آزادی بھی مل سکتی ہے۔ لہٰذا اگر حکومت چاہتی ہے کہ پاکستان کی تکمیل ہو کر وہ دنیا میں باعزت مقام حاصل کرے، تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر آج کے اس اہم دن پاکستان کو یہ فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ اج کے بعد پاکستان اہل کشمیر کے سفارتی اور اخلاقی حمایت کے ساتھ ساتھ انکا عسکری حمایت بھی کرے گا، کیونکہ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئں کہ کشمیری عوام اپنا کم اور پاکستان کی بقا کے جنگ زیادہ لڑ رہے ہیں، اس لیئے کہ کشمیر نظریاتی، مذہبی اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا حصہ ہے اور آنے والے کل میں

رہے گا بھی. انشاءاللہ.

اپنے ہاتھوں اپنی موت

طالبان ماریں گے تو اس سے بہتر ہے کہ اپنے ہاتھوں ہی سے خود مر جائیں "۔ یہ الفاظ اس امریکی جنرل کے ہیں جسے ایک فوجی دستے کے ساتھ ڈیوٹی کے لیے افغانستان بھیجا جارہا تھا۔ افغانستان آنے سے قبل خودکشی کرتے وقت اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا " ہم افغانستان جارہے ہیں وہاں تو لا محالہ جنگ میں طالبان ہمیں ماریں گے، لیکن اگر ہم خودکشی کریں تو یہ ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوگا کیوں کہ یہاں ہماری میت پر کچھ لوگ جمع ہوکر افسوس تو کریں گے وہاں افغانستان میں مرنے والوں کے ورثا تو اپنے پیاروں کو دیکھ بھی نہیں پاتے، کیوں کہ وہ دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے، وہاں طالبان ہمیں بڑے بڑے بارودی سرنگوں سے اڑائیں گے "۔ دن بدن امریکی فوجی افغانستان کی جنگ میں گرتے چلے جارہے ہیں۔ اب افغانستان ان کے لیے ایک شمشان گھاٹ بن گیا ہے۔ پہلے سپرپاور کا نعرہ لگاتے اور خود کو دنیا کا سب سے بڑا بدمعاش قرار دیتے ۔ یہاں تک کہ کچھ بزدل مسلمان بھی یہ کہنے لگے کہ امریکا ایک بڑی قوت ہے اس سے ٹکرانا پاگل پنے سے زیادہ کچھ نہیں، اس کی طاقت کا مقابلہ بالکل ناممکن ہے خاصکر افغانوں اور طالبان کے لیے۔ لیکن اللہ تعالی کو کچھ اور ہی منظور تھا ایسا نہیں ہوا جس طرح لوگوں نے سوچ رکھا تھا۔

افغانستان پر امریکی جارحیت کے بعد ہی سے ان کی شکست اور پشیمانی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ انہوں نے یلغار سے قبل جو دعوے کیے تھے بعد میں صورتحال ان کے دعووں کے بالکل برعکس تھی۔ افغانستان پر حملہ اور طالبان کے خلاف جنگ کو انہوں نے ایک معمولی سا اقدام سمجھا۔ لیکن اس دلدل میں دھنسنے کے بعد یہاں سے نکلنا انہیں ایک مشکل کام نظر آرہا ہے، جان چھڑانے کی راہ انہیں نظر نہیں آرہی۔ نیٹو اٹلانٹک اور دنیا کی دیگر بڑی طاقتیں اب شکست تسلیم کیے کھڑی ہیں۔ کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف بھاگتے ہیں لیکن جان خلاصی کا صحیح راستہ اب بھی انہیں سجھائی نہیں دیتا۔ اب وہ جو کہتے ہیں ناک میں دم کردیا ہے یقینی امریکی اب پریشان ہیں کہ ہم کون تھے، کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ بااعتماد رپورٹوں کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر فوجی دستہ جو تبادلے کے لیے افغانستان آتا ہے چار اہم نامناسب تدابیر سے خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی شر میں اپنی خیر سمجھتے ہیں فارسی ضرب المثل ہے کہ: "شرما بخیزد کہ خیر ماباشد"۔ خود کو نقصان پہنچا کر یہ کوشش کرتے ہیں کہ شاید اس طرح سے افغانستان جانے یا افغانستان کی جنگ سے بچ جائیں گے۔

سب سے پہلے تو خود کو پاگل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ ان کے قانون

میں جنونی جنگ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ دوسرا خود کو خنجر، چھری یا گولیوں سے ایسا زخم لگاتے ہیں کہ جس سے معذور ہوں یا مر جائیں۔ اور یا ایسے زخمی کردیتے ہیں جو ان کی جنگی اصولوں کے مطابق جنگ کے قابل نہیں ہوتے۔ تیسرا کسی اور کو گولی سے مار دیتے یا زخمی کردیتے ہیں، یا چوری اور ڈاکے کا ارتکاب کرلیتے ہیں، یا سخت جرائم کے مرتکب ہو کر حکومت کی جانب سے گرفتار اور قید کرلیے جاتے ہیں اس طرح سے جنگوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیتے ہیں۔

عالمی ذرائع ابلاغ کی جانب سے حالیہ دنوں میں خودکشیوں کے بارے میں جو رپورٹیں نشر ہوئی ہیں ان میں خودکشی کرنے والے فوجیوں کے اعداد وشمار کے متعلق سروے میں کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد 55 فیصد سالانہ تک پہنچ گئی ہے۔

N.B.C ٹی وی کے مطابق افغانستان میں جو فوجی یا افسران جنگ میں مارے جاتے ہیں خودکشی کرنے والے فوجیوں کی تعداد ان سے زیادہ ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جنگ کے دوران خودکشی کرنے والے فوجیوں کی خبروں کا نشر ہونا پریشان کن ہے کیوں کہ اس سے پتہ چلتا ہے امریکی فوجیوں میں خودکشی کے واقعات دن بدن بڑھ رہے ہیں۔

اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ 6 سالوں میں امریکی فوجیوں کی خودکشی کی واقعات سالانہ 55 فیصد تک پہنچ گئے ہیں۔ امریکی وزارت دفاع پینٹاگون اگرچہ اپنے فوجیوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے گرتے مورال کو سنبھالا دینے کے لیے میلینوں ڈالر خرچ کررہا ہے مگر امریکی فوجی پھر بھی خودکشی کررہے ہیں۔

رپورٹ میں حیرت انگیز طورپر کہا گیا ہے کہ جب سے امریکی پینٹاگون نے خودکشیوں کی روک تھام کے لیے پروگرام کا آغاز کیا ہے امریکی فوجیوں میں خودکشی کے واقعات میں فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 30 امریکی 9 فوجی روزانہ افغانستان میں خودکشی کی کوشش کرتے ہیں جن میں سے 5 یا 4 اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ ان اعداد وشمار کے ذریعے افغانستان میں امریکیوں اور دیگر جارحیت پسندوں کی ہلاکتوں کا صحیح اندازہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ امریکا نے گذشتہ افغانستان میں اپنے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی کل تعداد 400 سے کچھ زیادہ بتائی ہے مگر آزاد ذرائع، طالبان اور عینی شاہدین اس گنتی کو کئی گنا زیادہ بتاتے ہیں اور ان کی باتوں کو جھوٹ قرار دیتے ہیں۔

یہ ایسے واقعات ہیں جن کو پوشیدہ بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ یہاں تک کہ ایسے

کے Boy Friends واقعات بھی ہوئے ہیں کہ بہت سی امریکی خواتین اپنے شوہر یا افغانستان جانے پر خود کشی کرلیتی ہیں ، پھر افغانستان جانے والے دستے کی روانگی کے وقت ایک دستے کے فوجیوں میں سے بہت سوں کو دست کی بیماری لگ جاتی ہے ایسے فوجی بھی جنگ کے قابل نہیں ہوتے بالآخر 100 میں سے 45 فوجی افغانستان بھیجے جاتے ہیں۔

اب امریکا میں یہ بات مشہور ہے کہ امریکی فوجی آپس میں یہ کہتے ہیں کہ افغانستان کی ہاری ہوئی جنگ میں طالبان مارتے ہیں ہم اپنے آپ کو خود ہی ماردیں تو زیادہ بہتر ہے۔جو کوئی ایک فوجی دستہ ایک مرتبہ افغانستان آیا ہے اور اپنی ذمہ داری پوری کرچکا ہے پھر وہ کبھی بھی افغانستان نہیں آیا ، یا تو افغانستان میں قتل اور زخمی ہو جاتے ہیں یا دوبارہ افغانستان جانے کے خوف سے خود کشی کرتے ہیں اور یا خود کو ہمیشہ کے لیے معذور کردیتے ہیں۔

اقتصادی طاقت ، فوجی طاقت اور پچھلے رعب ودبدبہ میں سے اب کچھ بھی باقی نہیں رہا کئی کئی بار اقتصادی بحران کا راستہ روکنے کے لیے بند باندھا گیا مگر سب بے سود ثابت ہوا۔

اور وہ جو وہاں افغانستان میں موجود ہیں افغان جنگ کی پریشان کن صورتحال سے

جن کے دل پھٹے جا رہے ہیں وہ تو ایک الگ ہی موضوع ہے۔ مجاہدین کا رعب ان کے دلوں میں ایک بیماری بن چکا ہے کئی امریکی سول عوام جو ذرائع ابلاغ پر طالبان کے بارودی سرنگوں کے دھماکے دیکھتے ہیں، اپنے پیاروں کی ہلاکتیں دیکھتے ہیں یا اپنے رشتہ داروں کے ٹکڑے ٹکڑے جسم دیکھتے ہیں وہ گھروں میں بیٹھے بیٹھے پاگل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بچوں کو بھی طالبان کے نام سے ڈراتے ہیں۔ بچے جب شور کرتے یا روتے ہیں تو اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں Keep Quiet Don't Cry The Taliban They Will Com۔" چپ ہو جاؤ، رونا مت طالبان آجائیں گے"۔ اب پانی سر سے گذر چکا ہے امریکا اپنے کیے پر یقیناً پچھتا رہا ہے، امریکی فوجی اس جنگ میں یا تو مارے جاتے ہیں اور یا اپنے گلے میں خود پھندا ڈالتے ہیں۔ اقتصاد سے لے کر جانی نقصان تک کچھ بھی نہیں بچا جس سے توقع رکھیں۔ تاریخ میں اس کا ایسا برا انجام رقم ہو رہا ہے کہ شاید آئندہ کبھی بھی متکبرانہ لہجے میں کوئی بڑا دعوی نہ کر سکے۔

بشکریہ۔ فیس بک

ویلنٹائن ڈے کا پیغام۔ دین بیزار مسلمانوں کے نام

ہم پاکستانی قوم بھی کیا عجیب قوم ہے، تضادات سے بھری زندگی تو گویا ہماری پہچان بن چکی ہے۔ بیشتر اوقات ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ بلکہ حد تو یہ ہے کہ بسا اوقات ہمارا ضمیر کسی کام کو کرنے کی ہمیں اجازت نہیں دیتا اور وہ ہمیں لعنت ملامت کررہا ہوتا ہے لیکن کیا کرے کہ ''کہ مہذب دنیا،، کے ساتھ چلنے کی ہمیں ایسی لت پڑچکی ہے کہ اکثر اوقات ہم اپنے ضمیر کا گلہ گھونٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ایسے مواقع تو خیر ہماری زندگی میں بارہا آتے ہیں جب ہم اپنے ضمیر کو اپنے ہی پیروں کے نیچے دبا کر ان کے گلے پر چھری پیر لیتے ہیں لیکن آج ہم دن کے مناسبت اسے اس واقعے کا تذکرہ کرینگے جنہیں ہم ویلنٹائن ڈے کہتے ہیں۔

14 فروری کو ''ترقی یافتہ دنیا،، ویلنٹائن ڈے کو بڑے جوش وخروش اور نہائت ہی ''احترام،، سے مناتا ہیں وطن عزیز پاکستان میں اگر ہم چند سال پہلے یا یوں سمجھ لیجیئے کہ الیکٹرونکٹ میڈیا کا جن بے قابو ہونے سے پہلے کے حالات کا جائزہ لے تو ہمارے ہاں ویلنٹائن ڈے منانے کا کوئی تصور موجود نہ تھا اور اگر کہیں ایلیٹ کلاس کے چند اوباش لڑکے، لڑکیوں میں تھا بھی تو تب بھی ان میں اتنی جراًت نہ تھی کہ وہ سر بازار اس بیہودہ رسم کو مناتے۔ لیکن

بد قسمتی سے جب سے پاکستانی الیکٹرونک میڈیا بے لگام ہو چکا ہے تب سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ویلنٹائن ڈے انگریزوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کا کوئی تاریخی رسم ہے اور چند سال پہلے جس دن کو منانے کا ہمارے ہاں کوئی تصور ہی نہ تھا آج اس دن کے آنے سے کئی دن پہلے ہمارے ہاں کا اسلام بیزار طبقہ اس دن کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے. لیکن ایک اہم سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ویلنٹائن ڈے محض ایک شوقیہ رسم ہے یا اسکا کچھ اور پس منظر بھی ہے ؟ تو اس بارے میں جامعہ اشرفیہ لاہور کے مولانا مفتی کفیل خان کا ایک بیان ملاحظہ بیان فرمائیں۔ '' عیسائی مذہب میں جو شخص پادری بنتا ہے تو وہ شادی نہیں کر سکتا اسی طرح وہ خاتون جو چرچ کی خدمت پر مامور ہوتی ہے اور جسے عیسائی مذہب میں نَنس یا سسٹر کہا جاتا ہے وہ بھی عیسائی مذہب کے رو سے شادی نہیں کر سکتی اسی بنا پر گرجا گھروں میں جنسی بے راہ روی عام ہوتی ہے . سینٹ ویلنٹائن ایک عیسائی پادری تھا جنکا اس زمانے کے لوگ بہت عزت کرتے تھے. اس زمانے میں بھی چونکہ لڑکے، لڑکیوں کے گھر سے بھاگنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن سینٹ ویلنٹائن نامی وہ پادری نہ صرف گھر سے بھاگنے والے جوڑوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے بلکہ انکو اپنے چرچ میں پناہ بھی دیتے تھے. کرتے کرتے ایک دن حضرت ویلنٹائن بھی اسی رو میں بہ پڑے اور شاہی خاندان کے ایک لڑکی کے ساتھ انہوں نے بھی ہاتھ صاف کر دئیں. پادری صاحب کے اس کارنامے کی خبر جب بادشاہ وقت کو ہوا تو انکے حکم

سے پادری ویلنٹائن کو پکڑ لیا گیا اور اسکے بعد اسے انکے سیاہ کارناموں کی وجہ سے قتل کر دیا گیا. اسکے بعد وہ پادری جو کہ ایک عظیم جرم کے پاداش مین قتل ہو گیا تھا، شہید محبت کہلایا. اور آج صدیوں بعد مسلمان بھی اصل حقائق سے صرف نظر کر کے بڑے جوش و خروش سے نہ صرف ویلنٹائن ڈے خود منا رہے ہیں بلکہ اوروں کو اسکے منانے کی ترغیب بھی دیتے نظر آتے ہیں.

یہاں عوام الناس کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے حقائق تو آپ نے ملاحظہ فرمالیئں ہیں مزید ایک، دو باتیں ملاحظہ فرمایئے اور اس کے بعد جو اپکا ضمیر کہے اس پر بلا جھجک لبیک کہیئے.

1. ویلنٹائن ایک مذہبی پیشوا تھا اور اس زمانے کے لوگ اسکے انتہائی تکریم و عزت کیا کرتے تھے لیکن اسنے پھر بھی غلط راستے کا انتخاب کیا. سوال یہ ہے کہ اگر آج ہمارے ہاں خدانخواستہ کوئی مفتی یا عالم دین کسی کا لڑکی بھگا کر لے جائے یا کسی لڑکی کا عزت لوٹ لے تو ایمانداری سے بتائیں کہ کیا آپ انکو وہ عزت دینگے جو آپ آج ویلنٹائن ڈے منا کر ویلنٹائن کو دے رہے ہیں یا اپکا ردعمل اسکے برعکس ہوگا؟ اگر اپ اس مفتی یا عالم کو ویلنٹائن جیسے عزت دینے کے لئیے تیار ہے تو پھر 14 فروری کو شوق سے ویلنٹائن ڈے منائیں لیکن اگر اس مفتی یا عالم کا تھیکہ بوٹی کرنا چاہتے ہیں تو پھر حضرت ویلنٹائن سے اتنی

ہمدردی کیوں ؟ سوچیے گا ضرور.

2. اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہے کہ "اے اہل ایمان یہود ونصاری کو دوست مت بناؤ یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہی میں سے ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' سورۃ المائدہ آیت 51،، قرآن مجید کے ان واضح اور دوٹوک احکامات کے بعد اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ یا تو قرآن حکیم کے احکامات کو من و عن تسلیم کرکے دینا و آخرت دونوں میں سرخرو ہوجائے یا پھر غیروں کی تقلید کرتے ہوئے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

اے این پی قیادت عوام کو بے وقوف نہ بنائے

گزشتہ کافی عرصے سے آل پارٹی کانفرنس کے انعقاد کے لیئے کوشاں حکومتی اتحادی جماعت عوامی نیشنل پارٹی نے بالاخر 14 فروری کو اسلام اباد میں آل پارٹیز کانفرنس کرڈالا۔ اے این پی کا یہ آل پارٹیز کانفرنس اس لحاظ سے تو کافی کامیاب رہا کہ اس میں حکومتی اتحادیوں سمیت تقریبا دو درجن چھوٹی بڑی جماعتوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کا مشترکہ اعلامیہ جس میں کہا گیا ہے کہ '' ملک میں امن کے قیام کی ضرورت ہے تاکہ قیمتی جانوں کا ضاع روکا جاسکے اور ملک میں استحکام' سماجی اور معاشی ترقی کی ضروریات پوری کی جاسکیں، جیساکہ خون آلود دامن کو خون سے نہیں دھویا جاسکتا بلکہ پر امن مذاکرات کے پانی ہی سے خون کے دھبے دھل سکتے ہیں اسی کے مصداق مذاکرات کے لیے ذریعے امن کے قیام کو اولین ترجیح دی جائے۔ دہشت گردی کے مسئلے کے پر امن حل کو ریاست پاکستان کے آئین و قانون اور ملک کی سلامتی واقتدار اعلیٰ کے تحفظ کی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔ اعلامیہ میں کہا گیا کہ کل جماعتی کانفرنس فاٹا میں امن کے قیام کے لیے گرینڈ قبائلی جرگہ کی کوششوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے اور فاٹا کے عوام اوران کے نمائندوں کو یقین دلاتی ہے کہ کانفرنس میں شریک ساری جماعتیں امن کے قیام کے لیے ان کی جدوجہد کی مکمل حمایت کرتی ہیں۔ شرکا نے دہشت گردی کے واقعات میں شہید ہونے والے افراد

کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ کانفرنس میں اپنے خطاب میں اسفندیار ولی خان نے کہا کہ امن کا قیام ہم سب کا مشترکہ ایجنڈا ہے' سب اس پر متفق ہیں کہ پاکستان کو دہشت گردی وانتہا پسندی کا سنگین مسئلہ درپیش ہے،، بظاہر تو کانفرنس کا اعلامیہ بڑا اچھا ہے لیکن اگر اس کے پس منظر تو دیکھا جائے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اے این پی آل پارٹیز کانفرنس کے تیر سے ایک، دو نہیں بلکہ کئی شکار کرنے کی چکر میں ہے. اس بات کو مزید آسانی کے ساتھ سمجھنے کے لیئے یہ وضاحت پیش خدمت ہیں. اے این پی ایک قوم پرست سیاسی جماعت ہے اور یہ خود کو پختون حقوق کے علمبردار کے طور پر پیش کرتی ہے. دلچسپ بات یہ ہے کہ پختون قوم کا پاکستان سمیت پوری دنیا میں پہچان. بہادری، سادگی اور اپنے دین یعنی دین اسلام سے لازوال محبت کی وجہ سے ہے جبکہ اس کے برعکس عوامی نیشنل پارٹی عیاشیوں اور دین بیزار پالیسیوں کی وجہ سے مشہور ہے. یہی وجہ ہے کہ پختوں قوم میں اے این پی کو وہ پزیرائی نہیں ملی جس کے وہ متمنی ہے. ایسے میں جب بھی کبھی انتخابات کا وقت اتا ہے تو اے این پی مختلف قسم کے چکنی چپٹی باتوں کے ذریعے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے. مثال کے طور پر 2008 کے انتخابات سے پہلے جب جب سوات کے حالات ٹھیک نہیں تھے . اے این پی قائدنے صوبہ سرحد موجودہ خیبر پختون خواہ میں یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ طالبان ہمارے پختون بھائی، بیٹے ہیں اور فوجی بھی جن کو اس سازش کے تحت آپس مین لڑایا جارہاہے کہ اس سے دونوں جانب

پٹھانوں کا نقصان ہو. لہٰذا پختون عوام اے این پی کو ووٹ دے تاکہ وہ اقتدار میں آکر اس آگ کو بجھادیں. جب الیکشن 2008 کا وقت آ پہنچا تو پختون عوام نے ''قائد محترم،، اسفندیار ولی کے کہنے پر اعتبار کیا اور ان کو ووٹ دے کر صوبے کا باگ ڈور انکو یعنی اے این پی کو تھما دیا. اس کے بعد اے این پی نے جو حال صوبے اور پختون عوام کا کیا وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں. انہوں نے وعدے کے مطابق اس آگ کو بجھانے کی بجائے امریکہ سے آئے ڈالروں سے کے نشے میں مست ہو کر اس آگ پورے صوبے میں پھیلادیا. جس کے نتیجے میں گاؤں، قصبے ویران جبکہ قبرستان تیزی سے آباد ہونے لگے. اے این پی کو یہ '''اعزاز،، بھی حاصل ہے کہ جہاں پوری قوم گزشتہ کئی سالوں سے امریکی ڈرون حملوں پر سراپاء احتجاج بنی ہوئی ہیں تو وہی اے. این. پی قیادت نے عوام کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے ڈرون کو ابابیل سے تشبیہ دے دی. ڈرون حملوں سے متعلق جہاں پوری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ اس میں زیادہ تر عام، بے گناہ شہری جن میں خواتین، بچے اور بوڑھے شامل ہوتے ہیں نشانہ بنتے ہیں. لیکن اے این پی کے سینٹر حاجی عدیل سینیٹ کے فلور پر کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ ڈرون حملوں میں اسی فیصد القائدہ اراکین ہلاک ہوتے ہیں، اس لیئے ڈرون حملے جاری رہنے چاہیئے. حاجی عدیل کے اس انکشاف کے بعد مجھے یوں لگا کہ شائد ایمن الظواہری حاجی صاحب،، فون یا ای میل کرکے بتاتے ہونگے کہ ہمارے اتنے ارکان ہلاک'' ہوگئے. جبھی تو حاجی عدیل اتنے وثوق سے یہ بات کہتے ہیں -

اب ایک طرف جبکہ وہ آگ اے این پی کی اپنے دہلیز تک آ پہنچی ہے اور دوسری طرف موجودہ حکومت کا وقت بھی پورا ہونے کو ہے تو ایسے میں اے این پی نے اپنے ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینے کے لیئے اے پی سی کا انعقاد کیا. لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اے پی سی اب اے این پی کو ممکنہ طور پہنچنے والے نقصانات کا مداوہ نہیں کر سکتی. کیونکہ انہوں نے ایک تو اس کے غلط وقت کا انتخاب کیا اور دوسرا یہ کہ الفاظ کے جس ہیر پیر سے انہوں نے فریق مخالف کو گھیرنے کی کوشش کی ہے، حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ پہلے خود انکے جوبات دے. اے پی سی کے اعلامئیے کو وہ خاص نکات یہاں سوالات کے شکل میں اے این پی قیادت کے خدمت میں پیش کیا جارہاہے .

اعلامیہ میں کہاگیاکہ '' دہشت گردی کے مسئلے کے پرامن حل کوریاست پاکستان کے'1' آئین و قانون اور ملک کی سلامتی واقتداراعلیٰ کے تحفظ کی حدودکے اندر ہونا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اے این پی کا موجودہ کردار جس میں امریکہ سے غیر مشروط تعاون کرنا، فوجی اپریشن کا دائرہ کا مسلسل دوسرے علاقوں تک پھیلانا، بنا کسی ثبوت کے کئی لوگوں کو عقوبت خانوں میں قید رکھنا، سوات اپریشن کے دوران نفاذ شریعت محمدیؐ کے امیر مولانا صوفی محمد کو بنا کسی عدالتی کارروائی کے جیل سے رہائی دینا اور مقصد پورا ہونے کے بعد پھر جیل

میں ڈالنا کیا ان تمام باتون کا گنجائش ریاست پاکستان کے آئین و قانون میں تھا یا ہے؟
'2' اعلامیہ میں کہا گیا کہ کل جماعتی کانفرنس فاٹا میں امن کے قیام کے لیے گرینڈ قبائلی جرگہ کی کوششوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے اور فاٹا کے عوام اور ان کے نمائندوں کو یقین دلاتی ہے کہ کانفرنس میں شریک ساری جماعتیں امن کے قیام کے لیے ان کی جدوجہد کی مکمل حمایت کرتی ہیں. سوال یہ ہے کہ فاٹا کے عوام کے نمائندے ہے کون؟ اگر اس سے مراد انکے منتخب کردہ اراکین اسمبلی ہے،تو وہ بیچارے تو خود وہاں کے عام سے کنارہ کش ہو چکے ہیں،اور وہ قیام امن کے لیئے کوئی کوشش بھی نہیں کر رہے ماسوا اس کے کہ امریکہ کے ہاتھ مضبوط ہو،ایسے میں آپ کس طرح ان کی مدد کرینگے؟
'3' شرکا نے دہشت گردی کے واقعات میں شہید ہونے والے افراد کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کیا۔اور یہ مطالبہ کیا کہ صوبائی اور قومی حکومت متاثرین کی فوری مدد کرے. ہیاں پر بھی سوال یہ ہے کہ جب حکومت میں شامل تمام پارٹیاں کانفرنس میں موجود رہے تو پھر یہ مطالبہ کس سے کیا جا رہا ہے؟
ایک اخری سوال اے این پی کے کرتا دھرتاؤں سے یہ کہ اب تو آپ چند ہفتوں میں

بے اختیار ہو جائینگے، جب آپ با اختیار حیثیت سے جس اسمبلی کے حصہ تھے، میرے یاداشت کے مطابق اس اسمبلی نے دو دفعہ اس اہم مسئلے پر متفقہ قرار دادیں منظور کی ہے. اگر ان قراردادوں پر عمل ہو جاتا تو یقینا پاکستان بیرونی مداخلت اور اندرونی خلفشار سے پاک ہو جاتا سوال یہ ہے کہ آج امن کے لیئے پریشان اے. این. پی نے کل ان قرادادوں پر عمل درآمد کرانے میں کردار ادا کیوں نہیں کیا؟؟؟

سانحہ کوئٹہ، ذمہ دار کون ؟

کوئٹہ کے علاقے کیرانی روڈ پر ہونے والے بم حملے میں تقریباً نوے کے لگ بھگ افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور اس سے دگنی تعداد میں زخمی بھی ہوئے۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ اہل پاکستان گزشتہ ایک دہائی سے اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک چکے ہیں۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ آدمی ہنسی خوشی گھر سے نکلتا تو ہے لیکن واپسی پر انکی لاش اس خبر کے ساتھ گھر پہنچتی ہے کہ مذکورہ شخص ٹارگٹ کلنگ یا کسی بم دھماکے کا شکار ہوگیا ہے۔ بد قسمتی سے یہ سلسلہ ختم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھ رہاہے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ قاتل ہمیشہ "نامعلوم" ہی رہتے ہے۔

کراچی، پشاور اور کوئٹہ سمیت ملک کے بیشتر حصے بری طرح دہشت گردوں کے رحم و کرم پر ہے۔ حکومتی رٹ کہیں نظر نہیں آرہی۔ آخر یہ سب کچھ کرنے والا ہے کون؟ کیا وہی جس نے حملے کی ذمہ داری قبول کی یا پھر کوئی اور ؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس حملے کی ذمہ داری کالعدم لشکر جھنگوی نے قبول کی ہے لیکن حقائق و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس ظالمانہ کارروائی کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اس وقت کے بین الاقوامی صورتحال، پاکستان

کے اندرونی معاملات اور کوئٹہ میں بیس دن کے وقفے سے ہزارہ کمیونیٹی کے خلاف دو بھیانک کاروائیوں کو باہم ملائے تو صاف طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وطن عزیز ان دنوں بری طرح بین الاقوامی سازشی گروپ کے نرغے میں آچکا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

کوئٹہ میں تباہ کن بم دھماکہ ایک ایسے وقت پر ہوا ہے، جب ایک طرف امریکہ 2014ء تک افغانستان میں موجود اپنے فوجی دستوں کو واپس بلانے والا ہے۔ جس کے بعد امید ظاہر کی جارہی ہے کہ افغان حکومت کی بھاگ ڈور طالبان کے ہاتھ میں آجائیگی۔ تو دوسری طرف پاکستان میں بھی عام انتخابات سر پر ہے اور یہاں کے عوام بھی پر امید ہے کہ اس بار انتخابات کے نتیجے میں بائیں بازو کی جماعتیں برسر اقتدار آئیگی۔ جس کے بعد اگر ایک دم نا بھی سہی تو بتدریج پاکستان امریکی جال سے نکلنے اور ایک آزاد عوام دوست خارجہ پالیسی بنانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ لہٰذا اہل پاکستان پر امید ہے کہ اس نئے منظر نامے کے بعد پاکستان نہ صرف اندرونی طور پر مستحکم ہوجائے گا بلکہ ایک بار پھر کشمیر اور فلسطین سمیت دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے دکھوں کا مداوا کرنے کے قابل بھی ہوگا۔ مستقبل قریب کے اسی نقشے کو دیکھ کر وہ بین الاقوامی گروہ جو ایک عرصے سے پاکستان کو برباد کرنے کے درپے ہیں اور جنکی یہ کوشش ہے کہ اس خطے سے امریکہ کے نکل جانے کے بعد بھی پاکستان امن وامان کے لیے

ترستا رہے۔ وہ گروپ اب پوری طرح حرکت میں آچکا ہے اور اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائے کہ حالیہ حملے کے بعد جس طرح کے بیانات سامنے آئے ہیں اسے دیکھ کر تو پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ باقاعدہ ایک منظم منصوبے کے تحت فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا پیدا کی جارہی ہے۔ اس کام میں کئی باشعور لوگ بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر شریک ہیں۔

درج ذیل سطور میں چند بیانات قارئین کے نذر کئے جارہے ہیں۔ پہلے بیانات ملاحظہ فرمائیں پھر اسکا تجزیہ کرینگے۔

ایجنسیاں ناکام ہو گئی ہیں یا پھر وہ دہشت گردوں کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ (۱

علماء مخالف فرقوں کے قتل کے فتوے دینے سے باز آجائے۔ نہیں تو ان کے خلاف (۲ غداری کا مقدمہ درج کیا جائے گا۔

عدالتیں مجرموں کو چھوڑ دیتی ہے اس لئے عدالتوں پر اعتماد نہیں۔ للہذا ملزمان کو (۳ پکڑنے کی بجائے موقع پر ہی ہلاک کر دیا جائے۔

یہ خاص بیانات اور اعتراضات آپ نے ملاحظہ کیے، اب بالترتیب اسکا تجزیہ پیش خدمت ہے۔

۱) اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جب سے پاکستان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں شریک ہے تب سے پاکستانی خفیہ ایجنسیاں بھی کئی غیر قانونی کاموں میں ملوث ہو چکی ہے۔ جن میں لوگوں کو غائب کرنا اور اور بعد میں بعض کو قتل کرنا بھی شامل ہے۔ اس حوالے سے پاکستان کے چیف جسٹس بھی عدالت عظمیٰ میں ریمارکس دے چکے ہیں۔ لیکن جس طریقے سے کوئٹہ حملے کے بعد ایجنسیاں تنقید کی زد میں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ حالات واقعی ایسے نہیں کیونکہ بقول وزیر داخلہ عبدالرحمان ملک کہ "انہیں بیشتر حملوں کا پیشگی علم ہو جاتا ہے" اور یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ وزیر داخلہ کو وحی تو نہیں آتی بلکہ انہیں معلومات دینے والی یہی ایجنسیاں ہیں۔ یہ کہنا کہ ایجنسیاں ناکام ہو گئی نا صرف حقیقت سے نظریں چرانے کے مترادف ہے بلکہ اس عالمی کھیل کا حصہ بھی ہے جسے ہم سطور بالا میں تحریر کر چکے ہیں۔

۲) میرے جن محترم بھائیوں اور بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ علمائے کرام کے فتوے ہی فساد کی جڑ ہے۔ انکی خدمت میں گزارش ہے کہ تو نہ کسی مولوی نے کوئی فتویٰ دیا ہے اور نا ہی کسی مولوی کو فتویٰ دینے کا مجاز ہے۔ فتاویٰ مفتی حضرات ہی جاری کرتے ہیں، اوراب تک اس قسم کا کوئی فتویٰ جاری نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ کسی مولوی نے کوئی فتویٰ دیا ہے، سفید جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔

۳) یہ کہنا کہ عدالت مجرموں کو چھوڑ دیتی ہے۔ بذات خود اس بات کا اعتراف ہے

کہ حکومت بے گناہ لوگوں کو پکڑنے میں مصروف ہے۔ کیونکہ عدالت الزامات ثابت نہ ہونے کی وجہ سے ہی چھوڑتا ہے اور الزام ثابت کرنا حکومتی وکلاء کا کام ہے نہ کہ عدالت کا۔

مندرجہ بالا حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت، میڈیا اور دیگر حلقوں کی خدمت میں عرض ہے کہ خدارا دہشت گردی کے ہر واقعے میں فرقہ ورانہ پہلو ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ کچھ عالمی سازشوں پر بھی نظر رکھیں۔ اگر انہیں پھر بھی غیروں کی سازشیں نظر نہیں آتی تو پھر وہ صوبہ سندھ کے محکمہ داخلہ کے معاون خصوصی شرف الدین میمن کے اس بیان پر غور ضرور کریں کہ کراچی میں نوے افراد کو صرف تین پستولوں سے قتل کیا گیا اور ہلاک ہونے والوں میں شیعہ، سنی اور مختلف سیاسی جماعتوں کے کارکن شامل ہیں۔

جمہوریت کا تحفہ

ایک طرف پورا پاکستان جل رہا ہے، تو دوسری طرف حکومتی حلقے اس بات کا جشن مناتے نظر آتے ہیں کہ حکومت پانچ سال پورے کرنے والا ہے اور ان کو پاکستان تاریخ میں پہلی بار یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے ۔-

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان جیسے ملک جہاں فوجی جرنیل مختلف وقتوں میں منتخب حکومتوں کو بزور قوت برطرف کرکے اقتدار پر قابض ہوتے رہے ہیں ۔ ایسے میں کسی منتخب حکومت کے لیئے اپنا آئینی مدت پوری کرنا یقینا کسی کارنامے سے کم نہیں ۔ لیکن بدقسمتی سے جس انداز میں پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں نے گزشتہ پانچ سال سے وطن عزیز پر حکمرانی ،وہ ہرگز قابل ستائش اور لائق تحسین قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ موجودہ حکومت کے پانچ سالہ اقتدار نے عوام کا بھرکس نکال دیا ہے اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ موجودہ جمہوری حکومت نے صرف ایک چیز کے علاوہ باقی تمام اشیاء جس میں خورد و نوش سے لے کر ضروریات زندگی کے دیگر لوازمات عوام کے دسترس سے اتنی دور لے گئے ہیں کہ اب بے چارہ عوام کے لیئے اسے لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔اٹا ہو یا چینی ، تیل ہو یا گوشت ،سبزی ہو یا مصالحے ،علاج ہو

یا پھر دوائیاں غرض وہ تمام اشیاء جنکا ہونا جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیئے لازم تھا اب انکا حصول عوم الناس کے لیے وبال جان بن چکا ہے. البتہ ایک چیز اس پورے دور حکومت میں پورے پاکستان میں وافر مقدار مین دستیاب رہا اور اس سے ہر کسی نے باالخصوص غریب عوام نے خوب ''استفادہ،، کیا اور تا دم تحریر کر رہے ہیں. اور وہ چیز ہے موت .جی ہاں موجودہ دور حکومت میں موت کے دستیابی کا عالم یہ ہے کہ آپ مرضی جتنا بھی اس سے چھپتے پھرو یہ ہر جگہ اور ہر وقت اپکے پیچھے سائے کی دوڑ رہا ہے. چاہے آپ گھر میں ہو یا بازار میں ، فیکٹری میں ہو یا آفس میں مسجد میں ہو یا ہسپتال میں بس میں ہو یا پھر ہوائی جہاز میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ عوامی حکومت نے اپ کے لیئے اسکا انتظام ہر جگہ کر رکھا ہے. حکومتی پالیسیوں کے بدولت جب میں نے ہر طرف موت کو رقصاں دیکھا تو مجھے یہ خیا آیا کہ کہیں حکومت اس کے ذریعے سے آبادی کو کنٹرول تو نہیں کر رہا؟ مجھے یہ خیال اس لیئے آیا کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر بیشتر تر ممالک آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیئے خاندانی منصوبہ کے گولیاں اور ٹیکے بڑے زور و شور سے استعال کر رہے ہیں . پاکستان بھی ان ممالک کے صف میں شامل ہے جہاں بین الاقوامی برادری کے تعاون سے آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیئے گزشتہ کئی سالوں سے خاندانی منصوبہ بندی کا کمپین بڑے زور و شور سے جاری ہے اور اس کے لیئے حکومت اس مشہور زمانہ نعرے چھوٹا خاندان زندگی آسان ،، سے بھرپور انداز''

میں استفادہ کرنے کی کوشش کررہی ہے، لیکن کیا کیجیئے پاکستانی عوم کا کہ انہوں ایک تو خاندانی منصوبہ بندی کے عمل کو خاطر میں نہیں لایا بلکہ الٹا حکومتی ''رٹ،، کو چیلنج کرتے ہوئے بڑا خاندان جہاد آسان جیسے سلوگن کو آگے لائے۔ لہذا میرے خیال میں حکومت نے اپنی رٹ بحال کرنے اور آبادی کو کنٹرول کرنے لیئے چھوٹی چھوٹی گولیوں کے بجائے بڑے بڑے گولیوں اور گولوں سے ابادی کنٹرول کا پروگرام بنالیا ہے۔ لیکن عوام کو اس بارے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کام کے لیے بھی سرمایہ حسب سابق ہمارے ''دوست ممالک فراہم کرہے ہیں بلکہ سرمایہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ممالک اس ''کار خیر،، میں بفس نفیس شریک بھی ہے اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ ایک ڈرون حملے پر لاکھوں روپے کا خرچہ آتا ہے لیکن اس کے باوجود امریکہ پاکسانی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیئے بلاناغہ یہ حملے کرنے میں مصروف ہیں۔ امریکہ کا تو خیر کہ وہ ایک امیر ملک ہے، بیچارہ ہندوستان جہاں ادھی آبادی کو روٹی میسر نہیں، ایران اور افغانستان جو کہ غریب ممالک ہے وہ بھی پاکستان کے ساتھ ''حق دوست،، بھرپور طریقے سے نبھارہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر ہم ایک دن قبائلی علاقوں میں ایک درجن افراد کو مٹی میں دفناتے ہیں تو دوسرے دن کراچی میں ڈیڑھ دودرجن افراد اور اس سے اگلے دن کوئٹہ میں سات آٹھ درجن افراد کو مٹی میں دفناتے ہیں اور یہ سلسلہ بتدریج بڑھتا جارہا ہے اور امید ہے کہ جب تک مذکورہ بالا دوست ممالک ''دوستی،، کا حق ادا کرتے رہینگے یہ

سلسلہ اور بھی بڑھے گا.

آنے والے دنوں کے اس متوقع صورتحال کو دیکھتے ہوئے حکومتی ذمہ داران سے درخواست ہے کہ وہ ہنگامی بنیادوں پر جتنا جلدی ممکن ہو سکے یہ کام کرائے . پہلا کام یہ کہ نئی قبرستانوں کے لیئے ابھی سے جگہ مختص کیا جائے کیونکہ تیزی سے گھٹتی آبادی کو دیکھتے ہوئے موجودہ قبرستان ناکافی لگ رہے ہیں . اور دوسرا کام یہ کہ حکومت فری قبر اسکیم متعارف کرائے کیونکہ اب عوام میں اتنی سکت نہیں رہی کہ وہ اپنے جیب سے عزیزوں کے ایک کے بعد ایک کے تدفین کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کرے -

عقلمند کے لیئے اشارہ ہی کافی ہے

یوں تو حکومتی بے حسی کی وجہ سے پورا ملک جل رھا ہے. لیکن جو ظلم و ستم گزشتہ کچھ سالوں سے اہل کراچی کے ساتھ ہو رہا ہے وہ نا قابل برداشت اور نا قابل بیان ہے. کراچی جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ روشنیوں کا شہر ہے. آج اس شہر میں ایسا گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ جس کا چھٹنا مستقبل قریب میں نظر نہیں آ رہا. کراچی کے بارے میں کئی اور لیکن مبنی بر حقیقت باتیں آج سے چند سال پہلے تک مشہور تھی. مثلا. اگر ایک طرف یہ شہر کاروباری حضرات کے لیئے جنت تھا، تو دوسری طرف غریب عوام کے لیئے بھی ماں کی آغوش جیسا تھا. لیکن آفسوس اور صد آفسوس کہ یہ ساری باتیں اب ماضی کا قصہ بن چکی ہے. وہ کراچی کے جن کے فٹ پاتھ اور گرین بیلٹس غریبوں کے پلنگ اور بستر ہوا کرتے تھے، بازار اور مارکیٹیں رات گئے تک کھلے رہتے تھے. آج شام ہوتے ہی اس شہر میں سناٹا چھا جاتا ہے. پاکستان بھر کا معاشی انحصار جس شہر پر ہے. آج اس شہر کے باسی خوف اور بے یقینی کے کیفیت سے دوچار ہے لیکن متعلقہ ادارے اور اس کے ذمہ داران مزے سے خواب خرگوش سو رہے ہیں. جبکہ دشمن ایک سے ایک بدتر وار اس شہر پر کیئے جا رہا ہے. اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ روز اہل کراچی کو دس، پندرہ لاشوں کے ''تحفے،، دینے والوں کا دل جب اتنے لاشیں گرانے کے باوجود ٹھنڈا نہیں

ہوا. توانھوں نے اتوار 3 فروری کی شام عباس ٹاؤن واقع ابوالحسن اصفحانی میں ایک بڑا حملہ کرکے اہل کراچی کو ایک بار پھر خون کی آنسو رلانے پر مجبور کیا. یاد رہے کہ یہ وہی عباس ٹاؤن ہے جہاں آج سے کچھ ہی عرصہ پہلے بھی ایک دھماکہ ہوا تھا. لیکن کیا کہیں متعلقہ ذمہ داران کا کہ وہ نہ تو اس سے پہلے والے حملے کو رکوا سکے تھے اور نہ ہی حالیہ ہونے والے حملے کا سد باب کر سکے . حالانکہ اگر وفاقی وزیر داخلہ کے چند روز پہلے دیئے جانے والے بیان کا جائزہ لیا جائے جس میں موصوف نے کہا تھا کہ ''آنے والے دنوں میں کراچی میں بڑے پیمانے پر خونریزی کا خدشہ ہے،، تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ متعلقہ ذمہ داروں کے پاس اس حوالے سے معلومات موجود تھی لیکن بد قسمتی سے وہ اس سانحے کو روکنے میں ناکام رہے. لیکن ایک اہم سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اخر کیا وجہ ہے کہ وطن عزیز باالخصوص کراچی میں پے در پے ہونے والی خون ریزی روکنے میں ہمارے ادارے ناکام کیوں ہو رہے ہیں؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اگر اپکا دشمن مشرق میں بیٹھا ہے اور اپ اسے ڈھونڈنے مغرب کی سمت جاؤگے تو پھر تو یقینا ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑے گا. اور یہ کام ہمارے ادارے ایک عرصے سے کر رہے ہیں. کہ جہاں کہیں کوئی دھماکہ ہوا متعلقہ ذمہ داران نے فورا بیان داغ دیا کہ یہ خودکش حملہ تھا. بس اس سے اگے نہ کوئی تفتیش اور نا ہی کوئی مستقبل کا لائحہ عمل. گویا کہ خودکش حملہ آور کو یہ استثناء حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے خود کو اڑادے، متعلقہ پاکستانی حکام آڑے نہیں ائینگے. حالانکہ ہونا

تو یہ چاہیے کہ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے کہ بعد متعلقہ حکام سر جوڑ کر بیٹھ جائے اور تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد آئندہ کسی بھی ناخوش گوار واقعے کی روک تھام کے لیئے اقدامات کرے۔ ہماری ایک اور بڑی کمزوری یہ ہے کہ جہاں کہیں کوئی سنی عالم یا عام آدمی دہشت گردی کا شکار ہوا، ہم نے یہ فرض کرلیا کہ بس یہ تو شیعوں کے علاوہ کسی اور کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جب شیعہ برادری دہشت گردی کا شکار ہوجاتی ہے، تو تب بھی ہم آگے پیچھے دیکھنے کی بجائے اپنی توپوں کا رخ سینوں کی طرف کرلیتے ہیں کہ بھائی ان کے اندر تو برداشت ہی نہیں ہے، اور یہ شیعوں کی نسل کشی میں مصروف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کیا واقعی یہ قتل و غارت گری اسی عمل اور ردعمل کا حصہ ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان مین شیعہ، سنی اختلافات ایک عرصے سے موجود ہے اور اس میں دونوں اطراف سے کافی جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ لیکن جس تسلسل کے ساتھ ان دنوں ایک طرف شیعہ آبادی نشانے پر ہے اور دوسری طرف سنی اہل مدارس جن میں علماء کرام اور طلبہ بطور خاص نشانے پر ہے۔ اس سے یہی لگ رہا ہے کہ کوئی تیسرا ھاتھ ہے جو یہ سب کچھ کررہا ہے۔ اور وہ تیسرا ہاتھ اتنا پوشیدہ بھی نہیں ہے کہ نظر ہی نا آئے۔ کیونکہ اسی تیسرے ہاتھ کے بارے میں امریکی وزیر دفاع چک ہیگل کا 2011 میں دیا جانے والا ایک بیان ان دنوں منظر عام پر آچکا ہے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک پڑوسی ملک پاکستان کو عدم

استحکام سے دوچار کرنے کے لیئے تمام حربے استعمال کر رہا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے وہ ملک نہ صرف پاکستان کے اندر اپنے ایجنٹوں کو استعمال کر رہا ہے بلکہ ایک اور پڑوسی ملک کے سرزمین سے بھی پاکستان کے خلاف برسرپیکار ہے۔ چک ہیگل کے بیان کے علاوہ ایک اور رپورٹ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا حوالہ میں اس سے پہلے اپنے ایک کالم میں دے چکا ہوں کہ جس میں محکمہ داخلہ سندھ کے معاون خصوصی شرف الدین میمن نے کہا تھا کہ کراچی میں نوے قتل صرف تین پستولوں سے ہوئے ہیں۔ اور مقتولین میں شیعہ، سنی مہاجر، پٹھان سب شامل ہے۔ ان حقائق کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اتنی دہشت گردی کے باوجود دونوں طرف کے سنجیدہ اور حالات پر نظر رکھنے والی شخصیات بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لیئے تیار نہیں کہ یہ شیعہ سنی اختلاف کا نتیجہ ہے بلکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ کھلی دہشت گردی ہے لہٰذا حکومت اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے عوام کا تحفظ یقینی بنائے۔ اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ واقعے کے بعد پریس کانفرنس کرتے ہوئے شیعہ علماء کونسل کے رہنما علامہ ناظر عباس نقوی کا کہنا تھا کہ شہر میں کالعدم تنظیموں کے خلاف ٹارگٹڈ آپریشن کیا جائے۔ یہاں ایک اور قابل ذکر بات بھی ملاحظہ فرمائیں! دارالعلوم کراچی جو کہ پاکستان کا مشہور دینی ادارہ ہے۔ انکے صدر محترم جناب مفتی رفیع عثمانی نے ایک دن اپنے جمعتہ المبارک کے بیان میں آج سے چند سال پہلے رونما ہونے والے ایک واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے

فرمایا کہ ''ایک دن اچانک دارالعلوم کراچی کے گیٹ پر فائرنگ ہوئی جس سے جامعہ کا ایک طالب علم زخمی ہوا، جب اس حوالے سے معلومات اکٹھا کیا تو پتہ چلا کہ فائرنگ کرنے والا ٹیکسی میں سوار تھا، جو فائرنگ کرکے فرار ہوا. اس کے کچھ دیر بعد یہ خبر ائی کہ شہر میں شیعہ برادری سے تعلق رکھنے والا ایک فرد کو کسی نے گولی ماردی ہے . وہاں جب عینی شاہدین کے بیانات سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ ادھر بھی اسی ٹیکسی سوار نے فائرنگ کیا ہے جس نے تھوڑی دیر پہلے جامعہ کے ایک طالب علم کو زخمی کیا تھا

.

مندرجہ بالا واقعہ تحریر کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ عوام کو پتہ چلے کہ کس طریقے سے تیسرا ہاتھ شیعہ سنی کا آڑ لیکر اپنے مذموم عزائم پورا کرنے میں مصروف ہے. کالم کے اخر میں متعلقہ حکومتی ذمہ داران کی خدمت میں عرض ہے کہ آئیں بائیں شائیں کرنے کی بجائے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیجیئے .اور اس سانحے میں ملوث عناصر کو بے نقاب کرکے عوام کے سامنے لائے جائے. اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ دہشت گردی کہ اس لہر میں ایک ایسے وقت تیزی کیوں آرہی ہے. جب پاکستان نے گوادر پورٹ کا انتظام چین کو حوالے کیا، ایران کے ساتھ گیس پائپ لائن کے منصوبے پر اہم پیش رفت کیا اور تحریک

طالبان پاکستان سے مذاکرات کی حامی بھری. انہی باتوں کو لیکر اگر حکومت وقت تھوڑی سی عقلمندی کا مظاہرہ کرے تو امید ہے کہ انشاءاللہ بہت جلد حالات پر امن ہو جائینگے. کیونکہ بڑوں کا قول ہے کہ عقلمند کے لیئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے-

23 مارچ کے تقاضے

آج 23 مارچ ہے. ہر سال کی طرح اس سال بھی ہم 23 مارچ کو اسی ''روایتی ،،جوش و جذبے سے منا رہے ہیں جیسے کہ ہم گذشتہ ایک عرصے سے مناتے چلے آ رہے ہیں . لیکن کیا ہم 23 مارچ کو اس انداز اور طریقے سے منا رہے ہیں جیسا کہ اس کے منانے کا حق ہے؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہر گز نہیں .بلکہ اگر سچ لکھوں تو وہ یہ ہے کہ ہم اگرچہ اس دن کو منا تو رہے ہیں لیکن اس دن کے پس منظر و پیش منظر کو سامنے رکھے بغیر. بس جب 23 مارچ قریب آتا ہے تو حکومت سرکاری تعطیل کا اعلان کر دیتا ہے .اور پھر 23 مارچ والے دن اگرچہ حکومت، بعض تنظیمیں اور سیاسی پارٹیاں اس دن کے مناسبت سے مختلف پروگرام کے انعقاد کرلیتی ہے .لیکن ان میں سے اکثر قرارداد پاکستان کے روشنی میں چلنے کو تیار نہیں . جبکہ عوامی سطح پر ہماری لاپرواہی کا عالم یہ ہے کہ ہم اس انتہائی اہم دن کو ''نعمت غیر مراقبہ،، تصور کرکے یا تو سارا دن آرام کرتے رہتے ہیں یا پھر سیر و تفریح کے نیت سے سیاحتی مقامات کا رخ کرلیتے ہیں . حالانکہ اگر ہم تھوڑا سا غور کرلے تو 23 مارچ کا یہ دن چیخ چیخ کر ہم سے ایک مطالبہ کر رہا ہے، یہ دن ہمیں اس مشن کا یاد دلاتا ہے جو ہمارے بزرگوں نے شروع کیا تھا اور جسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہم پر واجب ہے، یہ دن ہمیں وہ وعدے بھی یاد دلاتا ہے جو ہم نے اس

وقت اپنے آپ اور مسلمانان ہند سے کئیں تھے. وہ مشن اور وعدے کیا ہے ؟ ملاحظہ فرمائیں.

یہ جمعرات 22 مارچ 1940 کی بات ہے جب آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک لاہور میں شرع ہوا. جمعتہ المبارک 23 مارچ کو) مولوی ابوالقاسم فضل الحق، جسے لوگ شیر بنگال مولوی فضل الحق کے نام سے جانتے ہیں نے وہ قرارداد پیش کی جسے آج ہم قرارداد پاکستان کے نام سے جانتے ہیں. شیر بنگال، نے قرارداد انگریزی زبان میں پیش کی جن کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا. یہ قرارداد اگلے اور اجلاس کے اخری دن یعنی 24 مارچ کو منظور ہوئی.

لیکن اس قرار داد میں وہ کونسی ایسی خاص بات تھی جس پر چل کر مسلمان صرف سات سال کے قلیل عرصے میں ایک ازاد اسلامی مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قائدین کے دلوں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا فکر اور اسلام سے محبت کا جذبہ تھا. جس پر چل کر وہ اپنے مشن میں کامیاب رہے. اور اس بات کا اندازہ ہم قرارداد پاکستان کے اس اجلاس میں قائدین کے خطبات سے بخوبی لگا سکتے ہیں. بابائے قوم محمد علی جناح نے 22 مارچ کے اپنے صدارتی خطاب میں دو ٹوک الفاظ میں فرمایا کہ " ہندو اور مسلمان صرف دو

مختلف قومیں ہی نہیں بلکہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں قائد نے کہا کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب الگ ، ان کے طرز معاشرت ، رسم و رواج الگ ان کے اداب الگ ، نہ تو یہ دونوں اکھٹے کھانا کھا سکتے ہیں اور نا ہی آپس میں شادیاں کر سکتے ہیں . بلکہ خیالات و تصورات سے لیکر زندگی کے ہر پہلو اور ہر زاویے سے ہندو اور مسلمان آپس میں ایک نہیں ہو سکتے .انہوں نے مزید کہا کہ بسا اوقات ان دونون اقوام میں کسی ایک ہیرو دوسرے کا دشمن اور کسی ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہوتی ہے ، لہٰذا مسلمانوں کے لیئے ایک ایسے وطن کو حاصل کرنا اب ناگزیر ہو چکا ہے جس میں وہ اسلامی اقدار کے مطابق زندگی گزار سکے.

قاضی محمد عیسی جو کہ قائد کے ایک با اعتماد ساتھی تھے .انہوں نے اپنے خطاب مین کہا کہ جب مسلمان ازادی حاصل کر لیں گے تو ان صوبوں کے مسلمانوں کو جو اقلیت میں کبھی فراموش نہیں کریں گے بلکہ ان کے قبضہ قدرت میں جو کچھ بھی ہوگا ،اس سے ان، کی مدد ضرور کرینگے .اسکے علاوہ ہمارے ایک اور رہنما سید عبدالرؤف شاہ جو محمد علی جناح کے خاص ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے نے اپنے خطاب میں کہا کہ میرا تعلق ایک ایسے صوبے سے ہیں جہاں مسلمان چند فیصد یہ ہے جن پر آزادی کے بعد کانگریس ظلم کے پہاڑ ضرور توڑینگے ، لیکن ان تمام باتوں پر صبر کرکے ہم صرف اس لیئے پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں کہ ہمارے

. بھائی تو آزادی کے نعمت سے بہرہ ور ہوں گے اور پاکستان میں اسلام کا بول بولا ہوگا
سر عبداللہ ہارون جو کہ تحریک پاکستان کا ایک اہم رہنما تھے .انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگر ہندو صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا گیا تو مسلم صوبوں کے مسلمان اس پر خاموش نہیں رہیں گے .بلکہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کا پورا پورا ساتھ دیں گے.

قارئین گرامی ! اپنے بزرگوں کے بیانات میں سے چند آپ نے ملاحظہ فرمائیں ہیں کہ وہ کیوں اور کس مقصد کے لیئے ایک آزاد مسلم مملکت حاصل کرنا چاہتے تھے .ان کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ آزاد پاکستان میں مسلمان نہ صرف اللہ تعالی کے احکام اور نبی مہربان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر زندگی بسر کرینگے بلکہ اپنے پیچھے رہ جانے والے مسلمانان ہند کو بھی نہیں بھولینگے بلکہ انکی ہر طرح سے مدد کریں گے. اور یہ سچ ہے کہ ہمارے قائدین نے قوم سے جو بھی وعدے کیئیے وہ انہوں نے اللہ تعالی کے مہربانی سے پورے کر دکھائے .لیکن بہت ہی آفسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ بزرگان ملت کے جانے کے بعد ہم نے انکے سب خواب چکنا چور کر دیئے ،ہم نے اپنے بزرگوں کے سب وہ تمام اقوال ردی کے ٹوکری میں ڈال دیئں جن پر چل کر ہم دنیا کی رہنمائی

کر سکتے تھے. ہم انڈین مسلمانوں کی کیا مدد کرتے ہم نے تو اپنی ناعقبت اندیشیوں سے اپنا ادھا ملک گنوادیا. نا صرف ادھا ملک گنوادیا بلکہ جو بچ گیا وہ بھی امریکی احکامات کے روشنی میں چلانے لگے جس کے نتیجے میں آج پورے ملک میں آج ہر طرف افراتفری کا دور دورا ہے. کراچی سے لے کر خیبر تک گوادر سے کشمور تک اور گلگت سے مظفر آباد تک نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نا ہی مال و آبرو اور ان سب کا سبب حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشیوں سمیت ہمارے اعمال بھی ہے. کیونکہ ہم ایک تاریخی پس منظر رکھنے والی نظریاتی قوم ہے اور جب تک ہم اپنے نظریئے سے وفاداری نہیں کریں گے تب تک مسائل کے دلدل سے نکلنا ہمارے لیئے ممکن نہیں. لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم مسائل کے دلدل سے نکل کر دنیا میں ایک باوقار مقام حاصل کرے تو پھر اس 23 مارچ سے ہمیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ ماضی میں ہم سے جو غلطیاں ہو چکی ہیں ہم اسے دہرانے کی بجائے ان غلطیوں سے سیکھ انکا ازالہ کرینگے. اگر ہم نے ایسا کیا تو پھر بہت جلد نہ صرف ہم اپنے تمام مسائل پر قابو پالیں گے بلکہ بہت دنیا میں ایک باعزت مقام بھی حاصل کر لینگے. انشاء اللہ

ہے کوئی انصاف دلانے والا؟؟؟

آج پاکستان میں ہر طرف بے چینی اور افرا تفری کا دور دورا ہے۔ کہیں لوگ بم دھماکوں کے نذر ہو رہے ہیں، تو کہیں ٹارگٹ کلنگ کا زور ہے، کہیں لوگ بھوک و افلاس سے تنگ آکر اپنے شیر خوار بچوں کو بیچ رہے ہیں، تو کہیں اہل وطن کی ایک بڑی تعداد عدالتوں کے چکر اس امید پر لگا رہے ہیں کہ شائد عرصے سے لاپتہ ان کے جگر گوشوں کے متعلق کچھ امید افزاء خبر سامنے آجائے۔ کہیں ہماری مائیں بہنیں فوجی اپریشوں کی وجہ سے اس حال سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہے کہ سر پر چادر نہیں تو پیر میں چپل نہیں، تو کہیں عصمت صدیقی اپنی ہونہار بیٹی عافیہ صدیقی کی یاد میں گزشتہ دس سال سے اشک بہا رہی ہے۔ لیکن کہیں کوئی شنوائی نہیں ہو رہی ہے۔ اور شنوائی ہو گی بھی کیوں؟ کیونکہ جس سے امید تھی وہ تو خود اس قاتل کے محافظ بن گئے ہیں جنکی وجہ سے آج وطن عزیز اس موڑ پر پہنچ چکا ہے۔ وہ مشرف جس نے ایک ایسے وقت میں یہاں کے نظام کو یرغمال بنایا۔ جب ملک ایٹمی دھماکوں کے بعد اقوام عالم میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکا تھا۔ مشرف جب اکتوبر 1999 میں ایک منتخب حکومت کو ڈنڈے کے زور پر برطرف کرکے اقتدار پر قابض ہوا تو اس وقت یہ خود کو بڑا محب وطن، محب اسلام اور بہادر سمجھتا تھا۔ لیکن اسکے غبارے سے ہوا اس وقت نکل گئی جب امریکہ کے ٹوئن ٹاور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد اس وقت کے

امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے اس.. مشرف.. کو فون کیا کہ امریکہ کا ساتھ دینا ہے یا نہیں .اس ایک فون کال کے جواب میں ''بہادر،، مشرف کے اعصاب جواب دے گئے اور انھوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں '' جو کہ در آصل اسلام کے خلاف صلیبی جنگ ہے،، امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر دیا .یہاں یہ بات واضح رہے کہ جب ملک میں مشرف کے اس فیصلے پر اعتراضات ہونے لگے ..تو مشرف کہنے لگا کہ اگر میں امریکہ کا ساتھ نا دوں تو وہ ہمیں ..پاکستان،، کو پتھر کے دور میں پہنچا دینگے .جبکہ ساتھ دینے میں ہمیں کئی فائدے ملیں گے .وہ فائدے کیا تھے جو مشرف نے اہل وطن کو گنوائےِ؟1 .مسئلہ کشمیر پر اہم پیش رفت ہوگا اور یہ پیش رفت پاکستان کے حق میں ہوگا . پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو مزید ترقی دی جائے گی اور یہ شعبہ بہت ترقی کرے گا.2.3 افغانستان میں پاکستان دوست حکومت بنے گی اور اس میں شمالی اتحاد کا کوئی حصہ یا. کردار نا ہوگا.ایک اور بات جو مشرف نے کہی تھی وہ یہ تھی کہ امریکہ صرف پاکستان کی فضائی حدود استعال کرے گا .زمین میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا .لیکن پھر چشم فلک نے دیکھا کہ مشرف کے وہ تمام وعدے عوام الناس کے آنکھوں میں دھول جھونکنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھے .کیونکہ امریکہ کے ساتھ دینے کے بعد کشمیر آزاد کیا ہوتا،مشرف نے تو اپنی سی پوری کوشش کی کہ کسی طرح کشمیر کا بٹوارہ ہوجائے .وہ تو اللہ پاک کا کرم ہوا کہ بیل منڈے نہ چڑھ سکی ورنہ مشرف ''صاحب،، تو اپنی طور پر اسکا انتظام کر چکے تھے .اسی طرح

ایٹمی اثاثوں کو ترقی دینے کی بجائے ان کے موجد فخر پاکستان ڈاکٹر اے کیو خان کا جو حشر کیا قوم آج بھی اس پر شرمندہ اور نادم ہیں .طالبان کے بعد افغانستان میں پاکستان کے حامی حکومت کا ہونا دن میں تارے دیکھنے کا مترادف ہے کیونکہ دن میں تارے نا کبھی نظر آئے ہیں اور نا ہی کوئی امید ہیں .جہاں تک بات تھی صرف پاکستانی فضائی حدود امریکہ کے حوالے کرنے کا . .تو فضائی تو فضائی مشرف تو زمین کے اندر تک بھی سب کچھ امریکہ کے حوالے کرچکا تھا مثلا .جیکب اباد بیس ، دالبدین،تربیلہ .اور اسلام آباد و کراچی کے اندر کئی اہم جگہیں اور علاقے وغیرہ. مشرف کا دل جب اس پر بھی نہیں بھرا تو پھر اس نے براہ راست انسانوں کی فروخت کا کاروبار شروع کردیا .اور عافیہ صدیقی .خالد شیخ محمد،ملا عبدالسلام ضعیف سمیت ان سینکڑوں لوگوں کو امریکہ کہ آگے فروخت کر ڈالا جو نا صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے بھی اثاثہ تھے.ظالم مشرف نے اس پھر بھی بس نا کیا، بلکہ یہود و نصاری کی خدمت میں دو قدم اور آگے بڑھ کر افواج پاکستان کے ذریعے مارچ 2004 میں ان قبائل پر حملہ آور ہوئے جو پاکستان کے دفاع کے ضامن تھے .اور جنکی موجودگی میں کوئی دشمن اس پاک وطن کو میلی آنکھ سے بھی دیکھنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا .یہ وہی قبائل تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف اس وقت شجاعت اور بہادری کی داستانیں رقم کیئں جب برطانوی سلطنت میں سورج غروب بھی نہیں ہوتا تھا،ان قبائل کے حب الوطنی کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ جب افواج پاکستان کے ساتھ میڈ بھیڑ کے

دوران ہی ہندوستان کے ساتھ تعلقات کچھ کشیدہ ہوئے تو وہی بیت اللہ محسود ،،جسکو ہم امریکی اور بھارتی ایجنٹ کہتے نہیں تھکتے تھے ،،نے اپنے ایک ہزار جانبازوں کا دستہ فوری طور پر تیار کیا اور یہ اعلان کردیا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ افواج پاکستان کا شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیئے تیار ہیں .بیت اللہ محسود کی طرف سے اٹھائے جانے والے اس قدم کے اس وقت پاکستانی فوج کے ایک حاضر سروس کرنل کو یہ کہنا پڑا کہ 'یہ لوگ ہمارے دشمن نہیں بلکہ دوست ہے لیکن حالات نے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کردیا ہے .اور حالات پیدا کرنے والا کوئی اور نہ تھا یہی مشرف تھا

کس کس بات کا رونا روئے اور کس کس بات کا ماتم کرے.لال مسجد جو اپنی رنگ کی وجہ سے لال مسجد مشہور تھا.مشرف نے اسے معصوم طلبہ وطالبات کے خون لال کردیا.قصور کیا تھا ان مظلومین کا،صرف یہی نا کہ اللہ کے زمیں پر اللہ کے نظام دیکھنا چاہتے تھے.کیا یہ جرم تھا؟اگر یہ جرم تھا تو یہ جرم تو بہت پہلے محمد علی جناح اور دیگر اکابرین پاکستان بناتے وقت کرچکے ہیں کیونکہ وہ بھی تو یہی چاہتے تھے کہ پاکستان آزاد ہوگا تو وہاں پر اللہ کا نظام لاگوں ہوگا.اور اسی وجہ سے تو یہی بات آئین پاکستان کا حصہ ہے کہ اس ملک میں کوئی قانون اسلام سے متصادم نہیں بن سکتا اور حاکمیت اعلی صرف اللہ ہی کے لیئے ہے. لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مشرف نے جو کچھ اپنے دور اقتدار میں کیا

کیا اس ملک کا قانون اس کا اجازت دیتا ہے ؟ اگر ہاں تو وضاحت درکار ہے. اور اگر.
نہیں تو پھر اس ملک میں اتنی اندھیر نگری کیوں ہے کہ جب ہزاروں لوگوں کا قاتل اس
ملک سے جارہا تھا تب بھی اس کو پورا پروٹوکول دیا گیا تھا. اور جب وہ قاتل واپس آیا تو
نا صرف عدالت نے اسکی ضمانت منظور کرائی بلکہ حکومت نے قانوں کو بالائے رکھتے
ہوئے انکو زبردست پروٹوکول دیا. کیوں ؟کیا ہے کوئی انصاف دلانے والا؟؟؟

اے خوابیدہ مسلم جاگ ذرا

اس وقت اگر نظر دوڑائی جائے تو تقریبا پوری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف اہل کفر نے جنگ چھیڑ رکھی ہے.اور یہ جنگ کسی ایک محاذ پر نہیں بلکہ ہر محاذ پر گذشتہ ایک عرصے سے نہ صرف جاری و ساری ہے بلکہ اس میں ہر گزرتے دن کے ساتھ تیزی آتی جارہی ہے . عسکری میدان ہو یا ثقافتی ، معاشی میدان ہو یا پھر تعلیمی یہود و نصاری اور انکے ایجنٹ مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں . کہیں اقلیتوں کی حقوق کی پامالی کا پروپیگنڈہ کرکے مسلمانوں سے انکی سرزمین چھین لی گئ .تو کہیں دہشت گردی اور انتہا پسندی کا لیبل لگاکر مسلمانوں کا پیچھا کیا گیا.لیکن جہاں دیکھا کہ کوئی الزام کا نہیں دیگا تو وہی نسلی فسادات کا نام دیکر مسلمانوں کو ان کے مال و متاع سمیت نیست و نابود کیا .اور اسکی مثال میانمار ''برما،،کے مسلمانوں پر.برپا کئیں گئے مظالم کے شکل میں ہمارے سامنے ہیں . جہاں مسلمان اس بے دردی سے کاٹے جارہے ہیں کہ انسان کو خود کو انسان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگتی ہے .لیکن آفسوس کہ ''مہذب دنیا،،کے رہنے والے مسلمانوں کی اس کھلی نسل کشی کو نسلی فسادات کا نام دے کر حقائق کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہے ہیں .

مہذب دنیا،، یعنی اہل مغرب سے تو اتنا شکوہ اس لیئے بھی نہیں کہ انکا تو ایجنڈہ ہی یہی '' ہے کہ دنیا سے باعمل مسلمانوں کا صفایا کردیا جائے اور بچ جانے والے نام کے مسلمانوں کو غلام بنایا جائے.اس لیئے ان سے تو امید یہی ہے کہ وہ اپنے اس ایجنڈے کو، پایا تکمیل تک پہنچانے کی ہر کوشش کرینگے.یہ اور بات ہے کہ انکے یہ خطرناک عزائم انشاء اللہ کبھی بھی پورے نہیں ہونگے۔لیکن اس موقع پر اگر شکوہ ہے تو وہ اپنے ہی مسلمان حکمرانوں سے ہیں. جو تمام وسائل اور ہر قسم کی نعمت خداوندی موجود ہونے کی باوجود بھی ٹس سے مس نہیں ہورہے ہیں. ان مسلم حکمرانوں میں اکثر نے تو چھپ سادھ لی ہیں. اور جسکو لب کشائی کی توفیق ہوئی تو انھوں نے نہایت ہی مریل سی انداز میں ان انسانیت کش واقعات کی صرف مذمت کرنے میں عافیت جانی. حالانکہ اگر دیکھا جائے تو یہ وقت مذمت کرنے یا مذمتی قرار دادیں منظور کرانے کا نہیں،بلکہ ان ہاتھوں کو روکنے کا ہے جو مسلمانان میانمار کو بے دردی سے دن،رات ذبح کر رہے ہیں.اور یہ کا مسلمان حکمران باآسانی بنا کسی جنگ کے لڑے بغیر کر سکتے ہیں.بس تھوڑی سی ہمت .اور دل میں ان مظلومین لے لیئے تھوڑی سی ہمدردی ہونی چاہیے

مجھے یاد ہے کہ جب پچھلے سال بھی بدھ مت کے پیروکاروں نے ہزاروں مسلمانوں کو شہیداور لاکھوں کو بے گھر کرکے ان کے گھراور دیگر املاک وغیرہ لوٹ مار

کے بعد جلا رہے تھے تو اس وقت ترکی کے وزیر اعظم نے اپنی اہلیہ اور وزیر خارجہ کو برمی مسلمانوں کی آشک شوئی کے لیئے میانمار بھیجا اور اس کے بعد سعودی حکومت نے مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا تو اس کے بعد مسلمانوں کی قتل و غارت گری رک گئی تھی . گویا صرف دو مسلمان مملکتوں کی جانب سے برمی مسلمانوں سے ہمدردی کرنے کے بعد میانمار حکومت سمجھ گئی تھی کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ظلم بند نا کیا . اور اس پر مسلمان حکمرانوں نے کوئی ایکشن لیا تو لینے کی دینے پڑ جائیں گے . میرے خیال میں پچھلے سال ترکی اور سعودی عربیہ کے میدان میں آنا میانمار حکومت نے اپنے لیئے ایک ٹیسٹ کیس کے طور پر لیا تھا . اور وہ دیکھ رہے تھے کہ آیا ترکی اور سعودیہ کوئی ٹھوس لائحہ عمل لیکر برمی مسلمانوں کی مدد کے لیئے میدان میں آئے ہیں یا پھر یہ کوئی جذباتی عمل ہے . اس وقت اگر مسلمان مملکتیں کوئی ٹھوس حکمت عملی کے ساتھ میدان میں آتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے نہ صرف مسلمانوں کی حقوق کی حفاظت ہو جاتی بلکہ آئندہ کے لیئے بھی وہ بدھوؤں کی مظالم سے بچ جاتے . لیکن جب میانمار حکومت نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ردعمل جذباتی اور وقتی ہے . تو وہ اس بار مزید شیر دل ہو کر مسلمانوں کے خلاف میدان میں اتر آئے . اور یہی وجہ ہے کہ اس بار مسلمانون کے قتل عام کے بعد انکی لاشیں تک جلائی جا رہی ہیں تاکہ کسی قسم کا کوئی ثبوت نا رہے . اس کے علاوہ حسب سابق نہ صرف مسلمانوں کی املاک جلائی جا رہی ہے بلکہ اس بار چن چن کر مساجد اور مدارس کو

بھی شہید کرنے کا سلسلہ جاری ہے ۔ایک تازہ واقعہ جوآج 3 اپریل کو میڈیا میں رپورٹ ہوا،وہ یہ میانمار کے ایک مدرسے میں ''پر اسرار،، آتشزدگی کے نتیجے میں 13 معصوم طالب علم شہید جبکہ دو درجن کے قریب شدید زخمی ہوئے ہیں ۔ گو کہ وہاں کی انتظامیہ واقعے کو شارٹ سرکٹ قرار دے رہی ہیں ، لیکن آزاد ذرائع ، متاثرین اور عینی شاہدین گواہی دے رہے ہیں کہ یہ واقعہ شارٹ سرکٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ بدھوں کا کیا ہوا کارنامہ ہے جن میں انہوں نے مدرسے میں پڑول چھڑک آگ لگائی ۔ یہ تو صرف ایک ہی واقعہ ہے ورنہ ظلم کی ایسی کتنی داستانیں اور بھی ہیں جو بدھ مظلوم مسلمانوں کے خلاف کرچکے ۔ گو کہ ان مظالم کے بعد سعودی حکومت نے اپنے ہاں تقریبا دو ہزار برمی مسلمانوں کو مفت اور مستقل رہائش دینے کا اعلان کیا ہے ۔ لیکن میرے خیال میں اس اقدام سے برمی مسلمانوں کی دکھوں کا مداوا ممکن نہیں بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہی کوشش تو میانمار حکومت بھی کر رہی ہے کہ کسی طریقے سے مسلمان وہاں یعنی برما سے نکل جائے ۔ اس لیئے میں یہ بات لکھنے پر مجبور ہو کہ سعودی حکومت کا یہ اقدام اگرچہ ایک احسن اقدام ہے لیکن اسکا فائدہ اتنا نہیں ۔ اسی لیئے تمام تر حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اب وقت آگیا ہے کہ مسلم حکومتیں اپنی وجود کا احساس کرتے ہوئے ان مظلومین کی مدد کے لیئے آگے بڑھے اور یہ مدد عارضی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ایسا مدد ہونا چاہیئں کہ اس مدد کے ملنے کے بعد نہ صرف مسلمان اپنی اس سرزمین پر اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی گزار سکے بلکہ

آئندہ بدھوؤں کو انکے خلاف کسی بھی قسم کے ظلم کی جرآت ہی نہ ہوسکے۔ اور یہ کا بہت جلد کرنا ہوگا کیونکہ مسلمانوں کو غفلت کے خواب میں پڑے دیکھ کر اب سری لنکا بھی مسلمانوں کے خلاف پر تول رہا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ جتنا جلدی ہوسکے او آئی سی کے مردہ گھوڑے میں جان ڈال کر ان سے وہ کام کرائے جائے جس کے لیئے اسے وجود میں لایا گیا تھا۔ لیکن اگر اس میں یعنی او آئی سی میں کھڑی ہونے کی توفیق نہیں تو پھر اسکو کسی گڑھے میں دفن کرکے کوئی اور فورم بنایا جائے۔ اور اس میں ایسے لوگوں کو اگے لایا جائے جو سچ مچ امت امہ کا دکھ درد اپنے دلوں میں رکھتے ہوں۔ ایک اور لیکن اخری بات اپنے تمام مسلمان بھائیوں کے نام کے نام یہ کہ آپ اپنے تقریر، تحریر اور دعاؤں میں برمی مسلمانوں کو یاد ضرور رکھیں۔ کیونکہ وہ آج کل سب زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔

نئی حکومت سے قوم کی توقعات

عام انتخابات 2013 جن کے بارے میں مختلف چہ مگویہ جاری تھی کہ ہونگے یا نہیں ہونگے بالآخر ہوگئے۔ یہ ایک لحاظ سے پاکستانی قوم کی فتح بھی ہے کہ ان انتخابات میں ان قوتوں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا جنھوں نے دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ کو زبردستی پاکستان کا جنگ بنائے رکھا .اور اس سلسلے میں پروپیگنڈے اور طاقت دونوں کا بھرپور استعمال بھی کیا .ان عام انتخابات نے یہ بات ثابت کردی کہ وہ قوتیں اپنی دعوؤں میں سو فیصد جھوٹے تھے کیونکہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ نہ کبھی ہماری جنگ تھی اور نا ہی ہو سکے گی .بلکہ سچ یہ ہے کہ پاکستانی عوام اس جنگ کو اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کے طور پر دیکھتی ہیں. لیکن دوسری جانب یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان انتخابات نے پاکستانی سیاستدانوں کا توجہ کئی اہم ملکی اور بین الاقوامی امور سے ہٹائے رکھا جو کہ کسی بھی طور قوم کے لیئے نیک شگون نہیں ہے . ان امور میں ایک تو بلوچستان کے علاقے مشکال میں آنے والا زلزلہ تھا جس پر سوائے چند دینی رفاحی اداروں کے سوا کسی نے توجہ ہی نہیں دی .اور دوسرا پاکستانی جیل میں ہندوستانی دہشت پر حملہ اور اس کے بعد مقبوضہ کشمیر کے ایک جیل میں قید پاکستانی قیدی ثناءاللہ پر حملہ اور پھر اسکی شہادت جیسے انتہائی اہم امور

. شامل ہیں

مقبوضہ کشمیر کے کوٹ بلوال جیل میں پاکستانی قیدی پر بہیمانہ حملہ اگر انتخابات کے عین موقع پر نہ ہوتا تو شائد ہم اسے کچھ نہ کچھ توجہ ضرور دیتے . چلیں اور اگر کچھ بھی نا ہوتا تو چند ایک مظاہرے تو ضرور ہوتے لیکن آفسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ انتخابات کا بخار ہمیں اتنا چڑھا ہوا تھا کہ ہم نے اسکے سوا کسی اور جانب توجہ دینا گوارا بھی نہ کیا .

حالانکہ یہ ایک فوری توجہ طلب کیس تھا کیونکہ اسس پر ایک سوچے سمجھے سازش کے تحت اس وقت حملہ کیا گیا جب پاکستانی جیل میں قید سزائے موت کا منتظر سربجیت سنگھ پر حملہ ہوا تھا . یہاں یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اگر معاملہ صرف قیدی پر حملے اور جوابی حملے کا ہوتا تو پھر یہ مسئلہ اتنا اہم نا ہوتا بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں قیدیوں کی حثیت میں زمین اور اسمان کا فرق تھا اور وہ یہ کہ سربجیت سنگھ ایک ہندوستانی دہشت گرد تھا جس نے پاکستان میں بھرپور دہشتگردانہ کارروائیاں کر رکھی اور بالآخر ہندوستان فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا . اس کے بعد اس پر کیس چلا اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا لیکن وہ صفائی پیش کرنے میں ناکام رہا اسکے بعد اسکو سزائے موت ہوئی . اسی سزائے موت کو نہ صرف سپریم کورٹ نے برقرار رکھا بلکہ صدر پاکستان بھی سربجیت کی رحم کا اپیل مسترد کر چکا ہے . لیکن اسکے باوجود بھی اسکی رہائی کی

کوششیں جاری رہی جس پر طیش میں آکر ایک پاکستانی قیدی نے حملہ کردیا جس سے وہ زخمی ہوااور بالآخر چل بسا. یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سربجیت سنگھ پر ہونے والے حملے کا نہ صرف پوری قوم نے مذمت کی تھی بلکہ اسے اسلام اور پاکستانی اقدار کے بھی خلاف قرار دیا تھا. لیکن بات پھر وہی آجاتی ہے کہ اگر انڈیا اپنے تسلیم شدہ جاسوس کی رہائی کی کوشش نا کرتی تو پھر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ پھر اس کے قیدی پر حملہ بھی نا ہوتا. اس سلسلے میں پاکستانی متعلقہ حکام بھی قابل مذمت ہے جس نے ایک ثابت شدہ دہشت گرد کو مہمان بنائے رکھا اور بالآخر یہ واقعہ پیش آیا.

دوسری جانب اگر بات کی جائے پاکستانی قیدی ثناءاللہ پر حملے کی تو اس بات میں کیا شک ہے کہ وہ ایک چرواہا تھا جو غلطی سے سیالکوٹ کے قریب سرحد پار کرگیا اور پھر اسے ہندوستانی فورسز نے پکڑ کر زندان مین قید کرڈالا. اور سربجیت سنگھ پر ہونے والے حملے کو جواز بنا کر ہندوستانی جیل حکام کی ملی بھگت سے ایک سابق ہندوستانی فوجی جو کہ قید میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ثناءاللہ پر حملہ آور ہوا. اور یوں وہ بیہمانہ تشدد کے بعد جام شہادت نوش کرگیا. حالانکہ سربجیت پر ہونے والے حملے کے بعد ہندوستانی حکام کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ انڈین جیلوں میں قید پاکستانی اور دیگر مسلمان قیدیوں کی تحفظ کو یقینی بناتے.

بہر حال پہلے جو ہوا سو ہوا اب جب کہ پاکستان میں تبدیلی آچکی ہے اور وہ بھی میاں محمد نواز شریف کی شکل میں جسکا پہچان ملک میں بہر حال ایک محب وطن رہنما کوکے طور پر ہے ۔ تو ہم اللہ تعالی سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ خارجہ پالیسی بناتے وقت بہر حال پاکستانیوں کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائینگے ۔ گو کہ ان دنوں انکا جھکاؤ ہندوستان کی طرف کچھ زیادہ دکھائی دے رہا ہے جس پر اہل وطن کا مضطرب ہونا یقینی ہے لیکن ہم پھر بھی یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک سیاسی کھیل کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور وہ جانے والی حکومت یعنی پی۔ پی۔ پی کی حکومت کا انجام سامنے رکھتے ہوئے درست سمت میں سفر جاری رکھیں گے اور تمام بیرونی طاقتوں کے ساتھ ۔برابری کے بنیاد پر تعلقات استوار رکھیں گے ۔ انشاءاللہ .

کیاعمران خان ناکام ہوا؟

عام انتخابات 2013 جیسے بھی تھے ہو گئے لیکن یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی کہ آیا عمران خان کے پاکستان تحریک انصاف کو ایک فاتح جماعت تصور کیا جائے یا نہیں. اور اس بات پر معروف تجزیہ نگاروں سے لے کر عام لوگوگ بھی دو حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں .ایک گروہ کا خیال ہے کہ ماضی کو سامنے رکھتے اگر پی.ٹی.آئی کا موجودہ کارکردگی کو دیکھا جائے تو یہ بلاشبہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے کہ پاکستان تحریک انصاف نہ صرف خیبر پختون خواہ کے عوام کا نمائندہ جماعت بن کر ابھری بلکہ انہوں نے معروف سیاسی جماعتوں کے ہوتے ہوئے مرکز میں بھی اچھی کارکردگی دکھائی .اس کے علاوہ کراچی جیسے شہر میں جہاں مخصوص سیاسی خول سے نکلنے کو اتنا اسان نہیں سمجھا جاتا وہاں خان صاحب کی جماعت کو ہزاروں ووٹ پڑنا اس بات کا غماز ہے کہ پی.ٹی.آئی اب ایک کامیاب جماعت کے طور پر پاکستان کے سیاسی میدان میں موجود ہیں .

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ عمران خان نے اس سے بھی بڑے دعوے کئیں تھے لہٰذا اسکی لائی ہوئی سونامی نواز شریف کے چٹان نے ٹکرانے کے بعد سمندر میں کہیں گم ہو گئی ہیں اور وہ پنجاب کو فتح کرنے میں ناکام رہے لہٰذا خان صاحب کو

. ناکام تصور کیا جائے

جہاں تک میرا خیال ہے تو میں پہلے والے گروہ کے خیالات سے متفق ہوں .اور میں سمجھتا ہوں کہ پی .ٹی.آئی کا موجودہ کارگردگی یقینا کسی کارنامے سے کم نہیں کیونکہ اگر ہم پاکستان تحریک انصاف کا موازنہ دوسری سیاسی جماعتوں سے باالخصوص پاکستان مسلم لیگ نواز سے کرے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ دوسرے جماعتوں کے پاس وعدوں کے علاوہ ماضی میں کیئیں گئے کام اور مضبوط سیاسی بیک گراونڈ موجود تھا .پنجاب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو وہاں کے وزیر اعلی نے صوبے میں کافی کام کروائے ہیں جس کو انہوں نے اپنے بھائی کے انتخابی کمپئین کا حصہ بنایا اور یوں وہ عوام کو اپنی جانب راغب کرنے میں کامیاب رہے. اس کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی ،اور عوامی نیشنل پارٹی کی بات کی جائے تو وہ صوبوں کے علاوہ مرکز میں بھی برسر اقتدار رہے اور سرکاری وسائل کو اپنا حق سمجھتے ہوئے انہوں نے اسکا بھرپور استعمال کیا .اس کے بر عکس اگر عمران خان اور اسکی پارٹی کی بات کی جائے تو 2002 کے انتخابات میں تحریک انصاف کے پاس عمران خان کے سیٹ کے علاوہ قومی اسمبلی میں ایک بطھی نشست نہیں تھی جبکہ 2008 کے انتخابات میں تحریک انصاف نے بائیکاٹ کر رکھا تھا .انہی وجوہات کے بناپر ہم یہ بات کہ سکتے ہیں کہ پاکستان تحریک انصاف کے پاس نہ تو ماضی کا کوئی خاص تجربہ تھا اور نہ ہی کوئی کام اور اگر کچھ

تھا تو وہ اخلاص کے ساتھ کیئیے گئے وعدے تھے. لہٰذا ایسے میں موروثی اور برادریوں میں بٹی سیاست میں جگہ بنانا اتنا آسان ہر گز نا تھا. لیکن عمران خان نے اللہ پاک کے فضل و کرم سے نا صرف ان موروثی سیاست دانوں کا بھرپور مقابلہ کیا بلکہ بعض کو ناک آوٹ بھی کردیا. لہٰذا اس کارگردگی کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تحریک انصاف نے 2013 کے عام انتخابات میں توقع سے بڑھکر کامیابیاں سمیٹی ہیں .اور یہ سلسلہ آگے جاکر نا صرف جاری رہ سکتا ہے بلکہ دراز بھی ہوسکتا ہے . لیکن اس کے لیئے لازم ہے کہ عمران خان اور اسکی جماعت عوام سے کیئں گئے وعدوں کا لاج رکھتے ہوئے اسے وفا کرنے کی بھرپور کوشش کرے، مرکز میں میاں صاحب کے ساتھ غیر ضروری محاذ آرائی سے گریز کرے بلکہ اہم ملکی اور بین الاقوامی امور میں انکا ہاتھ بٹھائے، ملک میں جاری فوجی اپریشن اور ڈرون حملوں کے خاتمے کے لیئے بھرپور اور توانا آواز اٹھائے، لاپتہ افراد کا مسئلہ میاں صاحب کے ساتھ ملکر حل کرے. اس کے علاوہ کے پی کے میں ترقیاتی منصوبے شروع کرانے، لوڈ شیڈنگ اور مہنگائی جیسے اہم مسائل کو حل کرنے کے لیئے نواز شریف صاحب سے بھرپور تعاون لے اور ان کے ساتھ بھی بھرپور تعاون کرے . اگر خان صاحب ان مسائل کو حل کرنے میں کسی حد تک بھی کامیاب ہوگئے تو میں سمجھتا ہوں کہ آگے چل کر مزید کامیابیاں خان صاحب اور انکی پارٹی کے قدم چومنے کی منتظر ہونگے . انشاءاللہ.

.نواز شریف کا امتحان

عام انتخابات 2013 کے انعقاد سے پہلے مختلف حلقوں کی جانب سے یہ خیال ظاہر کیا جارہا تھا کہ اس بار کوئی بھی جماعت واضح اکثریت حاصل نہیں کر سکی گی .اور یہ کہ انتخابات کے نتیجے میں آنے والی مرکزی حکومت ایکً مخلوط حکومت ہوگی. مبصرین اس بات پر بہر حال متفق تھے کہ ان انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ ''ن؛؛ کو اگرچہ لیڈنگ پوزیشن حاصل ہوگی لیکن انکا یہ بھی خیال تھا کہ ن لیگ کی متوقع سیٹوں کی تعداد نوے کی آس پاس رہے گی،اور یوں وہ بیسا کھیوں کا سہارا لیئے بغیر حکومت بنانے کی قابل نہیں ہونگے . لیکن جب انتخابات کے بعد جو نتائج سامنے آئے تو وہ لگائے گئے اندازوں سے کافی مختلف تھے . نتائج کے مطابق مسلم لیگ ن مرکز میں بیسا کھیوں کے بغیر چلنے کی قابل ہوچکی تھی .جبکہ سابقہ حکمران ٹولہ بری طریقے سے شکست سے دوچار ہوچکا تھا. گو کہ سابقہ حکومتی اتحادیوں کی شکست یقینی تھی لیکن یہ بات بہر حال کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ صوبہ سندھ کے علاوہ باقی تینوں صوبوں یعنی پنجاب، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان میں '' بھٹو کی موت واقع ہوجائیگی ،، اور یہ کہ خیبر پختون خواہ سے عوامی نیشنل پارٹی ایسی غائب ہوجائیگی جیسے کہ گدھے کے سر سے سینگھ .اس کے علاوہ ایم. کیو.ایم کو کراچی میں اپنی '' مینڈیٹ؛؛ بچانے کے لیئے جو بھاگ دوڑ

کرنی پڑی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے. لیکن کیا یہ سب کچھ عوام نے محض جذبات میں آ کر نواز شریف کو بھاری مینڈیٹ سے نوازا، اور سابقہ اتحادیوں کو مسترد کر دیا؟ یا اس کے کچھ اور وجوہات بھی ہے. میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اہل وطن نے خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور یہ کہ انکو اس موقع کا بڑی شدت سے انتظار تھا. اور شائد یہی وجہ رہی کہ الیکشن 2013 میں جو ووٹر ٹرن آوٹ رہا. اتنا ٹرن آوٹ اس سے پہلے کسی بھی ایلکشن میں دیکھنے کو نہیں ملا. کیونکہ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ 2008 کے الیکشن میں عوام کے ووٹوں سے اقتدار میں آنے والی حکومت نے عوام کے جذبات اور خواہشات کو اس بے دردی سے کچلا کہ ماضی میں کہیں اسکی مثال نہیں ملتی. مثلا بات کی جائے اگر عوامی نیشنل پارٹی کی تو وہ 2008 کے الیکشن میں اس نعرے کے'' ساتھ. بر سر اقتدار آئے تھے کہ طالبان ہمارے پختون بیٹے ہیں جبکہ فوج بھی ہماری آپنی ہے لہذا بر سر اقتدار آ کر ہم خیبر پختون اس وقت کے صوبہ سرحد میں امن لائینگے اور فوجی اپریشن ختم کرا کر مذاکرات کا راستہ اپنائیں گے. لیکن پھر دنیا نے دیکھا کہ اے. این. پی تو بر سر اقتدار آئی لیکن عوام سے کیئے گئے وعدے دور کسی گڑھے میں دفن کر کے. اس کے بعد اے این پی نے جو حشر صوبہ کے. پی. کے کا کیا عوام اسے صدیوں نہیں بھلا پائیں گے. اے. این. پی نے سوات میں مذاکرات کا ڈرامہ رچا کر وہاں ایک بڑے فوجی اپریشن کا راہ ہموار کیا جس کے نتیجے میں اہل سوات کو بھاری مالی و جانی نقصان اٹھانا پڑا، وہاں کے لاکھوں عوام ہجرت کرنے پر

مجبور ہوئے۔ لاپتہ افراد کی فہرست میں خیبر پختون کے بندوبستی علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام بھی آنے لگے۔ عوامی لشکر بنا کر فساد کی نئی راہیں کھولی گئی۔ کرپشن اور لوٹ مار کی انتہا کردی گئی۔ بابا یعنی اسفندیار ولی خان صاحب یہاں کے عوام کو دھماکوں کی گونج اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں چھوڑ کر خود "یہاں؛؛ کے دیس میں ولایتی کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ نتیجتا عوام نے انکو بری طریقے سے مسترد کرتے ہوئے ان سے حق حکمرانی چھین لیا۔ اس کے ساتھ ہی بات کی جائے پاکستان پیپلز پارٹی کی جس نے اپنے دور حکومت میں عام کا مذاق اڑانے، اپنے اتحادیوں کو منانے اور امریکی کاسہ لیسی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ پیپلز پارٹی سابق صدر پرویز مشرف کو بینظیر بھٹو کا قاتل سمجھ رہے تھے لیکن اقتدار ملنے کے فوری بعد اسی مشرف کو پی پی پی حکومت نے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ کرپشن کی نئی نئی راستیں دریافت کی گئی جسکے بدولت پہلے پانی و بجلی کے وزارت پر۔ راجہ ان اور بعد کے وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف کو راجہ رینٹل کا خطاب ملا۔ عوام پی پی پی کے پورے دور حکومت میں مہنگائی کا رونا روتے رہے جبکہ پی پی پی کے وزیر اعظم انگلستان میں اپنے لیئے " سستے ترین " کوٹ جنکی قیمت فی کوٹ تقریبا اسی لاکھ روپے بنتی ہیں ؛؛ خریدتے رہے۔ ڈرون حملے جسکے خلاف پاکستانی پارلیمان دو دفعہ متفقہ قرارداد منظور کرچکی ہیں۔ پی پی پی کے پورے دور حکومت میں انکی مرضی کے مطابق تواتر

کے ساتھ ہوتے رہے، لیکن پی پی حکومت نے ان قراردادوں کو کوئی اہمیت ہی نہ دی. اس پورے دور حکومت میں ملک کے مختلف حصوں میں غیر ملکی جاسوس اور دہشت گرد دندناتے پھر رہے تھے لیکن سابقہ حکومت نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی . حتی کہ ریمنڈ ڈیوس جیسے دہشت گرد کو بھی باعزت چھوڑدیا گیا، سابقہ حکومت نے معاملات کو افہام و تفہیم سے حل کرنے کی بجائے فوجی اپریشن کا دائرہ کئی علاقوں تک بڑھاڈیا جس کے نتیجے میں وطن عزیز میں امن امان کی صورتحال مخدوش سے مخدوش تر ہوتی چلی گئی، عافیہ صدیقی منتظر رہی کہ پی پی پی کی حکومت انکی رہائی کے لیئے کچھ ناکچھ ضرور کریگی . لیکن پی پی کے حکومت نے کچھ نہیں کیا . ہندوستان کے سامنے غیر ضروری جھکاؤ کا مظاہرہ کیا گیا نتیجتا کشمیر اور دیگر مقبوضہ علاقوں کے بارے میں پاکستانی مؤقف کمزور تر ہوتا چلا گیا. لاپتہ افراد کا مسئلہ حل ہوا نا جامعۃ حفصہ اور لال مسجد کے متاثرین کو انصاف ملا. بجلی کے ساتھ عوام کو اب گیس کی لوڈشیڈنگ سے بھی آشنا کردیا گیا . پاکستان کے معاشی شہ رگ کراچی میں بھتے کی ''صنعت،، کو خوب ترقی دیا گیا اور بھتہ خوروں کو کھلی چھوٹ دی گئی .اس کے علاوہ اس سابقہ پی پی اور اس کے اتحادیوں کے دور حکومت میں ہزاروں افراد کو بے گناہ موت کا گھاٹ اتارا گیا لیکن افسوس اور صد افسوس کہ انصاف ان میں سے کسی کو بھی نہیں ملا .الغرض یہ سارے عوامل اکٹھے ہو کر پیپلزپارٹی اور اس کے اتحادیوں کے شکست کا باعث بنے .اور اس کالم میں تفصیلا اس کا ذکر اسی لیئے کیا گیا تاکہ نواز شریف

اور اسکی جماعت اگاہ ہو کہ پاکستانی عوام نے اپکو اس لیئے چنا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کام سابقہ حکومت اپنے نا اہلی کی وجہ سے نہیں کر سکی 'اور جسکا ذکر کسی حد تک اس کالم میں ہوچکا ہے ؛؛ وہ آپ سے کرنے کی امید رکھتے ہیں کیونکہ ان میں ایک بھی کام ایسا نہیں ہے کہ وہ نا ممکن ہو یا حد سے زیادہ مشکل . لہٰذا پاکستانی عوام نے تو اپنا حق ادا کردیا اور اپنے ووٹ کے ذریعے یہ بات ثابت کردیا کہ انکو امریکی غلامی، تصفیہ طلب مسائل حل کیئے بغیر ہندوستان سے دوستی، امریکی جیلوں میں عافیہ صدیقی اور دیگر قیدیوں کی مزید قید، کراچی میں مزید قتل و غارت گری ، مہنگائی اور ظالمانہ لوڈشیڈنگ کسی بھی صورت ممکن نہیں . لہٰذا ابھی یہ اپکا امتحان ہے کہ آپ ان بنیادی مسائل کو حل کرنے میں کس قدر دلچسپی لیتے ہیں .آخر میں اس شعر کے ساتھ کالم کا اختتام کرتا چلوں کہ.

یہ انتخاب نہیں امتحان ہے .

تیرے ضمیر، تیرے عقل تیری دانش کا .

.جب ماں اجڑتے اجڑتے بچی

بچے کی ولادت پر اہل گھرانہ کی خوشی دیدنی تھی۔ پیدائش کے موقع پر بچے کے والد نے اہل محلہ کے لئے دعوت عام کا اہتمام کیا۔ دن یوں ہی گزرتے گئے کہ ایک دن اغوا کاروں نے بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن بچے کے والد کی بروقت مداخلت کی وجہ سے اغواکار اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اگرچہ اس دوران والد کو شدید چوٹیں آئیں جس کی بناء پر وہ کئی دن ہسپتال میں زیر علاج رہا لیکن انہوں نے اپنے بیٹے کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا۔ دن ہفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے کہ کچھ ہی عرصے میں بچے کے والد کی دوستی علاقے کے منشیات فروشوں سے ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا اس کی تو زندگی کے معمولات ہی تبدیل ہو گئے۔ پہلے جہاں اس کا زیادہ تر وقت کام کاج اور اپنے گھر والوں کے ساتھ گزرتا تھا اب اس نے کام پر بھی جانا چھوڑ دیا اور گھر والوں کو بھی نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ انہی حرکات کی بناء پر اسے گھر اور خاندان والوں نے سمجھایا لیکن اسے کسی کی بات سمجھائی نہ دی۔ ایک دن اہل گھرانہ خاندان کے کسی تقریب میں گئے تھے کہ شام کو جب واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گھر میں موجود ریفریجریٹر غائب ہے۔ بچے کے والد سے جب معلوم کیا تو اس نے الٹا گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ شروع کی

کہ کیا ضرورت تھی تمہیں کسی کی تقریب میں جانے کی۔ نہ تم عیاشی کرتے (یعنی تقریب میں جاتے) اور نہ میرے محنت سے کمائے ہوئے چالیس ہزار کا فریج غائب ہوتا۔

گھر والے تو اسی وقت خاموش ہو گئے لیکن انہوں نے بعد میں جب چھان بین شروع کی تو پتہ چلا کہ وہ ریفریجریٹر تو بچے کے والد نے دوسرے علاقے کے ایک کباڑیہ کو پانچ ہزار روپے میں بیچ دیا ہے۔ جب اس بات کی خبر خاندان کے بزرگوں کو ہوئی تو انہوں نے رات کو گھر واپسی پر جب اس کو اس کے کیے ہوئے کرتوت کے بارے میں بتایا تو اس وقت اس نے بڑے ڈھٹائی کے ساتھ کہا کہ جب میرے پاس دارو کے لیے اور کچھ نہیں بچا تو تب جا کر میں نے فریج کو بیچ دیا۔ دارو کا نام سن کر اس کی بیگم نے تو رونا شروع کیا کہ ہائے سرتاج تمہیں کیا بیماری لاحق ہوئی ہے تم نے اتنا تکلیف کیوں اٹھایا اور ہمیں بتایا تک نہیں اللہ تمہیں لمبی زندگی دے۔ موقع پر موجود ایک رشتہ دار نے اس کی بیوی کو بمشکل چپ کرایا اور کہا کہ بھابھی جس دارو کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ دارو اور ہے۔۔۔ وہ دارو میڈیکل اسٹور پر نہیں ملتا بلکہ اس کی پڑیا منشیات کے اڈوں سے ملتی ہے۔ منشیات کے اڈے کا نام سنتے ہی خاندان کے بزرگ تو سکتے میں آ گئے۔ بزرگوں نے بچے کے والد کو بھی ہر لحاظ سے سمجھایا کہ بیٹا جس راستے پر تم چل پڑے ہو اس میں دنیا اور آخرت کے نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔ بہر

حال وقت گزرتا گیا اور وہ شخص اپنے گھر والوں اور اپنے اس لاڈلے بچے سے بھی لاپرواہ ہو گیا حالانکہ بچہ ابھی کافی بڑا اور سمجھدار ہو چکا تھا۔

ایک دن اچانک بچے کا والد گھر آیا اور کہا کہ بیٹے جلدی سے تیار ہو جاؤ تمہیں سیر کے لئے لے کر جانا ہے۔ بچے کی ماں نے منع کیا لیکن وہ زبردستی بچے کو ساتھ لے گیا۔ بچے کے جانے کے بعد ماں کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی اور اس نے فوری طور پر اپنے بھائی کو تمام تر صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ بھائی نے فوراً بہنوئی کا پیچھا کیا اور بس ٹرمینل تک جا پہنچا۔ وہاں اس کا بہنوئی اپنے بیٹے سمیت قریبی شہر جانے والی گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ انہوں نے انتہائی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہنوئی کو موقع پر پکڑنے کی بجائے اس شہر میں موجود اپنے ایک دوست کو فون کیا اور اسے تمام تر صورتحال سے آگاہ کرنے کے بعد اسے گاڑی نمبر لکھوا دیا اور بچے اور اس کے والد کا حلیہ بتا دیا اور خود دوسری دستیاب گاڑی سے شہر روانہ ہوا۔ بچے کے ماموں نے جس وقت اپنے دوست کو اس تمام صورتحال سے آگاہ کیا تو اس کے دوست نے اسی وقت سے گاڑی کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ گاڑی جب شہر پہنچی تو پہلے سے بیٹھے ہوئے دوست نے بچے اور اس کے والد کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی اور انہوں نے مناسب فاصلے سے ان کا پیچھا کیا۔

تھوڑی ہی دور جانے کے بعد پیچھا کرنے والے دوست کو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب بچے کا والد اپنی حیثیت سے بڑھ کر ایک اعلیٰ پائے کے نہایت مہنگے ہوٹل میں داخل ہوا۔ انھوں نے فوراً پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس کے پہنچنے پر موبائل کے انچارج نے دو سادہ لباس میں ملبوس اہلکاروں کو ہوٹل کے قریب کھڑا کر دیا اور خود موبائل سمیت کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب بچے کا والد ہوٹل سے باہر آیا تو بچہ اس کے ساتھ نہ تھا البتہ ایک چھوٹی سی پوٹلی اس کے ہاتھ میں دکھائی دی۔ موقع پر پہلے سے موجود دوست نے سادہ وردی میں ملبوس پولیس کے جوانوں کو اشارے سے بتا دیا کہ آدمی یہی ہے۔ ان میں سے ایک جوان نے فوراً وائرلیس کے ذریعے موبائل پولیس کو اطلاع دی اور بندے کا حلیہ بھی بتا دیا۔ بچے کا والد جیسے ہی ہوٹل سے کچھ دور ہو گیا تو اچانک پولیس والوں نے اسے دھر لیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے قریبی زیر تعمیر مکان میں لے گئے وہاں ایک اہلکار کو ان پر مامور کر کے موبائل پولیس اب ہوٹل کے قریب آ گئی ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ دو ہٹے کٹے آدمی بچے کو ساتھ لیے ایک بلیک کلر پراڈو گاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی وہ دروازہ کھول ہی رہے تھے کہ اچانک آواز آئی "ہینڈز اپ" دونوں جب تک مزاحمت کی کوشش کرتے پولیس ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا چکی تھی۔

،پولیس جب انہیں تھانے لائی تو ان کے قبضے سے دو پستول، غیر ملکی کرنسی

جعلی شناختی کارڈ اور کافی تعداد میں ہیروئن کی پڑیا برآمد ہوئی جبکہ بچے کے والد سے جو پوٹلی برآمد ہوئی تھی اس میں پچاس ہزار روپے اور پانچ ہیروئن کی پڑیا موجود تھیں۔ تھانے کے ایس ایچ او نے جب تفتیش شروع کی تو وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں تھے تو ایس ایچ او نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ باری باری ان تینوں کی چھترول کرو۔ بچے کا والد تو پانچ منٹ میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوا البتہ وہ دو آدمی کافی ڈھیٹ ثابت ہوئے ان سے راز اگلوانے میں سپاہیوں کو تقریباً ایک گھنٹہ لگا۔ اسی اثناء میں بچے کا ماموں بھی تھانے میں پہنچ گیا، چھترول مکمل کرنے کے بعد تینوں نے ایس ایچ او کو جو حقائق بتائے وہ کچھ یوں ہیں:

بچے کے والد کی دوستی جب منشیات فروشوں سے ہوگئی تو کچھ ہی عرصہ گزر جانے کے بعد وہ خود بھی اس لت میں مبتلا ہوگیا۔ جمع پونجی ختم ہونے کے بعد اس نے پڑیا کی خاطر گھر کا سامان حتیٰ کہ ریفریجریٹر تک بیچ ڈالا۔ جب گھر میں بھی سب کچھ ختم ہوا تو انہوں نے اس صورتحال سے اپنے منشیات فروش دوستوں کو آگاہ کیا ایک دو دن تک تو وہ اسے مفت میں مال دیتے رہے لیکن پھر صاف انکار کر دیا۔ جس سے بچے کا والد بہت پریشان ہوگیا۔ ایک دو دن گزارا کرنے کے بعد وہ دوبارہ اڈے پر اپنے دوستوں سے ملنے گیا تو انہوں نے تعاون سے تو بالکل ہی انکار کر دیا البتہ یہ مشورہ دیا کہ تم اپنا بیٹا بیچو، پہلے پہل تو یہ

تیار نہ ہوا لیکن جب انہوں نے کہا کہ بچے کے بدلے میں تمہیں پچاس ہزار روپے اور پانچ پیکٹ ملیں گے تو فوراً راضی ہو گیا۔ جب یہ راضی ہو گیا تو انہوں نے انسانی اسمگلنگ کے بین الاقوامی گروہ کے مقامی کارندوں سے پانچ لاکھ روپے کا سودا کیا۔ جن میں سے ساڑھے چار لاکھ منشیات فروشوں نے لے لیے جبکہ پچاس ہزار کے بارے میں پارٹی کو بتادیا کہ مال لیتے وقت بچے کے والد کو دے دینا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ کہ والد جب بچے کو ہوٹل میں لے کر گیا تو وہاں پر پہلے سے موجود انسانی اسمگلروں کو بچے کے سامنے اپنا دوست ظاہر کیا اور بچے سے کہا کہ میں قریبی کلینک جارہا ہوں تم تھوڑی دیر میں انکل کے ساتھ ان کی گاڑی میں وہاں آجانا۔ یہی تو وجہ تھی کہ بچہ ان دو آدمیوں کے ساتھ خوشی خوشی ہوٹل سے گاڑی کی طرف جارہا تھا کیونکہ اسے حقیقت حال معلوم نہ تھی۔

تمام تر حقائق سے باخبر ہونے کے بعد ایس ایچ او نے فوری طور پر اپنے اعلیٰ حکام کو اس کیس کے بارے میں اطلاع دی کیونکہ یہ ایک ہائی لیول کیس بنتا نظر آرہا تھا۔ اعلیٰ حکام کو اطلاع دینے کے بعد منشیات فروشوں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ بحرحال یہ تو اللہ نے کرم کیا کہ بچے کی ماں کے دماغ نے بروقت کام کیا۔ ورنہ بچہ تو ان سے بچھڑ ہی چکا تھا۔

معاشرہ اسی صورت بہتری کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ جب اس کی تمام اکائیاں تہذیب کے دائرے میں رہے۔ بظاہر کوئی برائی چھوٹی ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے اثرات ماحول پر بڑے گہرے نقوش مرتب کرتے ہیں۔ یہ کہانی ہمیں یہ پیغام دے رہی ہے کہ نشہ معاشرے کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

زلزلہ متاثرین اور علیحدگی پسندوں کے کرتوت

یقین جانیئے کہ اس وقت میں دوہرے تکلیف میں مبتلا ہوں ۔اور سمجھ میں نہیں آرہا کہ کن الفاظ میں اپنا دکھ بیان کروں۔ میرا پہلا دکھ تو بلوچستان میں آنے والے تباہ کن اور شدید زلزلے کے حوالے سے ہے جن میں اب تک میرے سینکڑوں ہم وطن جاں بحق ، ہزاروں زخمی جبکہ لاکھوں بے گھر ہو چکے ہیں۔

میرے وہ ہم وطن جو جاں بحق ہو چکے ہیں ،انکی یاد تو بہت آتی ہے جسکی وجہ سے میں بہت اداس اور غمگین ہوں ۔ لیکن پھر بھی میں اس لحاظ سے خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ کم از کم میں انہیں دعا میں یاد تو کر سکتا ہوں۔ لیکن آفسوس اور صد آفسوس کہ میں اپنے ان بہنوں، بھائیوں اور بزرگوں کے لیئے بحیثیت ایک پاکستانی کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔جی ہاں ! میڈیا میں آنے والی رپورٹوں کے مطابق بحیثیت پاکستانی ہم اپنے ان بے کس و مجبور ہم وطنوں کے احوال تک دریافت نہیں کر سکتے اور یہی میرا دوسرا اور سب سے بڑا دکھ بھی ہے۔ کیونکہ اب تک موسول ہونے والی خبروں اور رپورٹوں سے یہی تلخ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ اگر کسی نے ان مظلوم و مجبور پاکستانی بہن بھائیوں کی داد رسی کرنی ہے تو اسے

سب سے پہلے اپنے پاکستانی شناخت سے دستبردار ہونا پڑے گا. بصورت دیگر کوئی بھی ایسا شخص " عسکریت پسندوں،، کا پسندیدہ شکار بن سکتا ہے.

محترم قارئین کو یاد ہوگا کہ زلزلے کے فورا بعد علیحدگی پسند عناصر نے یہ دھمکی دی تھی کہ پاکستان سرکار کو زلزلہ متاثرہ علاقوں میں کام نہیں کرنے دیا جائیگا. اپنے اس دھمکی کو حقیقت کا روپ دھارنے کے لیئے یہ عناصر امدادی اپریشن مین مصروف پاک فوج کے ہیلی کاپٹروں پر دو دفعہ فائرنگ کر چکے ہیں جبکہ ایف. سی پر تباہ کن حملے اور امدادی قافلوں کو لوٹ لینا اس کے علاوہ ہیں.

مندرجہ بالا تمام واقعات اپنی جگہ لیکن سب سے آفسوس ناک خبر جو کہ پاکستان کے ایک صف اول کے اخبار نے شائع کی ہے یہ ہے کہ متاثرہ علاقوں تک امدادی سامان پہنچانے والے پاکستانی فلاحی اداروں کو اپنی گاڑیوں پر سے لفظ پاکستان مٹانا پڑ رہا ہے. کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو علیحدگی پسند ان کو اگلے جہان میں پہنچانے کے لیئے بالکل تیار تھے، لہذا اپنے مظلوم ہم وطنوں کی زندگیاں بچانے کی خاطر انہیں یہ تلخ گھونٹ پینا پڑ رہا ہے.

میں نے جب یہ خبر پڑھی تو میرا ذہن اکتوبر 2005 میں چلا گیا. اس وقت جب

کشمیر، ہزارہ اور دیگر شمالی علاقات جات میں تباہ کن زلزلہ آیا تھا تو اس وقت نہ تو کسی نے کسی کو کوئی دھمکی دی تھی اور نا ہی کسی پر کوئی حملہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس وقت قبائلی علاقے وزیرستان میں فوجی اپریشن شروع ہوچکا تھا، لیکن وہاں کے عسکریت پسندوں نے نہ صرف کراچی تا خیبر پھیلے ہوئے دو ہزار کلومیٹر لمبے روٹ پر چلنے والی امدادی قافلوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی چھیڑ خانی نہین کی بلکہ مصیبت کے اس گھڑی میں اپنے ہم وطنوں کے لیئے بھاری تعداد میں امدادی سامان بھی روانہ کردیا تھا باوجود اس کے کہ وہ خود بھی اس وقت شدید مشکلات سے دوچار تھے۔ اس کے علاوہ، ایک اور خاص بات جو اسوقت سامنے ائی تھی وہ یہ کہ جب 2005 مین زلزلہ ہوا تو بین الاقوامی امدادی ادارے بھی بڑی تعداد میں ان علاقوں میں آکر مصروف عمل ہوئی۔ ان اداروں میں کچھ تو واقعی ایسے تھے جنکا کام صرف متاثرین کو امداد پہنچانا اور ان کا علاج و معالجہ کرنا تھا۔ لیکن بیشتر این۔جی۔اوز ایسی تھی کہ جن کا کام صرف عیسائیت پھیلانا اور وطن عزیز کی جاسوسی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور یہ سب حقائق اس وقت اور اس کے فوری بعد میڈیا کی زینت بن چکی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسا کوئی قابل ذکر واقع کہیں رپورٹ نہیں ہوا کہ کسی جگہ ایسی تنظیمون سے وابسہ افراد پر کسی نے کوئی حملہ کیا ہو۔ حالانکہ انہی دنوں ان علاقوں میں وہ اسلامی فلاحی تنظیمیں امدای کاموں میں م،صروف عمل تھی جنہیں مغرب ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتا چلا آرہا ہے۔ اور جن میں بعض پر حکومت وقت اہل مضرب کے کہنے پر

پابندیاں عائد کی جبکی بعض کی کھڑی نگرانی کی گئ.ان تنظیموں میں الخدمت فاؤنڈیشن،جماعت الدعوۃ اور الرشید ٹرسٹ نمایاں رہی.اگر یہ تنظیمیں چاہتی تو عوامی قوت کے زور پر ان جاسوس اور عیسائیت کی پرچار کرنے والی تنظیموں کا ناطقہ بند کر سکتے تھے .لیکن انہوں نے قانون کو ہاتھ میں لینا پسند نا کیا. بلکہ انہون نے اپنی تمام تر توجہ متاثرین کو زیادہ سے زیادہ ریلیف پہنچانے اور انکی دینی اور اخلاقی تربیت کرنے میں صرف کی. نتیجتا عوام کا دینی شعور بیدار ہوا،اور لادین قوتیں وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہوئی.

ماضی کو کریدنے کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ آج پھر اہل وطن آزمائش سے دوچار ہے اور بعض قوتیں بجائے ان سے ہمدردی کرنے کی ان کے اپنے ہی ہم وطنوں کو ان سے دور رکھنے کی مذموم کوششوں میں مصروف ہے.لہٰذا میں اس کالم کے ذریعے ان قوتوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ یہ مصی بت کی گھڑی ہے.اور مصیبت کے اس گھڑی میں انسانیت کا تقاضہ تو یہی ہے کہ آپ لوگ انسانیت پر رحم بھی کرے اور خود انسانیت کا مظاہرہ بھی. کیونکہ اپکے اس ظالمانہ روش سے ایک بڑا انسانی بہران جنم لے سکتا ہے. اور اس کا فائدہ وہ غیر ملکی قوتیں اٹھائیں گے جو اس سے پہلے وطن عزیز میں عیسائیت کو پروان چڑھانے کی کوشش کر چکے ہیں .لہٰذا اپ لوگون کو چاہیئے کہ آپ حکومت پاکستان اور دیگر پاکستانی امدادی اداروں کے راستے میں روڑے نہ اٹکائیں .جہاں تک بات ہے اپکی مطالبات کا تو

اگر وطن عزیز کے نظریاتی اور جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی شکایت یا شکایات ہے .تو وہ سر آنکھوں پر، اور پوری قوم ان مطالبات کے پورے ہونے تک اپکے شانہ بشانہ کھڑی ہوگی .لیکن اگر آپکا منشور صرف اور صرف پاکستان کو توڑنا ہے ،تو پھر یہ پاکستان کے مسلح افواج کا فرض ہے کہ وہ ایسے کیسی بھی سازش کو پوری قوت سے کچل دے اور اس کام میں پوری قوم اپنے افواج کے پشت پر ہوگی.

آخر میں میڈیا بالخصوص الیکٹرونک میڈیا سے یہ گذارش ہے کہ وطن عزیز کے ہر محروم فرد باالخصوص زلزلہ متاثرین کے لیئے آواز ضرور اٹھائیں .کیونکہ حقوق سے محروم عوام کے لیئے آواز اٹھا ہم سب کی ذمہ داری ہے .لیکن اگر کوئی شخص یا گروہ جو لفظ پاکستان کو بھی سننا گوارہ نہیں کرتے،اور علیحدگی سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوتے تو پھر خدارا اسے بے نقاب کیجیئے .اور اس کے ہمدرد نا بنیئں .بلکہ ہمدرد بنیئں ان زلزلہ متاثرین کا کہ جنہیں اپنے پیاروں کو کفن پہنانا اور قبر میں اتارنا بھی نصیب نہ ہو سکا،اور جو خود بھی کھلے آسمان تلے اللہ پاک کے نصرت اور اپنے ہم وطنوں کے محبتوں کے منتظر ہیں.اور ہمدرد بنیئں انکا جو بہرحال اپنے متاثرہ بھائیوں تک پہنچنا چاہتے ہیں بہر صورت.

عافیہ سے ملالہ تک۔ آئینے کا دوسرا رخ

ملالہ یوسفزئی کو شہرت اور مال و دولت ملنے پر مبارک باد ۔اور ان کو اس مقام تک پہنچانے والے اہل مغرب اور پاکستان کے چند بڑے میڈیا گروپس کا شکریہ ! مبارک باد اور شکریہ اس لیئے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ ملالہ کو ملنے والی شہرت کی وجہ سے میں حسد میں مبتلا ہوچکا ہوں ،یا پھر میں اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی کنجوسی کر رہا ہوں ۔ لیکن ایک بات جس کو میں ہضم نہیں کر پارہا اور جو کافی دنوں سے ذہن میں کھٹک رہا ہے وہ یہ کہ ۔ملالہ کو جن اعزازات سے نوازا جارہا ہے اس کے بارے میں ہر دفعہ یہ بات لازمی دہرائی جاتی ہے کہ، یہ سب تعلیم کے لیئے خدمات انجام دینے کی وجہ سے ہے ۔جس دن سے میں نے یہ سنا کہ ملالہ نے تعلیم کے لیئے کافی کام کیا ۔اور آگے چل کر مزید کام کرنے کا انکا ارادہ ہے ۔تو میں نے ان کے اس کارناموں سے مستفید ہونے کا فیصلہ کیا ۔لیکن مجھے اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ملالہ نے تعلیم کے لیئے نہ تو پہلے کوئی قدم اٹھایا ۔اور تا حال ایسے کچھ آثار نظر آرہے ہیں ۔جب تعلیم کے میدان میں مجھے "مس ملالہ ،، کا کوئی کارنامہ نظر نہیں آیا تو میں نے سوچا کہ شائد اہل مغرب کو معلوم نہ ہو اور وہ ماضی میں ''برطانوی نشریاتی ادارے کو پشاور میں موجود ان کے

اپنے ہی نمائندے کی طرف سے گل مکئ کے فرضی نام سے بیجھی جانی والی طالبان مخالف ڈائریوں کو جو بعد میں انہوں نے اپنے دوست اور ملالہ یوسفزئی کے والد ضیاء الدین یوسفزئی سے مشاورت کرنے کے بعد ملالہ کے نام سے منسوب کیئں تھے ،، کو اب تک ملالہ ہی کا کارنامہ تصور کرتے ہو. اور اسکی وجہ سے انکو اتنی عزت دی جارہی ہو . میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی کہ پاگل مت بنو . مغرب کو سب معلوم ہے کہ کہ ملالہ کی جھولی کسی بھی کارنامے سے خالی ہے . لیکن وہ اس کے باوجود بھی اس پر سرمایہ کاری کر رہے ہیں . لیکن آخر کیوں ؟ کیونکہ اس کے پیچھے ان کے چند اہم اور بڑے مقاصد ہے . مثلا: 1 .ملالہ یوسفزئی کی روشن خیالی اور تہذیب و تمدن سے آزادی کو سامنے لاکر پاکستانیوں بالخصوص پختون معاشرے کے ذہنوں سے اس ملالہ کے تصور کو کھرچ ڈالنا جس نے افغان سرزمیں پر غیروں کو للکار کر رہتی دنیا تک لوگوں کو غیرت و حمیت کا ایک زبردست سبق دیا . 2. پہلے ملالہ کو اور پھر ان کے دیگر دو سہیلیوں شازیہ اور کائنات کو تعلیم کے نام پر باہر لے جاکر اس خطے کے بچیوں کو یہ پیغام دینا کہ آگر آپ اپنی ثقافت و روایات کو جوتے کی نوک پر رکھ ٹھوکر مارو . تو ہم تمھیں بھی ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیئے تیار ہے. 3 .ملالہ کو اتنا ہائی لائٹ کرنا کہ پاکستانی لوگ اپنی معصوم اور بے گناہ بہن و بیٹی عافیہ صدیقی کو بھول جائے .

مندرجہ بالا حقائق تو بس صرف چند ایک ہے . ورنہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی دیگر چشم کشاء و روح فرسا حقائق بھی سامنے آ جاینگے . تب لوگوں پر یہ بات مزید واضح ہو جائیگی کہ . نہ تو ملالہ یوسفزئی تعلیم کی علم بردار تھی اور نا ہی مغرب تعلیم کے میدان میں پاکستان کا خیر خواہ۔ اگر کسی کو میری ان باتوں سے شک اور سازش کی بو آتی ہو تو بطور ثبوت یہ ایک حقیقت ان کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں . اللہ پاک سے امید ہے کہ پڑھنے والے مطمئن ہو جائینگے .

کراچی میں عافیہ نام کی ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے . چونکہ گھر والے پکے اسلامی ذہن رکھتے ہیں اس لیئے دل پہ بوجھ نہ ماتھے پہ کوئی شکن . بلکہ اسے اللہ کی رحمت سمجھ کر ان کے تربیت میں لگ جاتے ہیں . جب سکول میں داخلے کی عمر ہو جاتی تو گھر والے اسے سکول میں داخل کر دیتے ہیں . وقت تیزی سے گزر رہا ہوتا ہے ، اور بچی کا ذہن اس سے بھی زیادہ تیزی سے ترقی کر رہا ہوتا ہے . اساتذہ حیران بھی اور مسرور بھی کہ بچی عافیہ ہر سال ٹاپ پوزیشن پر آتی ہے۔ پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے امریکہ میں فل اسکالر شپ مل جاتا ہے ، وہاں جانے کے بعد ذرا غور کیجیئے کہ عموما کیا ہوتا ہے امریکہ جیسے آزاد خیال میں جانے کے بعد . یہی نا . کہ جانے والا ان کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور اپنے قدروں سے نا آشنا ہو جاتا ہے . لیکن عافیہ کے ساتھ کیا ہوتا ہے ؟

عافیہ جب

امریکہ چلی جاتی ہے تو مذہب کو کمبل کی طرح تہ کرکے الماری میں رکھ نہیں دیتی بلکہ وہ مذہب کو اپنا اوڑھنا، اور بچھونا بنا دیتی تھے۔ وہ نہ صرف خود پابندی سے دین اسلام پر عمل پیرا ہوتی ہے، بلکہ دوسروں کو بھی احکام الہی پہنچانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔ وہ نا صرف اسلام کا پیغام زبانی پہنچارہی ہوتی ہے بلکہ وہ عملا اس کا نمونہ بھی پیش کرہی ہوتی ہے، مثلا۔ وہ اگر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ تو وہی اولڈز ہومز جا کر بے یارو مددگار امریکی شہریوں کا مدد کرنا بھی باعث سعادت سمجھتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوران تعلیم وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کئی ایوارڈ جیت جاتی ہے۔ اور اخر میں جب اعلی تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ مکمل ہوجاتا ہے۔ تو امریکی حکومت ان کو یہ آفر کردیتی ہے کہ ہم آپ کی خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ لہذا فیملی سیمت آپکو امریکی شہریت دیتے ہیں۔
لیکن سامنے سے عافیہ کا جواب کیا ہوتا ہے؟ عافیہ انکو کہتی ہے کہ آپ کے تمام آفرز کا شکریہ۔ لیکن میں نے آپنی تمام تر خدمات اپنے ملک پاکستان کے لیئے وقف کر رکھی ہے۔ یہ کہ کر عافیہ پاکستان واپس آتی ہے۔ معلوم ہے کونسے پاکستان؟ اسی پاکستان جہاں سے ملالہ جیسی لڑکیاں نکل جانا باعث فخر سمجھتی ہے۔
بہر حال عافیہ پاکستان آنے کے بعد یہاں کے بچوں اور بچیوں کو اعلی، بہتر

اور کاآمد تعلیم دینے کی منصوبے پر کام شروع کر دیتی ہے .ادھر امریکہ غور سے یہ سب دیکھ رہا ہوتا ہے اور سوچتا ہے . کہ اگر عافیہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوئی تو پھر تو مسلمان ایک بار پھر عروج پر پہنچ جائینگے .اور صلیبیوں کا غرور خاک میں مل جائیگا . لہٰذا انہوں نے فورا سے پیشتر اپنے ساتھ پاکستانی ایجنسیوں کے کچھ ناعاقبت اندیش اہلکاروں کو ملاکر ملت کی بیٹی عافیہ صدیقی کو تین معصوم بچوں سمیت کراچی سے اغوا کرلیا .

اغواکے بعد عافیہ کے ساتھ کیا کچھ ہوا .اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور آگے چل کر بہت کچھ لکھا جائیگا . فی الحال میرا اپنے مسلمان بھائیوں بالخصوص پاکستانی بھائیوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ جو آج ہمیں بے وقوف بناکر اور تعلیم کی آڑ لے کر ملالہ کو ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں . ان کو کبھی تعلیم کی اصل پاسبان عافیہ صدیقی کا خیال بھی آیگا یا نہیں ؟ لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ آپ یورپ اور امریکہ کا منافقانہ چہرہ بے نقاب کیجیئے اور پورے ایمانداری سے فیصلہ کیجیے کہ تعلیمی انقلاب کس کا مشن ہے عافیہ صدیقی کا یا ملالہ یوسفزئی کا ؟

ڈرون حملے - نواز لیگ کا امتحان

ایک دہائی ہونے کو ہے کہ مظلوم اور لاچار پاکستانیوں پر ڈرون حملے جاری ہے. جن میں اب تک ہزاروں بے گناہ افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں. جبکہ ہزاروں زندگی بھر کے لیئے معزور بھی ہو چکے ہیں. لیکن آفسوس کہ حکمرانوں کی بذدلانہ اور منافقانہ رویوں اور پالیسیوں کی وجہ سے ایک ایٹمی طاقت ہوکے بھی ہم اہل پاکستان خود کو نہایت بے کس اور مجبور پاتے ہیں. اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ 2004 سے لے کر اب تک جتنے بھی ڈرون حملے ہو چکے ہیں. ان میں ہمیشہ بے گناہ افراد ہی نشانہ بنے ہیں. بلکہ نہ صرف بے گناہ بلکہ اسلام اور پاکستان دوست افراد ہی نشانہ بنے ہیں. لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ہم نے یہ ظالمانہ حملے روکنے کی بجائے ہمیشہ حملے کرنے کے لیئے امریکہ کو شہ دی ہے. گو کہ ہمارے حکمران ہمیشہ سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم ان حملوں کے خلاف ہے. کیونکہ یہ ہماری خود مختاری کے خلاف ہے. لیکن اب انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹر نیشنل نے واشنگٹن میں پریس کانفرنس کرکے جن حقائق کو سامنے لایا. اس کے مطابق اسٹریلیا، جرمنی اور برطانیہ کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی ان ممالک میں شامل ہے. جو غیر قانونی ڈرون حملوں میں امریکہ کے ساتھ غیر قانونی طور پر تعاون کر رہے ہیں. ایمنسٹی انٹر نیشنل کا کہنا ہے کہ ڈرون

حملے جنگی جرائم کے زمرے میں آتے ہیں ۔اور یہ کارروائیاں عالمی قوانین اور انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ایمنسٹی انٹرنیشنل کے پاکستان پر محقق مصطفیٰ قادری کا مزید کہنا تھا کہ 'ڈرون حملوں کے ارد گرد رازداری کے پردے میں امریکی انتظامیہ کو عدالتوں اور عالمی قوانین کے دائرہ کار سے آزاد کرکے قتل کرنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔اب وقت آگیا ہے کہ امریکہ اپنے ڈرون پروگرام کے بارے میں حقائق سامنے لائے اور ان لوگوں کو جو اس کے ذمہ دار ہیں سزا دے'۔

انھوں نے مزید کہا 'ڈرون حملوں کے متاثرین کی داد رسی کی امید تو دور کی بات امریکہ بعض حملوں کے بارے میں ذمہ داری ہی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔اس موقع پر انہوں نے بعض حملوں کی تفصیل بھی بیان کی ، کہ کس طرح ایک 68 سالہ معمر خاتون کھیتوں کام کرتی ہوئی امریکی ڈرون حملے میں شہید ہوئی ،اور قریب یہ موجود ان کے پوتے اور پوتیاں شدید زخمی ہوئی ۔جن میں بعض کے علاج کے لیئے ان کے اہل خانہ کو اپنی زمینیں اونے پونے داموں بیچنی پڑی ۔ایمنسٹی انٹرنیشل اور ہیومن واچ کے اس مشترکہ پریس کانفرنس میں یہ بھی بتایا گیا کہ کس طرح امریکی درندوں نے تعلیم کا دیا جلانے والی لڑکیوں کے سکول کو ڈرون اٹیک کا نشانہ بنایا اور ان معصوم کلیوں کو مسل ڈالا ۔اس کے علاوہ تھکے ہارے مزدوروں کو ، جنازوں ، بازاروں کو ،زخمیوں کو اٹھانے والوں کو اور اپنے

روزمرہ کے کاموں مصروف قبائلیوں کو ڈرون حملوں سے نشانہ بنانا امریکیوں کے وہ مظالم ہیں. جو کسی بھی طور قابل معافی نہیں .اور جس نے پہلے اقوام متحدہ اور اب ہیومن رائٹس اور ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسے تنظیموں کو چیخنے پر مجبور کردیا .

یہاں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ ان حملوں کی تباہ کاریاں یقینا ان عالمی تنظیموں کے بتائے ہوئے اعداد وشمار سے کہیں زیادہ ہونگے .لیکن بہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ ان مظالم کو جن عالمی تنظیموں نے اجاگر کیا ہے،انکے نام اور اچھی ساکھ پوری دنیا میں مشہور اور موجود ہے .اس لیئے ان کے بیان کئیں گئے حقائق کو امریکہ سمیت کسی کے لیئے بھی جھٹلانا شائد اتنا اسان نہ ہو. لہذا اب حال ہی میں بھاری ووٹوں سے منتخب ہونے والی نواز حکومت کا اصل امتحان شروع ہوچکا ہے.اور ان کے سامنے اب صرف دو ہی راستے ہیں کہ تو وہ ماضی کی حکومتوں کی طرح ڈرون حملوں کی حامی رہے .یا پھر اپنے انتخابی منشور کے مطابق ڈرون حملوں کے مخالف .

پس اگر نواز حکومت ڈرون حملوں کی حامی ہے،تو پھر تو یقینا وہ" ہاتھی کے دانت کھانے کی اور،دکھانے کی اور،، والی پالیسی ہی جاری رکھیں گے .لیکن اگر وہ یعنی نواز لیگ چاہتی ہے کہ ڈرون حملے بند ہو،تو پھر اسے یہ موقع

ہاتھ سے جانے نہیں دیانا چاہیئے. بلکہ ان رپورٹس کو بنیاد بناتے ہوئے عالمی ضمیر پر دستک دینا چاہیئے. اور اقوامتحدہ کو بھی ان کے بھولے ہوئے کام یاد دلانے چاہیئے. اس کے ساتھ ساتھ او. آئی. سی کے نیم مردہ جان کو کومے سے نکالنے کی کوشش کرکے اور دوست ممالک کو اعتماد میں لے کر امریکہ کے آگے ایک سرخ لکیر کھینچ دینا چاہیئے. لیکن اگر اسکے باوجود امریکہ باز نہیں آتا تو پھر یہ شاہین، یہ غوری، یہ غزنوی جس مقصد کے لیئے بنائے گئے ہیں، انہیں اس مقصد کے لیئے استعمال بھی کرنا چاہیئے. جہاں تک بات ہے پاکستانی معاشی صورتحال کا تو ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پچھلے بارہ برسوں میں امریکہ نے کھڑی شرائط کے ساتھ ہمیں پندرہ ارب ڈالر کا امداد دیا ہے. جس کا بیشتر حصہ پاکستان میں انہی کے منصوبوں پر سرف ہوا ہے. جبکہ اس کے مقابلے میں ہم نے معاشی میدان میں جو نقصان اٹھایا ہے. وہ ہے. ایک سو دو ارب ڈالر. جبکہ دیگر نقصانات اس کے علاوہ ہے. لہٰذا اب نواز حکومت کڑہ امتحان میں ہے. اور ہماری دعا ہے کہ وہ اس اہم پرچے کو اچھے نمبروں سے پاس کرنے میں کامیاب ہوجائے.

.اور اب جماعۃالدعوۃ

وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے امریکی دورے سے واپسی پر ناکامیوں کا جو طویل فہرست ساتھ لایا ہے ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ..امریکہ خواہش رکھتا ہے کہ پاکستان فلاحی و رفاحی خدمات انجام دینے والے ادارے جماعۃالدعوہ پر پابندی لگائے.. گوکہ پاکستان واپسی کے بعد مشیر برائے خارجہ امور مسٹر سرتاج عزیز نے ارشاد فرمایا ہے کہ جماعۃالدعوۃ یا ان کے مرکزی امیر حافظ محمد سعید کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود نہیں اس لیئے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے گویا جس دن دفتر خارجہ کو کہیں سے بھی کوئی ثبوت ہاتھ لگے . سمجھ لیجیئے اس دن جماعۃالدعوۃ پر پابندی لگ جائی گی ،اور ان کے امیر کو پابند سلاسل کر دیا جائیگا. جہاں تک ثبوت ملنے کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ثبوت تو امریکہ نے وزیر اعظم صاحب کو دے دیئں ہونگے .اور یہ چند ایک ثبوت نہیں ہونگے بلکہ میں یقین سے کہ سکتا ہوں کہ .ابامہ نے من موہن سے ثبوتوں سے بھرے کئی سوٹ کیس لے کر میاں صاحب کو دیئں ہونگے. کیونکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ " جماعت الدعۃ اور ان کے امیر کے "جرائم،، کا فہرست خاصا لمبا ہے. اور پاکستان میں اس سے پہلے بھی جو ان جرائم کا مرتکب ہوئے ہیں .پاکستان نے عالمی برادری سے ملکر ایسے اداروں اور ان کے

سرپرستوں کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لہٰذا مشیر خارجہ کی وضاحت اپنی جگہ ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جلد یا بدیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان پر پابندی لگ جائیگی ۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیشہ کی طرح پاکستانی عوام ایسی کسی بھی کوشش کو مسترد کردینگے۔ لیکن بات پھر وہی آجائیگی کہ بے چاری عوام کو کیا پتہ کہ عالمی برادری کے ساتھ چلنے کی اپنے کچھ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں ۔اوران اصولون کی تعمیل کے لیے اگر کبھی کبھار اپنوں گلے پر چھری پھیرنا پڑ جائے تو اس میں کوئی آفسوس کی بات نہیں ۔کیونکہ 11/9 کے بعد پاکستان کو جو ایک "ذمہ دار ریاست،،کا درجہ ملاہے ۔اس ذمہ داری کو تو بہر حال احسن طریق،، سے نبھانا پڑے گا"

یہاں ممکن ہے کہ خلق خدا کے ذہنوں میں یہ بات آرہی ہو کہ اخر وہ کونسے جرائم ہے کہ جسکا ذکر میں اوپر کرچکا ۔یا جسکی بنا پر میں ان خدشات کا شکار ہوں کہ ۔ ۔جماعۃ الدعوۃ پر پابندی لگ جائیگی ؟ میں سمجتا ہوں کہ جواب دینے کی بجائے قارئین کرام ۔کواگر تھوڑا سا ماضی کٖ طرفی لے چلوں تو امید ہے کہ جواب ان کو خود بخود مل جائیگا اپریل 1996 کو کراچی کے ایک معروف عالم دین نے ایک فلاحی و رفاحی ادارہ بنام الرشید ٹرسٹ قائم کیا ۔ جن کے اغراض و مقاصد میں سے چند ایک پیش خدمت

ہے.

.فری ہپتالوں، میٹرنٹی ہومزاور ڈسپنسریوں کا قیام.1

بے روزگاروں کی مالی اعانت کرنا اور ان کے لیئے باعزت روزگار کے ذرائع تلاش.2
کرنا.

. غریب اور لاچار لوگوں کے لیئے کفن و دفن کا انتظام کرنا.3

.بیواؤں اور یتیموں کی مالی امداد اور ان کو ہر طرح کے احساس محرومی سے بچانا4

غریب لڑکیوں کی شادیوں کے لیئے جہیز اور ان کے دیگر ضروریات کے لیئے نقد امداد6
کرنا.

. مستحق طلباء کے لیئے تعلیمی سہولیات مہیا کرنا،اور نئے اداروں کا قیام عمل میں لانا.7

.کمیونٹی سنٹرز اور انڈسٹریل ہومز بنانا ان کل انتظام کرنا8

. وسیع پیمانے پر ایمبولنس سروس.9

بوڑھے اور بے سہارا لوگوں کی نگہداشت کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر فلاحی 10
.اداروں کے ساتھ رابطے میں رہنا اور بوقت ضرورت انکی اعانت کرنا

اس کے بعد جب الرشید ٹرسٹ نے باقاعدہ کام شروع کیا تو دنیا نے دیکھا کہ .ٹرسٹ نے اپنے منشور سے بھی آگے بڑھکر عوامی خدمات انجام دی .مثلا. قدرتی

آفات کے شکار لوگوں کی مدد کیلئے فوری پہنچنا ،انکی ہر ممکن مدد کرنا اور بعد میں انکی بحالی کے لیئے خدمات انجام دینا ، وطن عزیز مختلف علاقوں میں فری میڈیکل کیمپس لگانا اور لوگوں کا مفت علاج کرنا، مختلف ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں سے ہر شعبے میں بھرپور تعاون کرنا ، تین لاکھ مستحق افراد کو پکی پکائی روٹی منظم انداز میں پہنچانا، پانی کے قلت والے علاقوں میں ٹیوب ویلیں اور کنوئیں نکالنا . بارشوں اور سیلابوں میں بھرپور خدمات انجام دینا .اور اس کے علاوہ کئی دیگر منصوبے. لیکن ان تمام خدمات کے باوجود ستمبر 2001 میں ٹرسٹ پر پابندی لگا کر ان کے اکاؤنٹس منجمد کر دیئے گئے. پابندی کے بعد ٹرسٹ کے منتظمین نے قانونی جنگ لڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے حکومتی فیصلے کے خلاف سندھ ہائی کورٹ سے رجوع کیا. تقریبا دو سال کے بعد عدالت نے ٹرسٹ کے حق میں فیصلہ دیا.اور ٹرسٹ نے پھر سے فلاحی کام انجام دینے شروع کر دیئے .اس دوران جب اکتوبر 2005 کا تباہ کن زلزلہ آیا، تو ٹرسٹ نے دیگر اسلامی فلاحی تنظیموں کی وہ شاندار خدمات انجام دیئں کہ .پرویز انتظامیہ بھی داد دیئں بغیر نہ رہ سکا. لیکن اس تمام دورانیے میں ٹرسٹ سے منسلک تمام لوگ مسلسل ایک غلطی،، کرکے اس کو بار بار دہراتے رہے.اور وہ غلطی یہ کہ انہوں نے عامۃ الناس کے " دنیا سنوارنے کے ساتھ ساتھ آخرت بھی سنوارنے کا انتظام کر رکھا تھا. جسکی وجہ سے نہ صرف مسلمان اپنے بھولے ہوئے ماضی کی شاندار کارناموں سے آشنا ہوکر خود بھی ویسا بننے کی کوشش کر رہے تھے .بلکہ کفر کے

اندھیروں میں بھٹکنے والے اہل وطن بھی اپنے مسلمان بھائیوں کی رویوں اور ان کے انسان دوست کردار کی وجہ سے تیزی کے ساتھ اسلام کے شجر سایہ دار نے نیچے آرہے تھے. جب "عالمی برادری،، نے یہ سب کچھ دیکھا تو ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے شروع ہوگئے .اور انہوں نے فورا "ذمہ دار ریاست،، کو انکی ذمہ داری یاد دلائی اور یوں 2007 میں الرشید ٹرسٹ پر حکومت پاکستان نے پابندی لگا کر لاکھوں لوگوں کی امید کا دیا بجھادیا.

اب ذرا آئیں جماعۃالدعوۃ کی طرف .جماعۃالدعوۃ کے بھی اغراض ومقاصد بھی وہی ہے جو کہ کسی بھی اسلامی فلاحی تنظیم کے ہوتے ہیں . اور وہ یہ کہ جہاں کہیں اہل وطن مصیبت میں گرفتار ہوں، فورا انکی مدد کی جائے، مفید تعلیم سے ہر بچہ مستفید ہوجائے بہتر علاج ہر ایک کے پہنچ میں ہو، روٹی کے حصول کے لیئے کوئی عزت بیچنے پر مجبور نہ ہو، ہر مسلم کو اپنی اسلامی تشخص پر فخر ہو. یہ اور اس جیسے کئی فلاحی کام جماعۃالدعوۃ زور و شور سے کررہی ہے .اس لیئے عالمی امن کا ٹھیکیدار امریکہ اور اس کا مرید خاص ہندوستان سخت مضطرب اور پریشان ہے . ایسے میں آواران میں جماعۃالدعوۃ کی طرف سے زلزلہ زدگان کا بھرپور امداد، دفاع پاکستان کونسل میں حافظ محمد سعید کا نہایت اہم کردار اور اتحاد امت کے لیئے حافظ صاحب کی کوششیں. یہی وہ جرائم ہیں .جماعۃالدعوۃ اور اس کے امیر کے .جس نے امریکہ اور ہندوستان کو باؤلہ کرکے رکھدیا ہے

اس لیئے انھوں نے ایک بار پھر ''ذمہ دار،، ریاست کو اسکی ذمہ داری یاد دلائی ہے۔۔

لیکن افسوس کہ ذمہ داران پاکستان ٹھوس مؤقف اور منہ توڑ جواب دینے میں ناکام نظر آئے ۔

پورے کا پورا دال ہی کالا

نہ جانے پاکستان کے قبائلی عوام سے ایسی کونسی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ ان پر عرصہ دراز سے ہونے والے مظالم کو روکنے میں نہ صرف یہ کہ حکومت پاکستان سنجیدہ نہیں ۔ بلکہ اگر کوئی اور ان پر ہونے والی مظالم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے ۔ تو حکومت پاکستان اس پر بھی پانی پھیرنے میں دیر نہیں لگاتی ۔ ایک عرصہ ہوگیا کہ قبائلی عوام ڈرون حملوں کی شکل میں امریکی چیرہ دستیوں کا شکار ہے ۔ لیکن بد قسمتی سے ریاست پاکستان اپنی بنیادی ذمہ داری یعنی عوام کو تحفظ دینے میں ناکام نظر آتا ہے۔ بلکہ ماضی میں ڈرون حملوں کے خلاف پاکستان کے ڈاواں ڈول مؤقف کی وجہ سے یہ تاثر جڑ پکڑ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن آفسوس کہ بھاری ووٹوں سے منتخب ہونے والی نواز حکومت کے ابتدائی دور ہی میں پورے کا پورا دال ہی کالا نظر آنے لگا ہے۔ ایک ایسے وقت میں کہ جب امریکی ڈرون حملوں کے خلاف پوری دنیا میں ایک فضاء بغیر پاکستانی حکومت کی کسی کوشش کے پاکستان کے حق میں بنی ہوئی ہے۔ جس سے امریکہ پر کافی دباؤ پڑتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ حکومت پاکستان ایسے موقع غنیمت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے واشنگٹن کا دفاع کرتا نظر آ رہا ہے ۔ بدھ تیس اکتوبر کو وزارت دفاع کے حکام جب پاکستان کے ایوان بالا سینٹ میں بیان دے رہے تھے ۔

تو وہ پاکستان کے وفادار کم اور امریکی ترجمان زیادہ لگ رہے تھے ۔ وزارت دفاع کے حکام کی طرف سے سینٹ کو بتایا گیا ہے کہ 2008ء سے لیکر 2013ء تک 5 سال کے عرصے میں 317 ڈرون حملے کئے گئے جن کے نتیجے میں 67 عام شہری شہید اور دہشت گرد ہلاک ہوئے ہیں. جبکہ عالمی میڈیا کا کہنا ہے کہ ڈرون حملوں میں 2160 ہلاکتوں کی تعداد بہت کم بتائی گئی۔ بدھ کو وقفہ سوالات کے دوران سینیٹر نثار محمد کے سوال کے جواب پر تحریری بیان میں وزارت دفاع نے بتایا کہ 2008ء سے پاکستان میں 317 ڈرون حملوں کی اطلاعات مل چکی ہیں جن میں 2008ء میں 34، 2009ء میں 47، 2010ء میں 115، 2011ء میں 62، 2012ء میں 45 اور 2013ء میں 14 ڈرون حملے ہوئے۔ مذکورہ حملوں میں 2008ء میں مارے گئے دہشت گردوں کی تعداد 283 اور شہید ہونے والے افراد کی تعداد 21 ہے 2009ء میں 451 دہشت گرد مارے گئے جبکہ 9 افراد شہید ہوئے، 2010ء میں 751 شدت پسندوں مارے گئے جبکہ 2 افراد جاں بحق ہوئے، 2011ء میں 356 شدت پسند مارے گئے جبکہ 35 افراد جاں بحق ہوئے، 2012ء میں 235 اور 2013ء میں 84 شدت پسند مارے گئے۔ سرکاری حکام کے مطابق جنوری 2012ء سے اب تک ہونے والے ڈرون حملوں میں کوئی بھی عام شہری جاں بحق نہیں ہوا، ان حملوں میں تین سو زائد شدت پسند ہی ہلاک ہوئے ہیں .

مذکورہ بالا حکومتی رپورٹ کے من گھڑت ، بے بنیاد اور جھوٹ کے پلندے کے سوا

کچھ بھی نہیں اور اسکا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں . کہ خود امریکہ کے ایک سپیشل نمائندے بین ایمرسن نے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستانی حکام نے اسے بتایا ہے کہ ڈرون حملوں کے کچھ سالوں کے دوران شکار ہونے والے 2200 میں سے 400 عام شہری ہیں . اس کے علاوہ بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل بھی اپنی حالیہ رپورٹ میں امریکہ کی جانب سے پاکستان پر کئے جانے والے ڈرون حملوں کو جنگی جرائم قرار دے چکی ہے کہ ان حملوں میں معصوم شہری نشانہ بن رہے ہیں جبکہ عالمی میڈیا کا کہنا ہے کہ وزارت دفاع کی طرف سے ڈرون حملوں میں جاں بحق ہونے والوں کی تعداد بہت کم بتائی گئی ہے۔ جبکہ ڈرون حملوں کی تحقیقات کرنے اور اس سے متاثرہ افراد کے لیئے آواز اٹھانے والی تنظیم : فاؤنڈیشن فار فنڈامنٹل رائٹس ،،کے مطابق ڈروں حملوں میں اب تک 3500 سو سے زائد عام لوگوں کی شہادت ہوچکی ہے . تنظیم کے مطابق وہ اب تک 156 متاثرہ خاندانوں کے کیسز سامنے لاچکی ہے . واضح رہے کہ ڈرون حملوں سے متاثرہ خاندان کے افراد . رفیق الرحمٰن ان کے بیٹے زبیر الرحمٰن اور بیٹی نبیلہ رحمان کو امریکہ بھیجے اور وہاں پر اپنی درد بھرے داستان سنانے کا انتظام مذکورہ تنظیم نے ہی کیا تھا . حکومتی رپورٹ کو دیکھتے ہوئے تو یہی لگ رہا تھا کہ بریفنگ دینے والا موصوف شائد " کچھ پی کر،، ایوان میں آئے تھے . جبھی تو وہ ڈرون حملوں سے صرف 67 کے جاں بحق ہونے کی تصدیق کر رہے تھے . حالانکہ بیورو آف انویسٹیگیٹو جرنلزم کے مطابق ڈرون حملوں سے جاں بحق بچوں کی تعداد صرف 168

ہے ۔ گویا حکومتی مؤقف کے مطابق وہ معصوم بچے بھی "دہشت گردوں،، کی صف شامل تھے ۔ بہر حال مذکورہ بالا حکومتی مؤقف کے بعد اہل پاکستان کی آنکھیں کھل جانی چاہیئں ۔ کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ امریکہ لاجواب ہونے کو تھا۔ حکومت پاکستان نے ان کی زبان بول کر یہ ثابت کردیا کہ ۔ جمہوریت کے نام پر عوام کے ساتھ آنکھ مچولی کرکے عوام کو بے وقوف بناتا رہے گا ۔ کیونکہ بقول امریکی کانگریس میں ایوانِ نمائندگان کی خارجہ امور کی کمیٹی کے ایک رکن ایلن گریسن کہ ۔ کہ اگر پاکستان چاہے تو ڈرون حملے کل بند ہو سکتے ہیں۔ایک عالمی خبر رساں ادارے سے بات کرتے ہوئے انہوں کہا کہ 'پاکستان چاہے تو یہ حملے کل بند ہو سکتے ہیں اگر وہ امریکی ڈرونز کو سہولت دینا بند کر دے۔'

ان کا کہنا تھا: 'پاکستانی ایئر فورس کافی طاقتور ہے اور اس کے پاس قوت ہے، اپنی فضائی سرحد پر وہ جب چاہے پابندی لگا سکتے ہیں۔ پاکستان کی منظوری کے بغیر اس طرح کی کارروائی ممکن ہی نہیں ہے۔

. مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں

تحریک طالبان پاکستان کے مرکزی امیر حکیم اللہ محسود کے ڈرون حملے کی نتیجے میں دنیا سے رخت سفر باندھنے کے بعد دین وغیرت اور شرم وحیا سے عاری سول سوسائٹی کے ارکان اور پاکستانی میڈیا کے بعض گنجے دانشور بہت خوش اور مسرور دکھائی دے رہے ہیں . کیونکہ ان کو یہ خدشات لاحق ہوگئے تھے کہ ؛اگر طالبان اور حکومت پاکستان کے مابین مذاکرات "جو کہ امریکی حملے کے بعد اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں،، کامیاب ہوگئے تو پھر ان کے دال روٹی کا کیا بنے گا. لیکن دوسری طرف نگاہ اٹھا کے دیکھیں تو محسود پر حملے کے بعد ملکی فضاء سوگوار ہے.اور ہر بندہ مضطرب. کیونکہ مذاکرات کے حوالے سے انکی لگائی گئی امیدیں اب دم توڑتی دکھائی دے رہی ہے .
گو کہ امید پہ دنیا قائم ہے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ تحریک طالبان پاکستان کی تمام مرکزی قیادت نے جب جب بھی مذاکرات کیئں یا مذکرات کرنے کے لیئے تیار ہوئے .امریکی ڈرونز کے حملہ کرکے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنایا. وہ حملہ چاہے سنہ دوہزار چار کو مشرف دور حکومت میں حکومت کے ساتھ کامیاب مذاکرات کے بعد کمانڈر نیک محمد پر ہو، سنہ دوہزار نو کو پیپلزپارٹی کے دور حکومت میں بیت اللہ محسود پر ہو .یا موجودہ نواز حکومت میں عین مذاکرات کی تیاری کے وقت حکیم اللہ محسود پر .
لیکن موجودہ حملہ اس

حوالے سے زیادہ افسوسناک ہے کہ یہ ایک ایسی جمہوری حکومت کے دور اقتدار میں ہوا جو کہ ایک طرف بھاری مینڈیٹ لینے کا دعویدار ہے، تو دوسری طرف وہ خود کو دائے بازو کی جماعت اور ڈرون حملوں کے سخت مخالف کے طور پر پیش کرتی ہے . لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کا موجودہ کردار انکی انتخابی منشور سے میل نہیں کھاتی . گو کہ حکیم محسود پر حملے کے بعد حکومت نے امریکہ سے کسی حد تک احتجاج ضرور کیا ہے . اور علی سطحی اجلاس بھی طلب کیا ہے . لیکن صاف لگ رہا ہے کہ اس اعلی سطحی اجلاس میں بھی وہی پرانی باتیں ذرا نئی انداز سے دہرائی جائیگی . اور امریکہ کے سامنے دو ٹوک بات کرنے سے ہمارے ارباب اقتدار قاصر ہی نظر آئینگے . اس لیئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر موجودہ حکومت کو کسی بھی درجے میں عوام کی مفاد عزیز ہے . تو پھر ان کو موجودہ روش ترک کرکے اس حملے سے متعلق امریکہ سے متعلق اپنی پالیسی تبدیل کرنا ہوگی . اور عسکریت پسندوں کا اعتماد بحال کرنا ہوگا . بصورت دیگر امن اہل وطن کے لیئے ایک خواب بن جائیگا . ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ امریکہ نے حکیم اللہ محسود پر ایک ایسے وقت میں وار کیا کہ جب وہ حکومت پاکستان کے ساتھ امن مذاکرت کرکے وطن عزیز میں امن کو دوبارہ لوٹانے کی کوشش کر رہے تھے . ہمارے گنجے دانشور اور بے لگام سول سوسائٹی لاکھ کہے کہ وہ ایک دہشت گرد تھا، وطن دشمن تھا، باغی تھا، آئین کو نہیں مانتا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکمرانوں بالخصوص پرویز مشرف کے ناقص اور وطن دشمن خارجہ و داخلہ

پالیسیوں کی وجہ سے ان میں اور ہم میں فاصلے ضرور پیدا ہوئے تھے. لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے. اور تاریخ یہ بات ثابت کردے گی. کہ وہ ایک سچا اور محب وطن پاکستانی تھا. یہی وجہ رہی کہ جب مذاکرات کا سن کر سازشی عناصر نے دھماکے شروع کر دیئے. اور گنجے دانشور اپنی دانشوری پر اتر آئے. جس سے مذاکرات کی ڈور ٹوٹنے لگی تو اس وقت یہی حکیم اللہ محسود ہی تھے جس نے سامنے آکر اس ٹوٹتی ڈور کو مضبوط گرہ لگائیں. اور حکومت کو یہ پیغام دیا کہ مذاکرات کے لیئے کوئی پیشگی شرائط نہیں. بس شرط یہ ہے کہ مذاکرات کو میڈیا سے بچانا ہوگا. ''محسود کی مذاکرات پر امادگی اور مزاکرات کو ہر صورت بچانا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ وہ حکومتی پالیسیوں کے خلاف ضرور ہے. لیکن ریاست پاکستان کے خلاف ہرگز نہیں، اس کے برعکس بلوچ عسکریت پسند ہو یا سندھو دیش کے علمبردار وہ کسی صورت پاکستان کا نام سننا بھی گورا نہیں کرتے.،. لیکن افسوس کہ ہمارے گنجے دانشوروں اور بے مہار سول سوسائٹی کو یہ سب نظر نہیں آتا. بہرحال حکومت نے اس کی بات سے اتفاق کیا. اور ہمارے وزیر داخلہ چوہدری نثار نے دن رات محنت کرکے مذاکرات کے لیئے راستہ ہموار کیا. لیکن لگ ایسا رہاہے کہ حکومتی سطح پر شائد کسی اور نے چوہدری نثار کا ساتھ نہیں دیا. اور یہی وجہ رہی کہ جب مذکرات کا میز سجنے کو تھا. امریکہ نے حملہ کرکے ایک بار پھر یہ ثابت کردیا کہ غلاموں کی ترجیحات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا. حالانکہ حملے کے بعد وزیرداخلہ نے خود کہا کہ امریکہ نے یہ یقین

دہانی کرائی تھی کہ وہ دوران مذاکرات ڈرون حملہ نہیں کرے گا۔ یہاں حکومت سے دانستہ یا غیر دانستہ یہ ایک بہت بڑی غلطی ضرور ہوئی ہے کہ انہوں نے ماضی کی طرح ایک بار پھر امریکی وعدوں پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیا تھا۔ ورنہ اتنے ہائی لیول پر مذاکرات کرتے وقت پاکستانی حکومت کو کسی بھی سازش سے نمٹنے کے لیئے پاک فضائیہ کو تیار رکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس طرف کسی کا دھیان یہ نہیں گیا۔ بہر حال اس افسوسناک واقعے کے بعد بھی حکومت پاکستان معاملات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا۔ حالانکہ موجودہ مذاکراتی عمل کے دوران طالبان قیادت پر یہ دوسرا حملہ تھا۔ اس سے پہلے ولی الرحمان کو نشانہ بناکر امریکہ نے مذاکراتی عمل کو سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن طالبان نے اس وقت مذاکراتی عمل کو پٹڑی سے اترنے نہیں دیا۔ لیکن اس بار طالبان کے لیئے مذاکراتی عمل کو اس وقت تک آگے بڑھانا ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ حکومت پاکستان امریکہ کے حوالے سے اپنی پالیسی میں ٹھوس تبدیلی نہیں لاتی۔ اور مین سمجھتا ہوں کہ عام اور ملکی مفاد کی خاطر حکومت کو جلد از جلد یہ قدم اٹھانا ہوگا۔ بصورت دیگر توانائی بحران، معاشی بحران اور دیگر بحرانوں سے نمٹنا ناممکن ہوجائیگا بلکہ ملک اور کئی دیگر بحرانوں کا شکار ہوتا چلاجائیگا۔ جس کے متحمل ہم پاکستانی عوام بہر حال نہیں ہو سکتے۔ آخر میں اس حملے کے حوالے سے یہ ایک شعر وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں پیش کرتا چلوں کہ۔

ادھر ادھر کی بات نہ کر یہ بتا قافلہ کیوں لٹا ؟
مجھے راہزنوں سے گلہ نہیں تیری رہبری کا سوال ہے ؟

فضل اللہ کا انتخاب اور پاکستانی میڈیا

حکیم اللہ محسود پر ہونے والے حملے کے بعد پاکستان نے کیا کھویا اور کیا پایا ۔ یہ تو وقت بتائے گا۔ لیکن اس حملے نے پاکستانی میڈیا کا مکروہ چہرہ بے نقاب ضرور کیا ۔کیسے ؟ ویسے تو دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ پر جسکی بھی تھوڑی سی نظر تھی یا ہے ۔ تو انکو معلوم ہے کہ پاکستانی طالبان اور افغان طالبان میں نہ تو کل کوئی اختلاف تھا ۔اور نہ آج ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیئے لازم و ملزوم ہیں ۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ افغانستان میں امریکہ کو شکست دینے میں پاکستانی طالبان کا بہت بڑا رول ہے۔ جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ جب افغانستان پر امریکی حملے کے بعد افغانیوں پر برا وقت آیا تو یہی قبائل ہی تھے جنھوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے جگر گوشوں کو مظلوم افغانوں کی مدد کے لیئے افغانستان بھیجھا،اس سلسلے میں محسود قبائل کی قربانیوں کا ذکر نہ کرنا انکے ساتھ زیادتی ہوگی کہ انھوں افغانستان میں امریکہ اور ناٹو کے خلاف جس بہادری کا مظاہرہ کیا تاریخ اسے سنہری الفاظ کے ساتھ یاد رکھے گا۔ جہاں تک بات ہے ٹی ٹی پی کے پاکستان میں کارروائیاں کرنا تو میڈیا بتائے چاہے نہ بتائے ۔لیکن اہل وطن کو معلوم ہے کہ پاکستان میں اس جنگ کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی ۔ اہل وطن کو

سنہ دو ہزار چار کے اوائل میں پشاور میں قبائلی عمائدین کے ساتھ پرویز مشرف کے اس میٹنگ کے بارے میں بھی معلومات ہوگی . کہ اس میٹنگ میں مشرف نے قبائلی عمائدین کو بتادیا تھا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ میں پاکستانی فوج کو القاعدہ کے خلاف کارروائی کے لیئے فاٹا بھیج دوں . مشرف نے مزید کہا تھا کہ میں اس کام کے لیئے تیار ہوچکا ہوں .اور یہ کہ اس کارروائی میں امریکی فوج ہمیں صحافیوں کے روپ میں سپورٹ کریگی. اس کے بعد کیا ہوا وہ سب کو پتہ ہے . لیکن "سلام،، ہے پاکستانی میڈیا کو کہ اس میڈیا نے ہمیشہ اپنی توانائیاں اس بات پر سرف کی کہ پاکستانی طالبان اور افغان طالبان ایک دوسرے سے الگ ہی نہیں بلکہ وہ تو ایک دوسرے کی دشمن ہے . لیکن حکیم اللہ محسود پر ہونے والے حملے کے بعد پورے خطے میں جس نے اس حملے کے بارے میں سب سے زیادہ سخت الفاظ میں مذمت کی .وہ افغان طالبان ہی تھے .افغان طالبان کے اس مذمتی بیان کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا. کہ پاکستانی میڈیا اپنے کردار کا جائزہ لیتی اور قوم سے معافی بھی مانگتی . لیکن وہ یہ کام کیونکر سکتا ہے .کہ انکا تو کام ہی یہی ہے کہ حقائق کو مسخ کرکے قوم کو غلط شلط رپورٹوں پر ٹرخاتا رہے. ایک اور خاص بات جو پاکستانی میڈیا باالخصوص کراچی سے شائع ہونے والے ایک معروف اردو روزنامہ ہمیں باور کراتی رہی .وہ یہ تھی کہ ملا فضل اللہ "جو سوات اپریشن کے وقت تحریک طالبان پاکستان سوات شاخ کے امیر تھے ؛؛ نہ صرف بھارتی اور امریکی ایجنٹ ہے بلکہ انکے پاکستانی طالبان کے ساتھ دور کا بھی

واسطہ نہیں ۔ حالانکہ اس موجودہ جنگ پر نظر رکھنے والے جانتے تھے اور ہیں کہ ۔ فضل اللہ نہ صرف ٹی ٹی پی کا حصہ تھے ،بلکہ وہ تنظیم میں ایک انتہائی اہم عہدے پر فائز بھی تھا ۔ میڈیا نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ افغان طالبان فضل اللہ کے خون کے پیاسے ہیں ۔بلکہ پچھلے دنوں میڈیا نے ہمیں یہ ''خوشخبری،، بھی سنادی دی کہ ملا فضل اللہ افغان طالبان کے ساتھ ہونے والے ایک جھڑپ میں اپنے دیگر دو ساتھیوں سمیت مارے گئے ۔لیکن آفسوس اور صد افسوس کہ یہ سب ٹوپی ڈرامہ اور قوم کے ساتھ ایک سنگین مزاق تھا ۔کیونکہ آج قوم آنکھوں سے دیکھ رہی ہے ۔کہ نہ صرف پاکستان اور افغان طالبان ایک ہے ۔ بلکہ پاکستانی طالبان نے فضل اللہ کو اپنا امیر مقرر کرکے یہ ثابت کردیا کہ پاکستانی میڈیا فی الحال حقیقت سے کوسوں دور اور صرف پروپیگنڈہ مہم میں مصروف ہیں ۔

بہر حال مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ اگر ٹی ۔پی کے اس فیصلے کا بغور جائزہ لیا جائے ۔ کہ جس مین انھوں ملا فضل اللہ کو اپنا مرکزی امیر چن لیا ہے ۔تو لگ ایسا ہی رہا ہے کہ وہ اب کہ بار اپنے مرحوم امیر حکیم اللہ محسود پر ہونے والے حملے کا تباہ کن بدلہ لینا چاہ رہے ہیں ۔ کیونکہ فضل اللہ طالبان میں مین سخت گیر کمانڈر کی حثیت سے جانا اور مانا جاتا ہے ۔ اور اسکا چناؤ ظاہر کرتا ہے ،کہ طالبان ام موجودہ حکومت پر بھروسہ کرنے کے لیئے

تیار نہیں . لہٰذا میں سمجھتا ہوں ایک تو اس نازک دور میں میڈیا کو اپنے کردار کا جائزہ لینا چاہئے . کہیں ایسا نہ ہو کہ سقوط ڈھاکہ کی طرح یہاں بھی ہمیں سب ٹھیک کے لولی پاپ تھماتا رہے . اور حقیقتا حالات اس کے برعکس ہوں . اس کے علاوہ تمام محب وطن لوگوں جن میں علماء کرام ، فوج کے سابقہ افسران ، دانشور ، اور اپوزیشن سمیت باضمیر حکومتی ارکان کو چاہیئے . کہ وہ فی الفور حرکت میں آکر نواز حکومت کو انکے وہ وعدے یاد دلائے جو انہوں نے اہل وطن سے الیکشن کمپئین چلاتے وقت کیئں تھے . کیونکہ اب وقت اگیا ہے کہ ملک کو بچایا جائے . اس کے علاوہ یہ لوگ عوام کو وہ اعداد و شمار بھی بتائے کہ ہم نے اس امریکی جنگ میں شرکت کے بعد کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے . اس کے علاوہ جو لوگ اس جنگ امریکی جنگ کو اپنا جنگ مانتے ہیں . ذرا انسے بھی معلوم کیا جائے کہ وہ اب تک اس جنگ لیں جاں بحق ہونے والے کتنے فوجی جوانوں اور کتنے سویلین لوگوں کے گھر جاکر ان سے اظہار ہمدردی کر چکے ہیں . اور اگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تو انکو چاہیئے کہ خدارا اپنے '' مفید مشورے ،، اپنے پاس ہی رکھے . یا پھر امریکہ چلے جائیں تاکہ اپ کے مشوروں سے کچھ تو امریکی بھی مستفید ہو جائے . کیونکہ ہم اس نام نہاد جنگ کو مزید جاری رکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتے . اس لیئے کہ اس جنگ میں جو مر رہے ہیں وہ دونوں ہمارے اپنے ہیں . وہ چاہے کوئی طالب ہو یا چاہے کوئی فوجی جوان . بلکہ اگر کسی کو برا نہ لگے تو سچ بہر حال یہی ہے کہ یہ دونوں یعنی افواج پاکستان اور قبائل اس ملک اور

عالم اسلام کے حقیقی محافظ ہیں ۔ اگر کسی کو یقین نہیں تو ذرا سنہ دوہزار سے پہلے کی حالات کا مشاہدہ تو کرکے دیکھیں۔ اسی لیئے تو اغیار کبھی نہیں چاہے گا۔ کہ یہ جنگ ختم ہو۔ کیونکہ انکو معلوم ہیکہ اگر عالم اسلام کے یہ مایاناز اور قابل فخر بیٹے یعنی قبائل اور افواج پاکستان آپس میں ایک ہوگئے۔ تو پھر نہ تو کشمیر پر وہ غاصبانہ قبضہ برقرار رکھ سکیں گے، اور نہ ہی فلسطین آزادی کے لیئے زیادہ عرصہ ترستا رہے گا۔ اسی لیئے وہ قوتیں تو یہی چاہے گی کہ ۔ہم اپس میں یونہی دست و گریباں رہیں۔ تاکہ انکو ہمیں غلام رکھنے میں آسانی ہو۔ لہٰذا اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرکے آگے بڑھیں۔ کیونکہ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ کہ یا تو امریکی مفادات کو بچائے یا پھر پاکستان کو ۔اور مجھے امید ہیکہ سیاستدان بالخصوص میاں نواز شریف صاحب ذاتی و امریکی مفاد کے مقابلے میں ملکی مفاد کو زیادہ ترجیح دینگے۔ انشاءاللہ۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ امریکہ سے تعلق توڑ کر ہمارے معشیت کا کیا بنے گا۔ تو اگر یہ سوال کسی کے بھی ذہن میں ہوں تو انکی خدمت مین عرض ہیکہ۔ وہ جمعرات سات نومبر دوہزار تیرہ کے روزنامہ جنگ میں معروف ماہر معشیت ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کا کالم پڑھیں تو انکو انکے تمام سوالات کا کافی و شافی جوابات مل جائینگے۔ انشاءاللہ.

.جوناگڑھ ۔ ماضی سے حال تک

نہایت ہی آفسوس سے لکھناپڑتا ہے کہ جس مقصد کے لیئے بانیان پاکستان نے لاکھوں قربانیاں دے دراس وطن عزیز کو آزاد کیا تھا آج ہم اس مقصد سے مکمل طور بے خبر ہوتے جارہے ہیں ۔ بے خبر ہم اس لیئے ہوتے جارہے ہیں کہ ہمارے کرتا دھرتا لوگوں اور اداروں کو اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں کہ وہ عوام الناس کو اصل حقائق سے اگاہ کرے. میں یقین سے کہ سکتا ہوں کہ اگر ذمہ دار لوگ اپنی ذمہ داری پوری ایمانداری سے ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل وطن اپنے اصل پہچان کی طرف واپس نہ آئے .اور وہ ذمہ دار لوگ حکومتی ارکان اور میڈیا سے وابستہ احباب ہے. کسی بھی حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان کا ملک جس بنیاد پر کھڑا ہے وہ اسے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کرے. میڈیا کے لوگ یعنی صحافی چونکہ معاشرے کی آنکھیں ہوتی ہیں .اس لیئے ان پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہیں .پہل بات یہ کہ انکی حکومت پر بھی نظر ہوتی ہے کہ ،جہاں کہیں حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے میڈیا فوری طور حکومتی توجہ دلانے کی کوشش کرتی ہیں .میڈیا کی دوسری ذمہ داری یہ ہیکہ جیسے کہ سطور بالا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ چونکہ صحافی معاشرے کی آنکھ ہوتے ہیں .اس لیئے ان پر یہ بھاری ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہیں کہ

وہ عوام کو انکے اصل مقاصد کے بارے میں وقتا فوقتا بتاتے رہے .نہ کہ انکو اپنے اصل مقصد سے ہٹا کر عیاشیوں اور رنگینیوں میں مبتلا کردے.پاکستان چونکہ ایک اسلامی نظریاتی ملک ہیں .اور اس ملک کو آزاد کرانے کے کچھ مقاصد تھے .جن میں کچھ تو اس ملک کے آزاد ہوتے ہیں پورے ہوگئے تھے .جبکہ بیشتر ایسے تھے جن پر بعد میں کام کرکے اسے حاصل کرنا تھا. لیکن بدقسمتی سے آزادی کے فوری بعد محمد علی جناح انتقال کرگئے. جس کے نتیجے میں وہ کھوٹے سکے جنکے طرف قائد نے اپنی زندگی میں اشارہ کیا تھا ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے. بس پھر کیا تھا .وہ دن اور آج کا دن نہ تو ہم نے ان ادھورے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ،اور نہ ہی ہم دنیا میں باعزت مقام حاصل کرسکے. ان کھوٹے سکوں نے کہ جس میں حکومتی کرتا دھرتا اور صحافی دونوں شامل ہیں .ہمیں اصل منزل کی طرف لے جانے کی بجائے صحرا کی طرف لے گئے .جہاں آج تک ہم بھٹک رہے ہیں .اور صحرا میں بھٹکنے کا مطلب موت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے .اور یہی وجہ ہے .کہ آج ہمارا مردہ وجود ہندوستانی اور امریکی گدھ نوچ رہے ہیں .آج جہاں ایک طرف امریکہ ہمارے عزتوں سے کھیل رہا ہے ،تو وہی دنیا کے سب سے زیادہ بھوکے لوگ رکھنے والا ہندوستان بھی ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے .آج ہمارے حکمران نہ صرف اپنی عزت و وقار کے بدلے ملنے والے چند ڈالر اپنے لیئے باعث سعادت سمجھتے ہیں ، بلکہ وہ کشمیر کے حوالے سے بھی فرنٹ فٹ پر جانے کی بجائے بیک فٹ پر آنے کی کوشش کررہے ہیں .حالانکہ کشمیر کے علاوہ اور بھی

ایسے علاقے ہیں جس پر انڈیا بزور قوت قبضہ کیئے بیٹھا ہے. لیکن اقتدار کے مسند پر بیٹھے حکمرانوں اور الیکٹرانک میڈیا کے "مہربانوں،، نے تو جیسے قسم کھائی ہیں کہ عوام کو ان حقائق سے بے خبر ہی رکھنا ہے. قارئین محترم! ان مقبوضہ علاقوں میں ایک علاقہ ریاست جوناگڑھ کے نام سے بھی ہے. جس سے بد قسمتی سے اہل وطن کی اکثریت بے خبر ہے. لیکن انشاء اللہ ہم انکو اپنے استعداد کے مطابق حقائق سے باخبر رکھنے کی پوری کوشش کرینگے. جب انگریز سامراج برصغیر سے جارہا تھا. اور تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کے ساتھ الحاق کر رہے تھے. تو دیگر ریاستوں کی طرح جوناگڑھ "جو کہ ایک آزاد ریاست تھی،، ان کے حکمران نواب مہابت خانجی نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کردیا. اور یوں ریاست جوناگڑھ پاکستان کا حصہ بن گیا. پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد ستمبر انیس سو سیتالیس میں محمد علی جناح نے اس حوالے سے پاکستان کے قانون ساز اسمبلی میں ایک قرار داد پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی. پاکستان کا حصہ بننے کے بعد جب ریاست جوناگڑھ کے نواب محمد علی جناح سے ملنے پاکستان آئے. تو ان کے انے کے بعد ہندوستان نے نو نومبر انیس سو سینتالیس کو پاکستان کے اس اہم حصے یعنی ریاست جوناگڑھ میں اپنی فوجیں داخل کرادی. اور یوں ہندوستان ریاست پر بزور قوت قابض ہوگیا. ناجائز ہندوستانی قبضے کے خلاف پاکستان نے اس وقت اقوام متحدہ میں گیا. لیکن جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے. کہ اس وقت تک قائد دنیا سے جاچکے تھے

اور ملکی بھاگ ڈور" کھوٹے سکوں ،،کے ہاتھ میں تھی اس لیئے یہ مسئلہ بھی کئی دیگر اہم. مسائل کی طرح سرد خانے کی نظر ہوگیا. آج ایک ایسے وقت میں کہ جب ہمیں میڈیا اور حکومتوں کی جانب سے تصویر کا ایک رخ دکھایا جارہاہے .ہماری یہ ذمہ داری دوچند ہوجاتی ہیں کہ خود بھی حقائق سے باخبر رہے .اور اہل وطن کو بھی باخبر رکھے .آللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو. امین.

شہید اسامہ صحرا سے دریا تک

1966 کی صبح ایک عرب بچہ فجر سے کچھ پہلے اپنے والد کو جگا کر کہتا ہے ابا جان میں آپ کو اپنا ایک خواب سنانا چاہتا ہوں۔ والد نے سوچا شاید بچے نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ انھوں نے وضو کیا اور بچے کو لے کر مسجد کی طرف چل پڑے۔

راستے میں بچے نے بتایا کہ میں نے خواب میں خود کو ایک وسیع میدان میں پایا۔ میں نے دیکھا کہ سفید رنگ کے گھوڑوں پر سوار ایک لشکر میری جانب بڑھ رہا ہے۔ اس لشکر میں سے ایک گھڑ سوار جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں میرے برابر آکر رک گیا اور کہنے لگا: کیا آپ اسامہ بن لادن ہیں؟ میں نے جواب دیا جی ہاں۔ اس نے پھر سوال پوچھا کیا آپ اسامہ بن لادن ہیں؟

میں نے جواب دیا جی ہاں میں ہی ہوں۔ اس نے تیسری بار پھر پوچھا کیا آپ ہی اسامہ بن لادن ہیں؟ تب میں نے اسے کہا خدا کی قسم میں ہی اسامہ بن محمد بن لادن ہوں۔ اس نے میری طرف ایک جھنڈا بڑھایا اور کہا کہ یہ جھنڈا القدس کے دروازے پر امام مہدی (محمد بن عبداللہ) کو دے دینا۔ میں نے وہ پرچم لے لیا اور میں نے دیکھا کہ وہ لشکر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ والد اس خواب پر بہت حیران ہوئے لیکن پھر کسی کام میں مصروفیت کی بنا پر خواب کو بھول گیے۔

اگلی صبح نماز سے کچھ پہلے جگا کر بچے نے پھر وہی خواب سنایا۔ تیسری صبح پھر ایسا ہی ہوا تو والد کو اپنے بچے کے بارے میں تشویش ہوءی وہ اسے لے کر ایک عالم کے پاس گیے جو خوابوں کی تعبیر جانتے تھے۔ انہوں نے خواب سن کر بچے کو غور سے دیکھا اور پوچھا کیا اس بچے نے خواب دیکھا ہے والد نے فرمایا جی۔ انہوں نے بچے سے پوچھا، بیٹے تمہیں وہ پرچم یاد ہے جو تمہیں اس گھڑسوار نے دیا تھا؟

اسامہ نے کہا، جی ہاں مجھے یاد ہے۔ وہ عالم کہنے لگے ذرا مجھے بتاؤ وہ کیسا تھا؟ اسامہ نے کہا، تھا تو وہ سعودی عرب کے جھنڈے جیسا ہی مگر اس کا رنگ سبز نہیں تھا بلکہ سیاہ تھا اور اس میں سفید رنگ سے کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ عالم نے اسامہ سے پوچھا کبھی تم نے خود بھی لڑتے ہوءے دیکھا ہے اسامہ نے کہا، اس طرح کے خواب تو میں اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔ پھر انہوں نے اسامہ سے کہا کہ وہ باہر جاءیں اور تلاوت کریں۔

پھر وہ والد کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا آپ لوگوں کا آبایی تعلق کہاں سے ہے؟

انہوں نے کہا، یمن کے علاقے حضرت موت سے۔ کہنے لگے کہ اپنے قبیلے کے بارے میں بتاءیں۔ انہوں نے کہا ہمارا تعلق قبیلہ شنوءۃ سے ہے جو یمن کا قحطانی قبیلہ ہے۔

عالم نے زور سے تکبیر بلند کی پھر اسامہ کو بلایا اور ان کو

روتے ہوءے چومنے لگے ساتھ فرمایا، قیامت کی نشانیاں قریب آگیی ہیں اے محمد بن
لادن آپ کا یہ بیٹا امام مہدی کے لیے لشکر تیار کرے گا اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے
خطہ خراسان کی طرف ہجرت کرے گا۔ اے اسامہ مبارک ہے وہ جو آپ کے ساتھ جہاد
کرے، ناکام ونامراد ہو وہ جو آپ کو تنہا چھوڑ کر آپ کے خلاف لڑے۔

بحوالہ : شہید اسامہ صحرا سے دریا تک

Aisha Siddiqa. بشکریہ۔ فیس بک .پیج ایڈ من

ایک عبرتناک کہانی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک تھا مچھیرا، اپنے کام میں مگن اور راضی خوشی رہنے والا۔ وہ صرف مچھلی کا شکار کرتا اور باقی وقت گھر پر گزارتا۔ قناعت کا یہ عالم کہ جب تک پہلی شکار کی ہوئی مچھلی ختم نہ ہو دوبارہ شکار پر نہ جاتا۔

ایک دن کی بات ہے کہ ۔۔۔ مچھیرے کی بیوی اپنے شوہر کی شکار کردہ مچھلی کو چھیل کاٹ رہی تھی کہ اس نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔۔۔ حیرت نے تو اس کو دنگ کرکے رکھ دیا تھا۔۔۔ ایک چمکتا دمکتا موتی مچھلی کے پیٹ میں ۔۔۔ سبحان اللہ ۔۔۔ سرتاج، سرتاج، آؤ دیکھو تو، مجھے کیا ملا ہے۔۔۔ کیا ملا ہے، بتاؤ تو سہی۔۔۔ یہ دیکھو اتنا خوبصورت موتی ۔۔۔ کدھر سے ملا ہے۔۔۔ مچھلی کے پیٹ سے ۔۔۔ لاؤ مجھے دو میری پیاری بیوی، لگتا ہے آج ہماری خوش قسمتی ہے جو اس کو بیچ کر مچھلی کے علاوہ کچھ اور کھانا کھانے کو ملے گا۔۔۔

مچھیرے نے بیوی سے موتی لیا۔۔۔ اور محلے کے سنار کے پاس پونہچا۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔ جی قصہ یہ ہے کہ مجھے مچھلی کے پیٹ سے موتی ملا ہے۔۔۔ دو مجھے ، میں دیکھتا ہوں اسے۔۔۔ اوہ،،، یہ تو بہت عظیم الشان ہے۔۔۔

میرے پاس تو ایسی قیمتی چیز خریدنے کی استطاعت نہیں ہے۔۔۔ چاہے اپنا گھر، دکان اور سارا مال و اسباب ہی کیوں نہ بیچ ڈالوں، اس موتی کی قیمت پھر بھی ادا نہیں کر سکتا میں۔۔۔ تم ایسا کرو ساتھ والے شہر کے سب سے بڑے سنار کے پاس چلے جاؤ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی قیمت ادا کر سکے، جاؤ اللہ تیرا حامی و ناصر ہو۔۔۔

مچھیرا موتی لے کر، ساتھ والے شہر کے سب سے امیر کبیر سنار کے پاس پونہچا، اور اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔۔۔ مجھے بھی تو دکھاؤ، میں دیکھتا ہوں ایسی کیا خاص چیز مل گئی ہے تمہیں۔۔۔ اللہ اللہ، پروردگار کی قسم ہے بھائی، میرے پاس اس کو خریدنے کی حیثیت نہیں ہے۔۔۔ لیکن میرے پاس اس کا ایک حل ہے، تم شہر کے والی کے پاس چلے جاؤ۔۔۔ لگتا ہے ایسا موتی خریدنے کی اس کے پاس ضرور حیثیت ہو گی۔۔۔ مدد کرنے کا شکریہ، میں چلتا ہوں والی شہر کے پاس۔۔۔

اور اب شہر کے والی کے دروازے پر ہمارا یہ مچھیرا دوست ٹھہرا ہوا ہے، اپنی قیمتی متاع کے ساتھ، محل میں داخلے کی اجازت کا منتظر۔۔۔ اور اب شہر کے والی کے دربار میں اس کے سامنے۔۔۔ میرے آقا، یہ ہے میرا قصہ، اور یہ رہا وہ موتی جو مجھے مچھلی کے پیٹ سے ملا۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ کیا عدیم المثال چیز ملی ہے تمہیں، میں تو گویا ایسی چیز دیکھنے کی حسرت میں ہی تھا۔۔۔ لیکن کیسے اس

کی قیمت کا شمار کروں۔۔۔ ایک حل ہے میرے پاس، تم میرے خزانے میں چلے جاؤ۔۔۔ اُدھر تمہیں 6 گھنٹے گزارنے کی اجازت ہوگی۔۔۔ جس قدر مال و متاع لے سکتے ہو لے لینا، شاید اس طرح موتی کی کچھ قیمت مجھ سے ادا ہو پائے گی۔۔۔ آقا، 6 گھنٹے !!!! مجھ جیسے مفلوک الحال مچھیرے کے لئے تو 2 گھنٹے بھی کافی ہیں۔۔۔ نہیں، 6 گھنٹے، جو چاہو اس دوران خزانے سے لے سکتے ہو، اجازت ہے تمہیں۔۔۔

ہمارا یہ مچھیرا دوست والی شہر کے خزانے میں داخل ہو کر دنگ ہی رہ گیا، بہت بڑا اور عظیم الشان ہال کمرا، سلیقے سے تین اقسام اور حصوں میں بٹا ہوا، ایک قسم ہیرے، جواہرات اور سونے کے زیورات سے بھری ہوئی۔۔۔ ایک قسم ریشمی پردوں سے مزین اور نرم و نازک راحت بخش مخملیں بستروں سے آراستہ۔۔۔ اور آخری قسم کھانے پینے کی ہر اُس شئے سے آراستہ جس کو دیکھ کر منہ میں پانی آجائے۔۔۔

مچھیرے نے اپنے آپ سے کہا،،، 6 گھنٹے ؟؟؟ مجھ جیسے غریب مچھیرے کے لئے تو بہت ہی زیادہ مہلت ہے یہ۔۔۔ کیا کروں گا میں ان 6 گھنٹوں میں آخر؟؟؟ خیر۔۔۔ کیوں نہ ابتدا کچھ کھانے پینے سے کی جائے؟؟؟ آج تو پیٹ بھر کر کھاؤں گا، ایسے کھانے تو پہلے کبھی دیکھے بھی نہیں۔۔۔ اور اس طرح مجھے ایسی توانائی بھی ملے گی جو ہیرے، جواہرات اور زیور سمیٹنے میں مدد دے۔۔۔

اور جناب ہمارا یہ مچھیرا دوست خزانے کی تیسری قسم میں داخل ہوا۔۔۔ اور ادھر اُس نے والی شہر کی عطاء کردہ مہلت میں سے دو گھنٹے گزار دیئے۔۔۔ اور وہ بھی محض کھاتے، کھاتے۔۔۔ اس قسم سے نکل کر ہیرے جواہرات کی طرف جاتے ہوئے، اس کی نظر مخملیں بستروں پر پڑی، اُس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ آج تو پیٹ بھر کر کھایا ہے۔۔۔ کیا بگڑ جائے گا اگر تھوڑا آرام کرلیا جائے تو، اس طرح مال و متاب جمع کرنے میں بھی مزا آئے گا۔۔۔ ایسے پر تعیش بستروں پر سونے کا موقع بھی تو بار بار نہیں ملے گا، اور موقع کیوں گنوایا جائے۔۔۔ مچھیرے نے بستر پر سر رکھا اور بس،،،، پھر وہ گہری سے گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔

اُٹھ اُٹھ اے احمق مچھیرے، تجھے دی ہوئی مہلت ختم ہوچکی ہے۔۔۔ ہائیں، وہ کیسے ؟؟؟ جی، تو نے ٹھیک سنا ہے، نکل ادھر سے باہر کو۔۔۔ مجھ پر مہربانی کرو، مجھے کافی وقت نہیں ملا، تھوڑی مہلت اور دو۔۔۔ آہ۔۔۔ آہ۔۔۔ تجھے اس خزانے میں آئے 6 گھنٹے گزر چکے ہیں، اور تو اپنی غفلت سے اب جاگنا چاہتا ہے۔۔۔ ! اور ہیرے جواہرات اکٹھے کرنا چاہتا ہے کیا؟؟؟ تجھے تو یہ سارا خزانہ سمیٹ لینے کے لئے کافی وقت دیا گیا تھا۔۔۔ تاکہ جب ادھر سے باہر نکل کر جاتا تو ایسا بلکہ اس سے بھی بہتر کھانا خرید پاتا۔۔۔ اور اس جیسے بلکہ اس سے بھی بہتر آسائش والے بستر بنواتا۔۔۔ لیکن تو احمق نکلا کہ غفلت میں

پڑ گیا۔۔۔ تو نے اس کنویں کو ہی سب کچھ جان لیا جس میں رہتا تھا۔۔۔ باہر نکل کر سمندروں کی وسعت دیکھنا تو نے گوارہ ہی نہ کی۔۔۔ نکالو باہر اس کو۔۔۔ نہیں، نہیں، مجھے ایک مہلت اور دو، مجھ پر رحم کھاؤ۔۔۔

!!! یہ قصہ تو ادھر ختم ہو گیا ہے

لیکن عبرت حاصل کرنے والی بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔۔۔

اُس قیمتی موتی کو پہچانا ہے آپ لوگوں نے؟؟؟

!!! وہ تمہاری روح ہے اے ابن آدم، اے ضعیف مخلوق

یہ ایسی قیمتی چیز ہے جس کی قیمت کا ادراک بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔

اچھا، اُس خزانے کے بارے میں سوچا ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟؟؟

جی ہاں، وہ دنیا ہے۔۔۔

اس کی عظمت کو دیکھ دیکھ اس کے حصول کے لئے ہم کیسے مگن ہیں؟؟؟

!!! اس خزانے میں رکھے گئے ہیرے جواہرات

وہ تیرے اعمال صالحہ ہیں۔۔۔

!!! اور وہ پر تعیش و پر آسائش بستر

وہ تیری غفلت ہیں۔۔۔

!!! اور وہ کھانا پینا

وہ شہوات ہیں۔۔۔

اور اب۔۔۔ اے مچھلی کا شکار کرنے والے دوست۔۔۔

،،اب بھی وقت ہے کہ نیندِ غفلت سے جاگ جا

اور چھوڑ دے اس پر تعیش اور آرام دہ بستر کو۔۔۔

اور جمع کرنا شروع کر دے ان ہیروں اور جواہرات کو جو کہ تیری دسترس میں ہی

ہیں۔۔۔

اس سے قبل کہ تجھے دی گئی 6 گھنٹوں کی مہلت ختم ہو جائے۔۔۔

تجھے محض حسرت ہی رہ جائے گی۔۔۔

،خزانے پر مامور سپاہیوں نے تو تجھے ذرا سی بھی اور زیادہ فرصت نہیں دینی

"اور تجھے ان نعمتوں سے باہر نکال دینا ہے جن میں تو رہ رہا ہے۔۔

.بشکریہ فیس بک

سانحہ راولپنڈی۔ ظلم کی انتہاء

پاکستان کے ایک انتہائی محفوظ تصور کیئے جانے والے شہر ،راولپنڈی میں شیعہ مکتب فکر کے ایک جلوس نے راجہ بازار کے علاقے میں مدرسہ جامعہ تعلیم القرآن و مسجد میں جس بے رحمی کے ساتھ ظلم و ستم کا بازار گرم کیئں رکھا ،اسکی مثال پاکستانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ظلم و بربریت سے بھرپور اس واقعے کے بعض پہلوؤں اگرچہ سامنے آ گئے ہیں۔ لیکن متاثرہ فریق اور انتہائی باوثوق ذرائع کے مطابق جو تفصیلات سامنے آئی ہیں ۔یہ اصل حقائق کے عشر عشیر بھی نہیں ۔ جو تفصیلات اب تک سامنے آئی ہیں ان کے مطابق ماتمی جلوس کے دہشت گردوں نے نہ صرف نماز جمعہ کے لیئے آئے نمازیوں کو شہید کرڈالا ،بلکہ وہ مدرسے کے اندر جاکر وہاں پر موجود معصوم طلباء کواس بے رحمی سے شہید کرتے رہے۔کہ کسی کو زنجیریں مار مار کر تو کسی کو خنجروں کے وار کرکے موت کے گھاٹ اتاردیا گیا ۔واقفان حال کے مطابق ماتمی جلوس کے ان دہشت گردوں کے دل جب اس ظلم سے بھی نہیں بھرے تو انہوں نے بعض معصوم طلبہ کو ذبح بھی کرڈالا۔

دہشت گردوں کو کوسنے اور انکی مذمت کرنے کا میرے خیال میں کوئی فائدہ نہیں ۔ کیونکہ وہ تو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ آئے اور اپنی ''مشن'' کو پورا

کرکے بخیریت و عافیت چلے بھی گئے۔ وہ آئندہ بھی جب چاہیں گے اسی طرح کی ایک اور کارروائی کرکے باحفاظت چلے جائینگے۔ لیکن آفسوس اور صد آفسوس کہ جنکا کام معصوم عوام کی حفاظت کرنا تھا۔اور جنکا کام عوام کو حقائق سے باخبر رکھنا تھا۔وہ دونوں اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہے۔ نہ صرف ناکام رہے بلکہ وہ اپنے فرائض منصبی سے غداری کے مرتکب قرار پائے ہیں۔ قارئین سمجھ گئے ہونگے۔کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔میرا پہلا اشارہ متعلقہ حکومتی ذمہ داران کی طرف ہے، جو نہ صرف مذکورہ بالا حملہ روکنے میں ناکام رہے ہیں، بلکہ عالمی میڈیا کے مطابق دہشت گردی کے اس واقعے میں سرکاری اسلحے کا استعمال بھی ہوا ہیں۔ ایک اور سوالیہ نشان پنجاب بالخصوص راولپنڈی انتظامیہ کے کارکردگی کے اوپر یہ بھی ہے۔کہ جب ماتمی جلوس ہر طرف سے سیکیورٹی کے حصار میں تھا تو ان پاس خطرناک ہتھیار اور آتش گیر مادہ کہاں سے آیا؟

میرا دوسرا اشارہ پاکستان کے الیکٹرونک میڈیا کی طرف ہے۔یہ وہ میڈیا ہے۔اورانکی ذمہ داری کا حال یہ ہے۔کہ ماضی میں کراچی کے ایک علاقے میں کسی گاڑی کا ٹائر پھٹھا۔تو اسی میڈیا کے بم دھماکے کی بریکنگ نیوز چلائی۔ نہ صرف دھماکے کی نیوز چلائی، بلکہ اپنی ذرائع سے ناظرین کو یہ بھی بتادیا، کہ دھماکے کی نتیجے میں جو افراد زخمی ہوئے ہیں۔ان میں بعض کی حالت تشویش ناک ہے۔ اسی لیئے ہلاکتوں کا خدشہ بھی ہیں۔ حالانکہ ٹائر پھٹنے کی نتیجے میں ایک چیونٹی بھی نہیں ہلاک نہیں ہوئی تھی۔ یہ میڈیا اتنا باخبر ہے کہ جب کترینہ کیف

اپنے لیئے نئی ساڑھی خریدتی ہے تو سب سے پہلے خبر اس میڈیا کو ہو جاتا ہے۔اور یہ فی الفور وہ خبر عوام تک پہنچا دیتی ہے۔پاکستان کا یہ میڈیا اس قدر مستعد اور ''ذمہ دار'' ہے کہ جب انڈیا میں ممبئی حملہ ہوا۔اور انڈین اہلکاروں نے اس کے بعد کئی بے گناہ مسلمانوں کو پکڑ لیا۔تو یہی پاکستانی میڈیا تھی جنھوں نے ایک ملزم اجمل قصاب کا پورا ریکارڈ پتہ نہیں کہاں سے نکلوادیا۔جن میں تمام تر تفصیلات موجود تھیں۔کہ قصاب کب ، کہاں ، کیسے پیدا ہوا۔اور انہوں نے ممبئی میں حملے کا منصوبہ کیوں بنایا۔گویا اس میڈیا نے اپنی طرف سے ہندوستان کا ایک مشکل آسان کر دیا ، کہ اصل مجرم قصاب ہی ہے جو پاکستان سے گیا ہے۔لہٰذا عین ممکن ہے کہ اسے ائی.ایس.ائی کا معاونت بھی حاصل ہو۔لیکن اللہ پاک کا شان دیکھیں۔کہ جس وقت ہندوستان کے اعلی عدلیہ کے جج اجمل قصاب کو سزائے موت سنا رہے تھے ،تو ساتھ میں ان کے منہ سے یہ الفاظ بھی ادا ہو رہے تھے۔کہ: ہمیں اجمل قصاب کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے ، لیکن ان کو سزائے موت اس لیئے سنا رہے ہیں۔تاکہ ہندوستانی رائے عامہ کو مطمئن کیا جاسکے۔اجمل قصاب کو تو انڈیا نے پھانسی دے دی ، لیکن اس کے بعد اعلی ہندوستانی حکام نے تسلیم کیا کہ بمبئی حملے سمیت کئی دیگر حملے جو ہندوستانی مفادات پر ہوئے ،ان میں ہندوستان خود ملوث تھا۔اور اس کا مقصد خود کو مظلوم جبکہ پاکستان کو دہشت گرد ملک ثابت کرنا تھا۔یہ تو مقام شکر ہے کہ سب کچھ عیاں ہو گیا۔ورنہ پاکستانی میڈیا نے تو ''اپنی ذمہ داری''

احسن طریقے سے نبھائی تھی۔ اس کے علاوہ ملالہ یوسفزئی کو پاکستانی میڈیا نے جس انداز سے سر چڑھایا۔ وہ سب کے سامنے ہے۔ حال ہی میں امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب سید منور حسن کے ایک بات کو جس طریقے سے اس میڈیا بتنگڑ بنایا۔ اس پر بندہ اس میڈیا کو ''داد'' دیئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ تو صرف چند کارنامے ہیں ورنہ اس میڈیا نے جس طرح زیادتی کی شکار لڑکی کے خاندان کو پوری دنیا میں رسوا کیا۔ وہ اور اس کے علاوہ کئی اور کارنامے اگر قلم بند کیئں جائے۔ تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ لیکن کمال ہے کہ اس میڈیا کو راولپنڈی کے اس عظیم سانحے کی کوئی خبر ہی نہ ہوئی۔ جبھی تو دوپہر کو اہل مدرسہ و مسجد پر جو ظلم کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ میڈیا نے اس خبر کو دبائے رکھا۔ لیکن جب دیکھا کہ اب خبر کو چھپانا ممکن نہیں رہا، تو شام کو جاکر یہ خبر دے دی کہ راولپنڈی میں دو مذہبی گروہوں کے مابین تصادم ہوگیاہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے سانحے کو دو مذہبی گروہوں کا تصادم قرار دینا اپنے پیشے سے خیانت نہیں؟ اگر یہ دو گروہوں کا تصادم تھا تو کیا کسی بھی تصادم میں ایسا کبھی ہوا ہے کہ ایک گروہ کو تو خراش بھی نہ آئے۔ جبکہ دوسرے گروہ کے گلے تک کٹ جائے؟ نہیں ہر گز نہیں یہ دو گروہوں کے مابین تصادم نہیں بلکہ یہ کھلی دہشت گردی تھیں۔ جن میں جاں بحق افراد کی اصل تعداد اب تک معمہ بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ مدرسہ انتظامیہ کا کہنا ہے کہ انکے لگ بھگ تین سو طالب علم ابھی تک لاپتہ ہیں۔

ہمارے بعض نادان دوست خود بھی اس خوش فہمی میں مبتلاء ہیں ۔اور اہل وطن کی آنکھوں بھی دھول جھونکنے کی کوشش کررہے ہیں ۔کہ میڈیا نے حقائق سے پردہ نہ اٹھا کرایک اہ کارنامہ انجام دیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں اگر میڈیا اصل حقائق عوام کے سامنے لاتی تو حالات بہت خراب بھی ہو سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ سوچ دیوانے کی خواب سے کم نہیں ۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میڈیا تمام صورتحال سے عوام کو اگاہ کردیتی ۔تو وقتی اشتعال اگرچہ ضرور پیدا ہوتا ۔لیکن حالات بہت زیادہ خرابی کی طرف نہ جاتے۔ کیونکہ متاثرہ فریق کے علماء کرام اور دیگر بزرگ اپنے لوگوں کو سمجھانے کی پوزیشن میں ہوتے۔دوسری بات یہ کہ حقائق اگر میڈیا کے ذریعے سامنے لائے جاتے تو لوگ متاثرہ فریق سے ہمدردی کا اظہار بھی کرتے ۔ نتیجتا ان میں احساس محرومی جنم نہ لیتی۔ اور حالات چند دنوں میں معمول پر آجاتے۔ لیکن مقام آفسوس ہے کہ نتائج کے پرواہ کیئں بغیر حکومت و میڈیا نے اس سانحے میں بھی جامعہ حفصہؓ والی تاریخ دہرانے کی کوشش کی ہے۔ایک اور سوال یہاں یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر میڈیا کے اس طرز عمل کو ذمہ داری کا نام دیا جائے ،تو کیا کل کو اللہ نہ کرے کسی جگہ خودکش حملہ ہوجائے تو کیا یہ میڈیا اسی ذمہ داری کا مظاہرہ کرے گی ؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہرگز نہیں بلکہ وہاں یہی میڈیا گلا پاڑ کر چیخ رہا ہوگا۔ اگر کسی کو یقین نہیں آرہا تو حالات پر نظر رکھیں ۔خود ہی معلوم ہوجائے گا۔ کہ

اس میڈیا کو قومی وحدت کتنا عزیز ہے۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔اب میڈیا کو بھی چاہیں کہ وہ اپنے اس مکروہ فعل پر پردہ ڈالنے کی بجائے اپنے اس عمل سے رجوع کریں۔اور حکومت وقت کو بھی چاہیں کہ آگے.بڑھیئں زخموں پر نمک پاشی کے جائے اس پر مرہم رکھیں ۔ تیسرے ،چوتھے ہاتھ کو بھی ضرور ڈھونڈیئں ۔ لیکن جن قاتلوں کے چہرے صاف ظاہر ہیں۔ ان قانون کی گرفت میں لائیں۔ متاثرین کی دادرسی کیجئیں،اور شہداء کے اصل تعداد سامنے لائی جائے، متاثرہ دکانداروں کے نقصانات کا ازالہ کریں،نہ کہ لاشوں کو چھپایا جائے۔ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور مشائخ عظام کو ساتھ بٹھائیں ،اور قرآن و سنت کے روشنی میں تمام اختلافی امور کا جائزہ لیجئے۔اور جو جو کام جس جس فرقے کے اندر بھی قرآن و سنت کے خلاف پائے جائے۔ان تمام کاموں پر پابندی لگائی جائے۔اور اگر پھر بھی دلیل کی زبان کوئی نہ مانے تو ان سے ریاست کی زبان میں بات کی جائے۔ایران سمیت تمام پڑوسی ممالک کو سختی سے یہ پیغام دیا جائے ، کہ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت بند کردے۔اگر تو حکومت وقت ان تمام امور پر توجہ دیتی ہیں ۔تو امید ہے کہ انشاء اللہ تعالی پاکستان میں امن لوٹ آئے گا ۔لیکن اگر حکومت موجودہ روش کو ترک نہیں کرتی ۔تو پھر چاہے وہ کچھ بھی کرے حالات کا معمول پہ آنا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا۔

غیر ملکی مہمانوں کا قتل ۔ کراچی آپریشن پر سوالیہ نشان

سمجھ نہیں آتا کہ اسے اپنی بد قسمتی کہا جائے یا حکمرانوں کی بے وفائیاں ! کہ جسے اہل وطن مسیحا سمجھتے ہیں ۔ وہی رہزن بن کر اہل وطن کو لوٹنے میں لگ جاتے ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں گیارہ مئی دوہزار تیرہ کو ہونے والے الیکشن تک جائیں ۔کہ کس طرح میاں نواز شریف صاحب اہل وطن کے ساتھ عہدوں پیان میں مصروف تھے ۔ کہ اگر میں برسر اقتدار آگیا توسب مسائل حل ہو جائینگے ۔ نہ تو پھر ہم امریکہ سے ڈکٹیشن لیں گے، نہ ہندوستان کے ساتھ غیر ضروری دوستی کے پینگیں بڑھائینگے اور نہ ہی پاکستان کے معاشی شہ رگ میں دہشت گردوں کو کوئی جائے پناہ ملی گی۔ الغرض ایک سے ایک وعدہ اور ایک سے ایک حسین خواب تھے ۔ جو میاں صاحب دکھارہے تھے۔ لیکن آفسوس اور صدآفسوس کہ میاں صاحب کے تمام وعدے صحرامیں سراب ثابت ہوئے۔برسر اقتدار آنے اور وزیر اعظم منتخب ہونے کے بعد میاں صاحب بھی پرویز مشرف اورسابقہ صدر آصف علی زرداری کے راستے پر ان سے دگنی رفتار سے چلنے لگے ہیں۔مثلا اقتدار میں آنے سے پہلے میاں صاحب پاکستان کے حوالے سے امریکی پالیسی اور ان کے ڈرون حملوں کے بڑے ناقد تھے ۔ لیکن اقتدار کے مسند پر بیٹھنے کے بعد میاں صاحب اب اپنے ہی کیئں ہوئے وعدوں کے برعکس اہل وطن کو امریکہ سے ڈرانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔اقتدار میں آنے سے پہلے میاں

مقبوضہ کشمیر کے حوالے سے ایک ٹھوس اور دو ٹوک موقف رکھتے تھے۔ لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد میاں صاحب کی آنکھوں میں پاکستان کو انڈیا سے ملانے والی سرحدیں کھٹکنے لگی ۔ لہٰذا میاں صاحب لاہور میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب میں دل کی بات کو زبان پر لائے اور فرمایا کہ انکی خواہش ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے مابین ویزہ سسٹم کو سرے سے ہی ختم کیا جائے۔ واضح رہے کہ جس وقت میاں صاحب ویزہ ختم کرنے کی بات کر رہے تھے ۔ ٹھیک انہی دنوں میں ہندوستانی حکام کنٹرول لائن پر غیر قانونی دیوار بنانے کی پلاننگ کرنے میں مصروف تھے۔

جہاں تک بات ہے کراچی کی تو اہل کراچی کے درد کا نہ تو کل کسی نے مداوا کرنے کی کوشش کی ۔ اور نہ ہی موجودہ نواز حکومت نے ۔ بلکہ نواز حکومت بھی اپنے پیشرو حکومت کی طرح اہل کراچی کے زخموں پر نمک پاشی کرنے مصروف ہیں ۔ اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ جہاں کل زرداری اور اس کے اتحادیوں کے دور حکومت میں دس، پندرہ لاشیں روز گر رہی تھیں ۔ چند دن کے وقفے سے آج نواز حکومت میں بھی روزانہ اتنی ہی لاشیں گر رہی ہیں ۔ یہاں ایک ممکنہ اعتراض کا جواب بھی دیتا چلوں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ امن وامان تو صوبائی مسئلہ ہے ۔ پھر وفاق پر تنقید کیسے ؟ تو اس، بات میں کوئی شک نہیں کہ امن وامان صوبائی مسئلہ ہے لیکن کراچی والے اس حوالے سے خاصے بدقسمت ثابت ہوئے ہیں ۔

کہ گزشتہ دور حکومت میں صوبے میں جو پارٹیاں برسر اقتدار تھیں ۔ انہی پارٹیوں سے منسلک دہشت گردوں نے اپنی اپنی سیاسی مفادات کے لیئے اہل کراچی کا خون بے دریغ بہایا۔ پھر جب موجودہ حکومت برسر اقتدار آئی تو انھوں نے یعنی مرکزی حکومت نے سندھ حکومت کو اعتماد میں لیکر کراچی میں اپریشن شروع کیا۔ اور اس کے بارے میں پل پل کی رپورٹ وزیر اعظم کو پیش کی جانے لگی ۔ گو کہ مرکزی حکومت اپریشن کے رفتار اور اسکے نتائج سے کافی مطمئن نظر آ رہی ہے۔ لیکن حقائق بہر حال اس کے برعکس ہے ۔ اور اس بارے میں کراچی کے صورتحال پر گہری نظر رکھنے والوں نے اپریشن شروع ہوتے ہی کہا تھا۔ کہ یہ دہشت گردوں کے خلاف اپریشن نہیں بلکہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش ہیں ۔ ان لوگوں نے درست کہا تھا کہ یہ سب ٹوپی ڈرامہ ہے ، کیونکہ جتنا قتل عام اس سے پہلے والی حکومت کے دور میں تھا۔ اتنا ہی آج ہے ۔ بلکہ موجودہ دور اس لحاظ سے زیادہ باعث تشویش ہے کہ شہر کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہزاروں اہلکاروں کی موجودگی کے باوجود معصوم لوگوں کا قتل عام جاری ہے ۔ اور اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ روز تو پاکستانی شہری اس شہر میں دہشت گردوں کے ہاتھوں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں ۔ لیکن جو سانحہ منگل تین دسمبر کو اس شہر میں پیش آیا اس نے تو اہل وطن کو جنجھوڑ کرکے رکھدیا ہیں۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق ناظم آباد کے ایک مسجد کے باہر دہشت گردوں کی فائرنگ سے جو چار افراد جاں بحق ہوئے تھے ان میں برادر

اسلامی ملک مراکش سے اہل خانہ کے ہمراہ تبلیغی دورے پر آئے ہوئے دو مہمان علماء کرام خطاب الدعلا اور عبدالمجید شامل تھے ۔دیگر دو جاں بحق افراد میں ایک انکا مترجم قاری حنیف جبکہ ایک وہاں کا مقامی رہائشی سلمان بھی شامل تھا۔ سوال یہ ہے کہ تبلیغی جماعت جن کے نہ کوئی سیاسی مقاصد ہیں ،اور نہ ہی وہ کسی کے مفاد کے خلاف کوئی کام کرتے ہیں ۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنے وقت اور اپنی پیسوں کی قربانی دیکر اللہ پاک اور اس کر رسول حضرت محمدؐ کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لیکن انکے ارکان کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اخر ان دو غیر ملکی مہمانوں کے قتل کے بعد مسلم دنیا ہمیں کس نظر سے دیکھی گی ؟ کیا پیغام گیا ہوگا ان کے اپنے ملک اور ان کے خاندانوں میں پاکستان اور اہل پاکستان کے بارے میں ۔ کسی نے سوچا ہے اس بارے میں ،یا ہے کسی کو اس بارے میں کوئی فکر؟ میرے خیال میں ہر گز نہیں کیونکہ یہ امریکن یا یورپین شہری نہیں تھے ۔اور نہ ہی یہ سی آئی اے یا ایف ۔بی۔آئی کے مہمان تھے ۔کہ حکومت انکی خاطر مدارت کرتی۔ بلکہ وہ بیچارے تو مسلمان اور اللہ پاک کے مہمان تھے ۔اور اس ملک میں اللہ پاک کے مہمانوں کو کون پوچھتا ہے۔ ان غیر ملکی مہمانوں کو امید ہے کہ اپنے اللہ کے ہاں بہتر جگہ ملا ہوگا۔ لیکن ایک سوال پاکستانی متعلقہ اداروں کے ذمہ داران اور وزیر اعظم پاکستان سے یہ کہ اخر اس پیارے وطن اور بالخصوص شہر کراچی میں آپ کبھی امن کے لیئے سنجیدہ ہو کر بھی کوشش کرینگے ۔ یا اہل وطن اور اہل شہر کے ساتھ

یونہی امن کے نام پر ٹوپی ڈرامہ ہوتا رہیگا۔۔؟

پاکستان کو بچانے کی سزا

انیس سو سینتالیس کو جب مسلمانوں کی لازوال قربانیوں کے بعد جب پاکستان معرض وجود میں آیا۔تو بعض لوگوں اس پاک وطن کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی بجائے آستین کی سانپ کا کردار ادا کیا۔اور شروع دن سے اس وطن کے حصے بخرے کرنے میں مصروف ہوگئے ۔اس سلسلے کو سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں غدار وطن شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ زبان تحریک کی شکل میں شروع کیا۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے متحدہ پاکستان کی قیادت پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔یک طرفہ پروپیگنڈے اور ہندوستانی پشت پناہی کے سبب جب انیس سو ستر کے انتخابات میں شیخ مجیب کی جماعت کو مشرقی پاکستان میں اکثریت مل گئی ۔تو شیخ مجیب الرحمٰن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ کیونکہ اب انکو ''منزل'' قریب نظر آنے لگی۔لہٰذا انہوں نے کھل کر پاکستان کو تقسیم کرنے کی منصوبے پر کام شروع کیا اور مکتی باہنی ''جو عوامی لیگ کے ہندوستانی تربیت یافتہ گوریلہ رضاکار تھے'' کے ذریعے محب وطن پاکستانیوں کو نشانہ بنانا شروع کردیا۔ ایک ایسے وقت میں جب محب وطن پاکستانی شدید خطرات سے دوچار تھے، جماعت اسلامی کے رضاکار ڈٹ کر انڈین ایجنٹوں کے سامنے دیوار بن گئے۔ بعد میں جب حالات زیادہ خراب ہوئے اور افواج پاکستان کو بغاوت کچلنے کے لیئے کارروائیاں کرنی پڑی۔ تب بھی جماعت اسلامی کے رضاکار پیچھے

نہ رہے۔اور انہوں نے کھل ملک بچانے کی خاطر پاک فوج کا ساتھ دیا۔ بد قسمتی سے ہم اس وقت ملک بچانے میں کامیاب تو نہ ہوسکے۔اور ہتھیار ڈالنے کے بعد ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم بھی کرلیا۔ لیکن اس تمام عرصے میں جماعت اسلامی نے ثابت کر دیا کہ وطن کی دفاع میں وہ کسی بھی قربانی اپنے لیئے باعث اعزاز سمجھتی ہیں۔ بہر حال بنگلہ دیش بننے کے بعد جماعت اسلامی نے نہ صرف اسے تسلیم کرلیا۔ بلکہ عملی سیاست میں حصہ لیکر ملک کو ہندوستانی سیاسی و ثقافتی اثرات سے صاف کرنے کی نہ صرف پوری کوشش کی بلکہ مختلف وقتوں میں جب بھی حکومت و اپوزیشن میں رہی انہوں نے ملکی تعمیر ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بنگلہ دیش جب بن گیا تو وہاں کے مسلمان اس بات پر خوش ہر گز نہ تھے۔لہٰذا بنگلہ دیش کے قیام کے تقریباً ڈھائی سال بعد جولائی انیس سو چوہتر میں وہاں سیلاب آیا اور اس سے نظام زندگی درہم برہم ہوگیا تو عوام نے اسے موقع غنیمت جانتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ جس کے ہنگامے پھوٹ پڑے اور بڑے پیانے پر مظاہرے شروع ہوئے۔چودہ اور پندرہ اگست انیس سو پچھتّر کی درمیانی شب فوج نے شیخ مجیب کا حکومت ختم کردیا۔اور چند فوجیوں نے مل کر مجیب الرحمٰن کو اہل خانہ کے ہمراہ قتل کر دیا۔ لیکن مجیب الرحمٰن کی بیٹی شیخ حسینہ واجد بچ گئی۔ یہی حسینہ بعد میں سیاست میں آئی۔ حسینہ واجد کی ہمیشہ جھکاو ہندوستان کی طرف رہاہے۔ لیکن جب وہ اخری دفعہ وزیراعظم بنی تو اس نے مسلمانوں بالخصوص

پاکستان سے نفرت کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ انہوں نے ہندوستانی مشاورت سے غیر قانونی جنگی جرائم کا ٹریبونل قائم کیا اور اس کے لیئے یہ من گھڑت جواز پیش کیا۔ کہ انیس سو اکہتر میں پاکستان کے دفاع کرنے والے جماعت اسلامی کے ہمدرد آزدی بنگلہ دیش کے غدار ہیں لہٰذا ان ٹریبونل میں ان پر مقدمات چلیں گے۔ ان ٹریبونل کے قیام کے بعد پوری دنیا بشمول اقوام متحدہ نے اس کے قانونی حیثیت پر کئی سوال اٹھائے۔ لیکن بنگلہ دیشی وزیر اعظم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کیونکہ انکی طرف سے ان ٹریبونل کے قیام کا مقصد ہی یہی تھا کہ اس کے ذریعے جماعت اسلامی سے وابستہ افراد کو سزائیں دی جاسکے۔ تاکہ ہندوستان کو خوش کیا جاسکے۔ ان ٹریبونلز نے جماعت اسلامی کے کئی ارکان کو عمر قید اور پھانسی کی سزائیں سنائی۔ ان میں جماعت کے بزرگ ترانویں سالہ غلام اعظم کو جب عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ تو کئی اطراف سے اسکی مذمت کی گئی۔ لیکن آفسوس کہ جس پاکستان کی بقا کا جنگ لڑتے ہوئے جماعت کے لوگ اس ''انجام'' تک پہنچے اس پاکستان نے بنگلہ دیش کو روکنے کی بجائے یہ کہہ کر انہیں مزید شہ دی کہ یہ بنگلہ دیش کا اندرونی'' معاملہ ہے۔ حالانکہ اگر عدل و انصاف سے کام لیا جاتا تو یہ ہر گز'' بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ جن لوگوں کو آج موت کی سزاوں اور عمر قید کا سامنا ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات کے لیئے نہیں بلکہ اسی پاکستان کے لیئے آواز بلند کیا تھا۔ جس پاکستان کے حکمران آج ان کے لیئے دو بول بولنے کی بھی ہمت نہیں

کر رہے۔ پاکستانی کی اس انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویئے اور ہندوستان محبت سے محبت کی نتیجے میں بنگلہ دیش حکام اب اتنے شیر ہوگئے کہ انہوں پاکستان کو بچانے کی کوشش کرنے والے جماعت اسلامی کے ایک بزرگ ملا عبدالقادر کو پھانسی دیکر شہید کردیا۔ واضح رہے کہ ملا عبدالقادر کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ رحم کی درخواست کرے۔ لیکن سلام ہے اس عظیم شہید کو کہ اسنے زندگی سے محبت کی بجائے پاکستان سے محبت کا ثبوت دیا۔ ملا عبدالقادر نے ثابت کردیا کہ انکا انیس اکھتر کو انکی طرف سے کرنے والا اقدام درست تھا۔اور اس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں۔انکی پاکستان سے محبت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کہ جس پاکستان کی وجہ سے وہ پھانسی چڑھنے والے تھے، تختہ دار پر کھڑے ہوکر بھی اس نے اسی پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی دعا میں یاد رکھا۔ان کا یہ اقدام ہمارے حکمرانوں کی منہ پر ایک زوردار طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے منہ سے پاکستان کی محبت میں نکلے الفاظ دراصل انکی طرف سے پاکستانی حکمرانوں اور ارمی چیف کے ضمیر جھنجوڑنے کی کوشش تھا۔ جن میں وہ یہ پیغام دے رہے تھے کہ ”کہ میں تو موت کے دروازے پر کھڑے ہوکر بھی پاکستان سے محبت کو اپنے لیئے اعزاز سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ لوگ پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک بن کر بھی اس ملک اور ان سے محبت کرنے والوں سے وفا نہیں کررہے“۔ ملا عبدلقادر شہید اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ جنکے جدائی کا درد آج پاکستان بھر میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سوائے اقتدار کے ایوانوں میں۔

لہٰذا آئیں اختتام کالم پر اپنے اللہ سے یہ دعا مانگتے چلیں کہ: یا اللہ ملا عبدالقادر کی شہادت قبول فرمائیں اور پاکستان کے حکمرانوں کے دلوں میں اغیار کی بجائے وطن اور اہل وطن سے محبت کا جذبہ پھر سے بیدار فرمائیں۔ آمین۔

امیر مقام پر حملہ

چند دن پہلے خیبر پختون خواہ کے ضلع شانگلہ کے علاقے مارتونگ کے قریب پاکستان مسلم لیگ نواز خیبر پختون کے صدر اور وزیر اعظم کے مشیر انجینئر امیر مقام پر ہونے والے حملے میں اگرچہ امیر مقام بچ گئے تھے۔ لیکن اس حملے کے بعد بعض حلقوں کی جانب سے یہ باتیں سامنے آرہی ہے۔ کہ: امیر مقام پر ہونے والے حملے کے بعد طالبان اور حکومت کے مابین ہونے والے ممکنہ مزاکرات کے دروازے بند ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لیکن کیا ایسا واقعی ہوگا؟ یا پھر یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر واقعی مذاکرات ہونے جارہے ہیں ''کیونکہ میرا نہیں خیال کہ مذاکرات ہورہے ہیں۔ یا فریقین اس کے لیے کوئی تیاری کررہے ہیں،، تو پھر اس واقعے کی وقوع پزیر ہونے کے بعد بھی مذاکرات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بشرطیکہ حکومت اس واقعے کو بلاوجہ انا کا مسئلہ نہ بنائے۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ حملہ نواز حکومت یا ان کے کسی فرد پر نہیں کیا گیا۔ میرے اس بات سے شائد بعض قارئین کو تعجب ہوا ہو کہ میں اخر کس بنیاد پر یہ بات لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ حملے کے وقت امیر مقام نہ صرف وزیر اعظم کے مشیر تھے۔ بلکہ وہ خیبر پختوں خواہ کے لیے نواز لیگ کے صوبائی صدر بھی تھے۔

اس بات می کوئی شبہ نہیں کہ حملے کے وقت امیر مقام کے پاس نواز لیگ اور انکی حکومت کے دو اہم عہدے تھے۔ لیکن ہمیں یہ بات ہیں بھولنی چاہیئں کہ ان عہدوں کے علاوہ ایک اور عہدہ بھی انجینیئر صاحب کے پاس تھا۔ اوراس عہدے یا ''رشتے،، سے انہوں کبھی انکار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نواز لیگ جوائن کرتے وقت بھی۔

وہ عہدہ یا رشتہ اخر کیااور کس کے ساتھ ہے؟ جسکی وجہ سے امیر مقام اتنے شدید خطرات سے دوچار ہیں۔ کہ ان کے اوپر اب تک نصف درجن حملے ہو چکے ہیں۔ اور نہ جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ تو قارئین کرام ! وہ رشتہ ہے پرویز مشرف کے ساتھ دوستی اور اسے بھائی بنانے کا۔ جی ہاں ! مجھے یاد ہے کہ جس وقت پرویز مشرف کا طوطی بولتا تھا۔ اس وقت کئی دیگر ضمیر فروشوں کی طرح امیر مقام بھی ''پرویزی کرامات،، سے خوب مستفید ہوئے۔یہ 2002 کی عام انتخابات سے کچھ پہلے کی بات ہے۔ الیکشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ انجینیئر امیر مقام شانگلہ کے قومی اسمبلی سے متحدہ مجلس عمل کے متفقہ امیدوار تھے اور اسکی کامیابی کے لیے مذہبی طبقہ خصوصاً ائمہ کرام اور جماعت اسلامی کے کارکنان دن رات کمپیئین چلاتے رہے۔ جسکے نتیجے میں ایک ایسا شخص بھاری اکثریت سے کامیاب ہوا کہ جس کا سیاسی میدان میں کوئی جان نہ پہچان۔۔جی ہاں !

امیر مقام کہ جن کے نام کا آج ہر طرف چرچہ ہے۔اور جو پاکستانی سیاست کہ ایک لازم جز بن چکا ہے۔اس وقت سیاست کے میدان میں باالکل نووارد تھے۔لیکن جماعت اسلامی کے ضلعی شوریٰ نے ان کو منتخب کرکے ایم۔ایم۔اے کی پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی کا ممبر بنادیا۔ 2002کے عام انتخابات کے بعد متحدہ مجلس عمل نے اپوزیشن میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔جس کے کچھ ہی دنوں بعد امیر مقام نے مذہبی جماعتوں کے ووٹوں پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کے قائم کردہ پاکستان مسلم لیگ قائدِ اعظم المعروف ق لیگ میں شمولیت اختیار کی۔حالانکہ اصولاً امیر مقام کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔لیکن اگر اسے جانا بھی تھا تب بھی اسے اسمبلی رکنیت سے استعفیٰ دیکر دوبارہ الیکشن لڑکر جانا چاہیئے تھا۔اس لیے کہ جن ووٹوں سے موصوف قومی اسمبلی میں جا بیٹھے تھے۔وہ ووٹ انکے ذاتی نہیں بلکہ متحدہ مجلس عمل کے ووٹ تھے۔

قارئین کرام سے معذرت کہ میں اصل موضوع سے کچھ دیر کے لیے ہٹ گیا۔بہر حال قاف لیگ میں جانے کے بعد امیر مقام پر پرویز مشرف نے خصوصی نظرکرم کیا۔پہلے اسے وفاقی کابینہ میں مشیر جبکہ بعد میں وزیر بنادیا گیا۔اس کے علاوہ بھی پرویز مشرف نے انجینئر موصوف کو اپنا بھائی بھی قرار دیا۔بھائی بھی اتنا خاص بنایا کہ اس اپنا ذاتی پستول تک تحفے میں دے دیا۔یہاں پر بات صرف یک طرفہ عنایات پر نہیں رکی۔بلکہ فریق ثانی نے بھی بھرپور حق وفاداری ادا

کیا۔ یہاں تک کہ ایک ایسے وقت میں کہ جب پرویز مشرف اسلام اور اسلام پسندوں کے خلاف کھل کر میدان میں اترا۔ تب بھی امیر مقام نے انکو پوجنا باعث سعادت جانا۔ یہاں تک کہ خیبر پختون کے ضلع بٹگرام میں ہونے والے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں اچھل اچھل کر فخریہ انداز میں کہا۔ کہ میں پرویز مشرف کا ایجنٹ ہوں کیونکہ بقول مقام صاحب کے وہ اسلام کا ایجنٹ ہے۔ بہر حال ''اسلام کے اس ایجنٹ،، کا کشتی جب ڈوبنے لگی تو ایک ایک کرکے ان سے سب لوگ اترگئے تو امیر مقام بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے نہ تو مشرف سے ''روحانی،، تعلق توڑا اور نا ہی کبھی اس حوالے سے کسی قسم کی پشیمانی کا اظہار کیا۔ دوسری طرف پاکستان کے سیاسی جماعتوں نے بھی اس حوالے سے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی۔ بلکہ جس کو جہاں سے ''لوٹے،، ملتے گئے۔ اس نے وہاں سے حاصل کرکے اپنی اپنی پارٹی میں شامل کردیئں۔ حالانکہ ان بڑی سیاسی جماعتوں خصوصاً نواز لیگ، پی پی پی اور پاکستان تحریک انصاف کے رہنماوں کو چاہیے تھا۔ کہ وہ یہ فیصلہ کرتے کہ پرویز مشرف کا جو بھی ساتھی ان کی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ان کے لیے لازم ہوگا کہ وہ پرویز مشرف سے لاتعلقی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ عوام سے بھی اپنے ان کرتوتوں کی معافی مانگیں گے جو انہوں نے مشرف سے ساتھ تعاون کی صورت میں کیئں ہیں۔

میرے خیال میں اگر سیاسی جماعتیں مندرجہ بالا باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ''لوٹوں کے حوالے سے پالیسی بناتے تو انکے دو فائدے بہر صورت سامنے آتے ۔پہلا یہ کہ ،، مشرف کے پکے وفادار بھیس بدل کر ان میں شامل نہ ہوتے اور دوسرا یہ کہ جو لوگ پاک صاف ہو کر آتے ان پر آج حملوں کا خطرہ نہ ہوتا۔ بہر حال جو ہو چکا سو ہو چکا ۔ابھی حکومت وقت کو چاہیے کہ جس مشرف کی پالیسیوں کی وجہ سے آج وطن عزیز ہر طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس مشرف کی ساتھیوں کو اپنی پارٹی سے اور انکی پالیسیوں کو وطن عزیز سے نکال کر اس مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی مملکت بنانے میں کردار ادا کریں ۔ کہ اسی میں دنیاوی سکون بھی ہے اور اخروی خوشیاں بھی۔ لیکن اگر حکمرانوں نے پرویز مشرف کے ساتھیوں کو پاس بٹھائے اور انکی پالیسیوں کو جاری رکھا۔ تو پھر نہ تو اس دنیا میں ہم امن سے رہ سکیں گے اور نا ہی آخرت میں عافیت کے ساتھ ۔ لہٰذا اب یہ مسند اقتدار پر بیٹھے اہل اقتدار کی مرضی ہے کہ وہ ان میں کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

تبلیغی مرکز دھماکہ۔ ناکام خارجہ پالیسی کا شاخسانہ

خیبر پختون کے شہر پشاور کو ایک مرتبہ پھر خون میں نہلا دیا گیا۔ اس بار ظالموں نے ایک ایسے طبقے کو اپنی دربدگی کا نشانہ بنایا۔ جو نہ تو سیاست کے گر جانتی ہے اور نا ہی مسلح جدوجہد کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ بلکہ انکا منشور یہی ہے۔ کہ دعوت کے ذریعے سے اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کے پیغام کو پوری دنیا میں عام کر دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ دہشت گردوں کے رحم و کرم پر ہیں۔

پاکستان میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے۔ کہ تبلیغی جماعت کو ٹارگٹ کیا گیا ہو۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے کراچی کے علاقے ناظم آباد میں بھی تبلیغی جماعت سے وابستہ دو غیر ملکیوں سمیت چار افراد جاں بحق ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے سوات کے تبلیغی مرکز میں بھی پر اسرار دھماکہ ہوا تھا۔ جن میں کافی جانی نقصان ہوا تھا۔ لیکن ہوا کیا؟ وہی نا جو پاکستان میں کسی بھی سانحے کے بعد ہوتا ہے۔ یعنی سیاسی جماعتوں کی جانب سے دہشت گردوں کی مذمت کرنا۔ دہشت گردوں کو کوسنا اور حکومت کی جانب سے دہشت گردوں کی گرفتاری کا عزم کرنا۔ اور یہی سب کچھ پشاور کے تبلیغی مسجد میں دھماکے کے بعد سننے کو مل گیا۔ کہ ہم اس

دھماکے کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔دہشت کسی قسم کی بھی رعایت کے مستحق نہیں اور یہ کہ ہم انہیں کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔سیاسی جماعتوں اور حکومتی ذمہ کے ان بیانات کو سن سن کر عوام کے کان پک گئے ہیں۔ لیکن نہ تو آج تک حکومت کسی ذمہ دار کو کیفر کردار تک پہنچا سکا ہے اور ہی آئندہ کوئی امکان نظر آتا ہے۔

پاکستان میں اگر جاری دہشت گردی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ زیادہ پرانا نہیں۔11/9 سے پہلے کی پاکستان پر اگر نظر دوڑائی جائے تو نظر یہ آتا ہے۔کہ یہاں پر نہ تو کوئی خودکش حملوں سے واقف تھا اور نا ہی ڈرون حملوں کو کوئی جانتا تھا۔11/9کے بعد امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے صلیبی جنگ کے ایک مرتبہ پھر شروعات کرتے ہوئے جب افغانستان پر چڑھائی کا فیصلہ کرلیا۔تو اس کام کے لیے اس نے ہمارے ’’کمانڈو،، کو اپنا ہم نوا بنالیا۔کمانڈو بھی کیا کمانڈو تھا۔پاکستانی عوام ،مذہبی رہنماوں اور دانش وروں نے لاکھ سمجھایا۔کہ امریکہ کا ساتھ دینا کسی بھی طور پاکستان کے مفاد میں نہیں اور یہ کہ مستقبل میں پاکستان کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑسکتا ہے۔لیکن ’’کمانڈو،، امریکی طاقت اور ٹیکنالوجی سے اتنا مرعوب تھا۔کہ اس نے کسی کی نہیں سنی اور امریکہ کا بھرپور ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

کمانڈو نے ایک طرف تو افغانی مسلمانوں کے قتل عام کرنے کے لیے امریکہ و ناٹو کو پاکستانی فضائی، زمینی اور سمندری حدود حوالے کئیں۔ تو دوسری طرف مظلوم افغانوں کی مدد کرنے کی پاداش میں امریکہ کے کہنے پر غیور قبائیلیوں پر بھی چڑھائی کر دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب با قاعدہ طور پر امریکی مفادات کا جنگ پاکستان میں لڑی جانے لگا۔ اس موقع پر محب وطن حلقوں کی جانب سے کمانڈو پرویز مشرف کو باز رکھنے کی پوری کوشش کی گئی لیکن افسوس کہ وہ نہیں مانے۔ مشرف کے جانے کے بعد جب پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کی حکومت آئی۔ تو تب قوم کو یہ امید ہو چلی تھی کہ شائد اب پاکستان کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی آئیگی اور قوم کو امریکی جنگ سے چھٹکارا مل جائیگا۔ لیکن افسوس کہ اہل وطن کی امیدیں بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔ بلکہ پی پی پی حکومت نے اپنے پیشرو مشرف سے بڑھکر امریکہ کا ساتھ دیا۔ پی پی پی حکومت نے پہلی بار امن کمیٹیوں اور لشکروں کو تحریک طالبان پاکستان کے خلاف میدان میں اتار لیا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیرستان میں شروع کردہ جنگ پورے ملک میں پھیلنے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی غیر ملکی طاقتیں بھی میدان میں اتر گئیں۔ نتیجتاً وطن عزیز میں ہر طرف افرا تفری کا دور دورا ہو گیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادی حکومت کے ناکام پالیسیوں سے جب عوام بیزار آ گئے۔ تو انہوں نے عام انتخابات 2013 میں پی پی پی اور اس کے اتحادیوں

کو مسترد کرتے ہوئے دائیں بازو کی جماعتوں کو ووٹ دیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان مسلم لیگ نواز بر سر اقتدار آئی۔ نواز حکومت نے جب کام کا آغاز کیا۔ تو فیملی بیک گراونڈ اور انتخابی وعدوں کے سبب اہل وطن اپنے مستقبل سیکافی پر امید تھے۔ لیکن آفسوس اور صد آفسوس کہ موجودہ حکومت نے اغاز ہی میں جس راستے کا انتخاب کیا۔ اس سے اہل وطن کے سب خواب کانچ کے ٹکڑوں کے مانند کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے۔ قوم کو ہر گز اور ہر گز یہ امید نہ تھیں کہ نواز شریف صاحب بھی سابقہ حکمرانوں کی طرح اپنے عدوں کا لاج نہیں رکھے گا۔ بلکہ قوم بجا طور پر میاں صاحب سے یہ توقع رکھتی تھیں۔ کہ میاں صاحب نہ صرف خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کریں گے، بلکہ وہ سابقہ لٹیروں کا بھی بھر پور احتساب کرینگے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ ہاتھی کے کھانے کی دانت اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ سو بد قسمتی سے پاکستانی عوام کے ساتھ بھی ہاتھی والا معاملہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ اقتدار میں آنے کے بعد لگ ہی نہیں رہا۔ کہ یہ وہی نواز شریف ہے جو الیکشن سے پہلے دکھائی دیتا تھا۔

آج پشاور کے تبلیغی مرکز میں ہونے والے دھماکے کے بعد جس پر چاہے اسکا الزام لگادو۔ لیکن حیقیت بہر حال یہی ہے۔ کہ پشاور دھماکہ ہو یا کراچی میں مفتی عثمان یار خان سمیت دیگر اہل وطن کا قتل۔ اس کے پیچھے ہمارا یہی ناکام خارجہ پالیسی ہے۔ جسے ہم نے گذشتہ 15 سال سے گلے لگا رکھا ہے۔ کیونکہ یہ ایک

ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس پالیسی کی وجہ سے ہم نے اپنی ساری توجہ اور توانائی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ پر لگا رکھی ہے۔ نتیجتاً کئی ممالک بشمول بعض دوست ممالک مسلسل وطن عزیز کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ لیکن ہم پھر بھی حقائق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں پورے وثوق سے یہ بات سپرد قلم کر رہا ہوں ۔ کہ حکومت اور ایجنسیاں چاہے کچھ بھی کرلے۔ ہر مسجد، ہر مدرسے، سکول، کالج یا پھر بازاروں میں جتنی چاہے سیکیورٹی لگائے۔ لیکن جب تک حقیقی دوست اور حقیقی دشمن میں ہم تمیز نہیں کرینگے۔ مسائل جوں کے توں رہینگے۔ لہٰذا حالات کو صحیح ڈگر پر لانے کے لیے ہمیں امریکہ کو خیرباد کہنا ہوگا۔ خارجہ پالیسی تبدیل کرنا ہوگا۔

بھوکے مزدور اور معاشی ترقی کا خواب

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے۔ اسی وجہ سے ملکی خزانے میں سب سے زیادہ پیسہ کراچی ہی سے جاتا ہیں۔ یقین سے کہا جاسکتا ہیکہ اگر خدانخواستہ کراچی کے انڈسٹریل زونز بند ہوجائے۔ تو ملک ایک ہفتہ بھی آگے نہیں چل سکتا۔ یہی وجہ ہیکہ کراچی ملک کا معاشی شہ رگ کہلاتا ہے۔ اس شہر میں 4 بڑے اہم صنعتی زون K.I.A کورنگی انڈسٹریل ایریا، S.I.T.E سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ، لانڈھی انڈسٹریل ایریا اور نیو کراچی انڈسٹریل ایریا کے نام سے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ E.P.Z یعنی ایکسپورٹ پروسیسنگ زون بھی کراچی کے علاقے لانڈہی میں واقع ہے۔ ان بڑے صنعتی زونز میں بلاشبہ لاکھوں افراد دن رات مختلف شفٹوں میں کام کرکے ملکی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان بڑے صنعتی زونز کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے کارخانے گھریلو صنعت کے طور پر بھی رواں دواں ہیں۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس پورے سسٹم کو بڑی محنت جانفشانی سے چلا رہے ہیں۔ لیکن ایک اہم مسئلہ کہ جس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہیں۔ وہ یہ کہ جن کے دم سے یہ پورا نظام رواں دواں ہیں۔ وہ خود کس حال میں ہیں۔ کیا وہ لوگ جو ملک کو خوشحال رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ خود بھی خوشحال ہیں؟

تو اسکا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ وہ لوگ یعنی وہ مزدور طبقہ جنکے دم سے یہ سب کچھ زندہ ہے۔ خود اس حال میں ہیکہ وہ نہ زندہ ہے اور نہ مردہ۔ یعنی ان لوگوں میں بہت کم تعداد کو وہ سہولیات میسر ہے۔ جو پاکستان کے لیبر قوانین کے تحت ان کا بنیادی حق ہے۔ آج ہزاروں صنعتی یونٹس میں کام کرنے والے لاکھوں ملازمین میں سے کے سہولیات میسر ہیں۔ جبکہ SESSI اور EOBI صرف 20 تا 30 فیصد افراد کو اکثریت ان بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ یہی وجہ ہیکہ یہ لاکھوں مزدور نہ تو اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتے ہیں۔ اور نا ہی ان کو مستقل ملازمت کا کوئی ضمانت حاصل ہے۔

اور اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہیکہ جو ادارے ان مزدوروں کے حقوق کے محافظ ہیں۔ وہ بجائے مزدوروں کو ان کے حقوق دلانے کے ان کے مالکان کے ساتھ ملکر ان کے حقوق غصب کرنے کی منصوبے بنارہے ہوتے ہیں۔ جن کے بدلے ان کو مستقل بنیادوں پر ان سرمایہ داروں کی جانب سے لفافے مل رہے ہوتے ہیں۔ جن کے ناجائز کاموں مین یہ ادارے اور اس سے وابستہ لوگ ان کے معاون کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ وزارت محنت اور ان کے ماتحت اداروں کی غفلت کا نتیجہ ہیکہ آج کئی ایسی فیکٹریاں موجود ہیں، جن میں محنت کشوں سے 8,8 گھنٹے ڈیوٹی لینے کی بجائے 12,12 گھنٹے کی ڈیوٹی لی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دیگر فیکٹریاں ایسی بھی ہے۔ جو مقررہ حکومتی تنخواہ ”جو کہ 8 گھنٹے ڈیوٹی کے حساب سے 10000

ہزار روپے مہینہ ہے،، نہیں دیتے۔ بلکہ ہر کمپنی میں انتظامیہ نے من چاہی تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہیکہ آج ملکی معاشی پہیہ چلانے والے مزدور طبقہ شدید بے چینی کا شکار اور اذیت میں مبتلاء ہیں۔ مہنگائی کے اس دور میں اس وقت صورتحال یہ ہیکہ مزدور طبقہ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے سارا دن ڈیوٹی کرنے کے بعد بھی اس کوشش میں ہوتا ہیں۔ کہ رات کے وقت میں بھی ان کو کہیں نہ کہیں پارٹ ٹائم کام مل جائے۔ تاکہ انکے گھر کا چولہا بجھنے نہ پائے۔ دو وقت کی روٹی کے حصول میں شدید مشکلات کا شکار یہ طبقہ خود یا گھر میں کسی کے بیمار ہونے کی صورت میں بھی دہرے تکلیف میں مبتلاء نظر آتا ہیں۔ وہ اس لیے کہ پرائیویٹ ہسپتال میں علاج کے لیے ان کے پیسے نہیں ہوتے، جبکہ سرکاری ہسپتالوں میں بدانتظامی و شدید رش کی وجہ سے زیادہ وقت خرچ ہونے کے باعث ان مزدوروں کو کام سے چھٹی کرنا پڑتا ہیں۔ جسکا خمیازہ انہیں تنخواہ میں کٹوتی کی صورت میں بگھتنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو معیاری تعلیم دلانا ان کے لیے کسی خواب سے کم نہیں۔ جبکہ بچیوں کی شادی یا دیگر غمی، خوشی کے مواقع پر جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے جو کچھ ان مزدور طبقے کے دلوں پر گزرتا ہیں۔ وہ یہ مزدور ہی بہتر جانتے ہیں۔ ایک خوشحال ادمی اس قسم کے حالات کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ ایسے میں حکومت کی جانب سے ملک کو معاشی طور پر مضبوط بنانے کا خواب، خواب ہی ہو سکتا ہے حقیقت نہیں۔ لہٰذا ملک کو معاشی طور پر مضبوط بنانے کے لیے لازم ہیکہ حکومت وقت

دیگر پہلووں کے ساتھ ساتھ ملکی معاشی پہیہ چلانے میں ریڑھ کی ہڈی جیسے حثیت رکھنے والے ان لاکھوں مزدوروں کی فلاح و بہبود اور محفوظ مستقبل کے لیے فوری طور اقدامات کریں۔ کیونکہ مضبوط معیشیت خوشحال مزدور کے بغیر ممکن نہیں۔

خون کے پیاسے

قرآن کریم میں اللہ پاک کا فرمان عالی شان ہے۔ کہ: مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کروادیا کرو۔ (سورۃ الحجرات: 10) لیکن لگ ایسا رہا ہے کہ روشن خیال دانشوروں نے تو جیسے پکا عہد کر رکھا ہے کہ اس حکم قرآنی کے بر خلاف ہر وہ کام کرینگے جس سے دو مسلمان مزید باہم دست و گریبان ہو جائیں۔ اور ان میں کبھی بھی صلح نہ ہونے پائیں۔ مثلاً: ہم دیکھ رہے ہیں کہ وطن عزیز پاکستان پچھلے دس سال سے پرویزی دور کی ناقص پالیسیوں کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ جسکی وجہ سے ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک تقریباً ایک لاکھ سے زائد پاکستانی جاں بحق ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ادھے وہ ہیں جو بم دھماکوں، خودکش حملوں اور دیگر تخریبی کارروائیوں کے نذر ہوئے۔ جبکہ باقی ادھے وہ ہیں جو مختلف اپریشنز، امریکی ڈرون حملوں سمیت دیگر تخریبی کارروائیوں کے نتیجے میں مٹی کی خوراک بن گئے۔ ان جاں بحق پاکستانیوں میں اوالذکر نصف پاکستانیوں کی شہادت سے ہر کوئی باخبر ہیں۔ اور انکا ذکر اکثر و بیشتر مختلف لوگوں کی زبانی سننے کو ملتا ہے۔ جبکہ اخرالذکر گمنامی کے ساتھ شہادت کے درجے پر فائز ہوئے۔ اور انکا ذکر بہت کم سننے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ پرویز کے شروع کردہ پالیسیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان میں افواج پاکستان کے سینکڑوں

آفیسرز اپنے ہزاروں جوانوں سمیت جبکہ کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے سینکڑوں کمانڈر اپنے ہزاروں رضاکاروں سمیت شامل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہیکہ سب سے پہلے پاکستان والے نعرے کی آڑ میں امریکی جنگ کا حصہ بننے کے بعد پاکستان کو کوئی فائدہ بھی حاصل ہوا یا کہ پاکستان مسلسل خسارے میں جارہا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر باقی تمام نقصانات کو ایک سائڈ پر رکھ کر صرف جانی نقصانات پر بات کی جائے تو یہ بھی پاکستان کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اور اسکا ازالہ ہم کبھی بھی نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ جو جنگ اس وقت پاکستان میں برپا ہے۔ اس میں ہار جیت کا کوئی تصور موجود ہی نہیں۔ وہ اس لیے کہ یہ تو دو بھائیوں کی جنگ ہے۔ اور دو بھائیوں کی جنگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری تو رہ سکتی ہے لیکن نتیجہ خیز کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے محب وطن حلقے اور درد دل رکھنے والی شخصیات شروع دن سے اس کوشش میں مصروف ہیکہ جیسے بھی ہو اس جنگ کا خاتمہ بذریعہ مکالمہ کردیا جائے۔ ایسی کئی کوششیں ماضی میں طالبان اور مختلف حکومتوں کے مابین کی جاچکی ہیں۔ جن میں بعض امن معاہدوں کی صورت میں کامیاب بھی ہوئی تھیں۔ لیکن ماضی کی حکومتوں کا امریکہ کے طرف واضح جھکاؤ، مختلف این جی اوز اور امریکی مداخلت کے باعث کوئی بھی امن معاہدہ دیرپا ثابت نہیں ہوسکا۔ اب جبکہ ملک میں ایک محب وطن جماعت برسراقتدار ہے۔ تو وہ حلقے جو چاہتے تھے کہ ملک میں جاری خون ریزی کا خاتمہ باہمی گفت و شنید سے ہوجائے۔ ایک بار پھر میدان میں اترے۔ یہ ان حلقوں کی

انتھک محنت کا نتیجہ تھا کہ حکومت وقت اور تحریک طالبان پاکستان نہ صرف ایک بار پھر مذاکرات کے لیے آمادہ ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے اپنے طرف سے مذاکرات کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کے لیے مذاکراتی کمیٹیاں بھی تشکیل دیئں۔ لیکن آفسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ جس دن سے دونوں کمیٹیوں نے کام شروع کیا ہے۔ اس دن سے بعض قوتیں جن میں ہمارے ملک کے ''روشن خیالِ،، دانشور بھی شامل ہیں۔ اس پورے عمل کے خلاف میدان میں اتر گئیں ہیں اور انکی پوری کوشش ہیکہ جیسے بھی ممکن ہو اس پورے مذاکراتی عمل کی بوریاں بستر لپیٹ کر شالی وزیرستان میں ایک نہ ختم ہونے والا اپریشن شروع کیا جائے۔

گوکہ مذاکراتی عمل کے شروع کے ابتدائی دنوں میں ایسے حلقوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اب لگ ایسا رہا ہیکہ فریقین کی جانب سے تحمل و برداشت کی کمی اور مذاکراتی کمیٹیوں بالخصوص حکومتی مذاکراتی کمیٹی کے غیر محتاط رویئے نے '' میر جاکر،، جیسے لوگوں کاکام آسان کردیا ہے اور وہ اب مزید ڈھٹائی کے ساتھ مذاکراتی عمل کے خلاف میدان میں اتر چکے ہیں۔ مذاکراتی عمل کو اب تک جو سب سے برادھچکہ لگ چکا ہے۔ وہ مہمند ایجنسی میں 23 ایف سی اہلکاروں کے قتل کی شکل میں ہیں۔ جس کے بعد حکومتی کمیٹی نے طالبان کمیٹی سے اکوڑہ خٹک میں ہونے والا ملاقات منسوخ کردیا۔ گوکہ اس عمل کا ہر جانب سے بھرپور مذمت کیا جاچکا ہے۔ اور یقیناً اس کا مذمت ہونا بھی چاہیے۔ لیکن

دوسری طرف طالبان نے اس حوالے سے جو توجیہ پیش کی ہے۔ اسے بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ایک ایسے وقت میں کہ جب نواز حکومت تمام تر اندرونی و بیرونی دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے مذاکرات کے لیے تیار ہے۔ تو دوسری جانب تحریک طالبان بھی نیک نیتی کے ساتھ مذاکرات کے لیے کمربستہ ہے۔ لہٰذا ایسے میں فریقین کو چاہیئے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں اور اگر درمیان میں کوئی ناخوشگوار واقعہ اللہ نہ کرے رونماہ ہوجائے۔ تو بجائے ایک دوسرے سے روٹھنے کے مذاکراتی کمیٹیوں کو ایک دوسرے سے ایسے واقعات کا وضاحت طلب کرنی چاہیے۔ کیونکہ مذاکراتی کمیٹیوں کی مینڈیٹ میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ وہ خود فریق بن کر بیٹھے۔ بلکہ انکا مینڈیٹ اس بات کا متقاضی ہیکہ وہ اس راستے میں ہر آنے والے رکاوٹ کو دور کرکے اصل فریقین کو ایک میز پر لانے کی کوشش کریں۔ کہ ایک ثالث کا کام بہر حال یہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ طالبان کو بھی چاہیئں کہ پہلے آپس میں اتفاق رائے پیدا کرلے پھر میدان میں اترے۔ اور جو گروپس انکی بات نامانے تو وہ انکے حوالے سے بھی کوئی واضح مؤقف اپنائے۔ دوسری طرف حکومت وقت کو بھی چاہیئے کہ وہ مذاکرات کے حوالے سے پیدا شدہ ابہام کو دور کریں اور اصل حقیقت عوام کے سامنے لائی جائے۔ وہ اس لیے کہ بعض معتبر حلقے یہ کہہ رہے ہیں کہ حکومت مذاکرات کے لیے سنجیدہ نہیں بلکہ اتمام حجت کے لیے مذاکرات کے نام پر کھیل کھیلا جارہا ہے۔ جبکہ دوسری جانب فوج کو تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ فریقین کی جانب سے ان دو باتوں کا

وضاحت آنے بعد مذاکراتی کمیٹیوں کو چاہیے کہ وہ فی الفور فریقین کو جنگ بندی پر آمادہ کرلیں۔ کیونکہ جب ایک دفعہ جنگ بندی کا اعلان ہو جائے۔ تو پھر کسی فریق کے لیے اسے توڑنا اتنا آسان نہ ہوگا۔ آخر میں انسانی خون کے پیاسے روشن خیالوں کے نام صرف اتنا ہی کہ انسانی جانوں کا کچھ تو احترام کیجیے۔ اور انکو اپس میں لڑانے کے لیے راہ ہموار کرنے کی بجائے کالم کے ابتداء میں تحریر کردہ حکم قرآنی کے مطابق ان میں صلح کرانے کے لیے کردار ادا کیجیے۔ ورنہ آخرت کے عذاب کے لیے تیار رہئیں۔

جعلی مسلمان

اس بات میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ پاکستان کے قیام سے لیکر اب تک جن جن لوگوں نے ہم پر حکمرانی کی ہیں۔ ان میں اکثریت کے سینے خوف خدا اور حب وطن سے خالی نظر آئے۔ اور شائد یہی وجہ ہیکہ آج اکیسویں صدی جیسے ترقیافتہ دور میں بھی پاکستان انتہائی اہم اور بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی میں باقی دنیا سے کافی پیچھے ہے۔ آج پاکستان کے کسی بھی شعبے پر اگر نظر ڈالی جائے تو بہتری کے اثار بہت کم نظر آتے ہیں۔ تعلیم، صحت، صاف پانی، امن و امان کی صورتحال سمیت کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہیکہ جس کے بارے میں بندہ کوئی اچھا امید قائم رکھے۔ لیکن سوال یہ ہیکہ یہ سب کچھ آخر ہم اہل پاکستان کا مقدر کیوں؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہم عوام کا بھی بہت بڑا قصور ہے۔ اقبال نے تو بہت پہلے کہا تھا کہ :

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔

تو بات ہی دراصل یہ ہے کہ عوام خود ہی نہیں چاہتی کہ انکے حالات سدھر جائیں۔

اب جب عوام ہی اپنی ذمہ داریاں نبھانے سے قاصر ہو جائے تو پھر تو

نااہل حکمرانوں کا ہمارے اوپر مسلط ہونا باعث تعجب نہیں۔ اور یہی کچھ آجکل ہو رہا ہے کہ نہ عوام صحیح اور نا ہی حکمران۔ مثلاً: پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اسی نظریئے کی وجہ سے ہی آزادی وطن کے وقت لاکھوں لوگوں نے خوشی خوشی جان دے دی۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری قربانیوں سے بننے والا ملک پاکستان کل اسلام کا قلعہ اور دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے دکھوں کا مداوا بنے گا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج ہر پاکستانی کو کردار کے لحاظ سے غازی ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ نظریہ پاکستان اور بزرگوں کی قربانیوں کا ہم سے اول روز سے ہی یہ تقاضہ ہیکہ ہم اس پاک وطن میں کوئی ایسا کام نہ کریں، جن سے شیطان اور اس کے چیلے خوش ہو جائے۔ لیکن افسوس کہ ایسا کچھ نہ ہو سکا جس کے لیے ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دی تھیں۔ مثال کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ اس سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ ہم کس جانب محو پرواز ہیں۔ (1) کچھ دن پہلے خبر آئی تھی کی مزار قائد کے عین نیچے جہاں قائد کا قبر موجود ہے، اس قبر کے برابر والے کمرے میں نوجوان جوڑے روز پیسے دیکر ''پیاس،، بجھانے آتے ہیں اور فراغت حاصل کرنے کے بعد تشریف لیکر چلے جاتے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مزار قائد کا انتظام و انصرام کس کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ ایسا کوئی کام ان کے تعاون کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ بقول شاعر کہ : گھر کو آگ لگ گئی گھر کی چراغ سے (2) رکن پارلیمان جمشید دستی نے انکشاف کیا ہیکہ پارلیمنٹ لاجز میں سالانہ چار، پانچ کروڑ روپے کی شراب پی

اور پلائی جاتی ہیں۔ جناب دستی نے اس حوالے دو، تین نام بھی افشاء کیئں ہیں بلکہ انہوں نے اس حوالے سے ثبوت بھی اسپیکر قومی اسمبلی کے حوالے کر دئیں ہیں۔ جمشید دستی کے ان انکشافات کے بعد بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ: آئین پاکستان کے تحفظ کا حلف اٹھانے والوں کا دامن کس قدر داغدار ہیں۔ لیکن اس سے بڑھکر جو بات آفسوس ناک ہے۔ وہ یہ کہ جو ارکان اس ''کار خیر،، میں حصہ لے چکے ہیں۔ ان کو منتخب کرنے والے ہم عوام ہی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیکہ ہم اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ ایک اور خاص بات کہ جسکی وجہ سے میں یہ کالم لکھنے پر مجبور ہوا وہ ایشیاء کپ کے پاکستان بمقابلہ بنگلہ دیش کے حوالے سے نظر قارئین ہیں۔ منگل 4 مارچ کو جو میچ پاکستان نے بمقابلہ بنگلہ دیش کھیلا۔ وہ اس لحاظ سے تو اچھا تھا کہ پاکستان جیت گیا تھا۔ لیکن اسکا جو آفسوس ناک پہلو ہے اسے بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہیں۔ جس وقت مذکورہ میچ نے سنسنی خیز شکل اختیار کیا۔ اس وقت کراچی میں عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ لیکن آفسوس کہ مسلمانان پاکستان کے ایک بڑے طبقے نے اذانوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی وہ بدستور کھیل سے ''لطف اندوز،، ہوتے رہے۔ ایک بات جو میں نے خود نوٹ کی۔ وہ یہ کہ ایک مسجد سے جب حی علی الصلوۃ کی صدا بلند ہوئی، تو عین اسی وقت قریب ہی واقع ہوٹل سے تالیاں بجانے کی زوردار آواز کے ساتھ زبردست نعرے بازی کی گئیں۔ شائد اس وقت شاہد آفریدی نے کوئی زوردار اسٹروک کھیلا تھا۔ اس کے بعد جب جماعت کھڑی

ہونے کا وقت قریب آیا تو میں نے دو چار مساجد کا سروے کیا۔ آپ یقین کیجیئے کہ دو مساجد میں نمازیوں کی تعداد بالترتیب پانچ اور چھ رہی۔ جبکہ آخری مسجد جس میں مین نے خود بھی نماز آدا کی اس میں بمشکل تمام ایک صف ہی نمازیوں سے بھر گیا تھا۔
حالانکہ عام دنوں میں اس مسجد میں تین ، ساڑھے تین صف نمازی موجود ہوتے ہیں۔
ان مساجد کے قریب جو دو ہوٹل واقع ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تین سو سے لیکر ساڑھے تین سو تک تماش بین ان دو ہوٹلز میں موجود تھے اور انہوں نے یہ بھی نا سوچا کہ قریب ہی واقع مساجد میں نماز ہو رہی ہیں بلکہ وہ بدستور شور غوغا کرتے ہوئے میچ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کچھ اور علاقوں میں موجود دوستوں سے جب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس دن مساجد میں نمازیوں کی شدید قلت رہی۔ واضح رہے کہ ان دنوں ، کراچی کے بیشتر علاقوں میں عشاء کی نماز 8 بجکر 30 منٹ پر ادا کی جاتی ہیں۔
نماز اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے اور علماء کرام فرماتے ہیکہ مرنے کے بعد سب سے پہلا سوال نماز ہی کے متعلق کیا جائے گا۔ لیکن ہم اس اہم اور بنیادی ذمہ داری سے کس قدر غافل ہیں اسکا اندازہ آپ مذکورہ بالا واقعے سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ جب ایک انتہائی اہم فریضے کی بجاآوری سے ہم بحیثیت مجموعی قاصر ہیں۔ تو پھر ہمارا یہ رونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا کہ ہمارے حالات ٹھیک نہیں۔ للہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے حالات درست ہوجائے تو سب

سے پہلے ہمیں خود کو ٹھیک کرنا ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے ٹوٹا ہوا تعلق دوبارہ جوڑنا ہوگا۔
اگر ہم نے اللہ پاک سے اپنی گناہوں کی معافی مانگ لی تو امید ہیکہ وہ عظیم ذات بھی
ہمارے اوپر رحم کردے گا۔ لیکن اگر ہم یونہی غفلت میں پڑے خواب خرگوش سوئے
رہے تو پھر خطرہ ہے کہ کہیں اللہ پاک کا عذاب ہم پر نازل نہ ہوجائے۔

23 مارچ 1940 وہ جذبہ کہاں سے لائے

خاص برائے 23 مارچ

جو قدم مسلمانان ہند اٹھانے جارہے تھے، وقت کے اعتبار سے وہ قدم اٹھانا اتنا آسان ہرگز نہ تھا۔ کیونکہ ایک طرف انگریز اپنے خلاف ایک طویل جدوجہد کے بعد مسلمانان ہند کے خون پینے کی متمنی تھے تو دوسری طرف ہندو اپنی سفاک اور مکارانہ فطرت کی وجہ سے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے غلام بنانے کی خواہش دلوں میں رکھتے تھے۔ ایسے میں اگر وہ تحریک جو مسلمانان ہند نے ایک آزاد اسلامی فلاحی مملکت کو بنانے کے لیے شروع کی تھیں۔ اگر وہ کسی بھی لمحے ناکامی سے دوچار ہوجاتی تو پھر بڑے سخت دن برصغیر کے مسلمانوں کے منتظر ہوتے۔ لیکن یہ مسلمانان ہند کے عزم واستقامت اور اللہ پاک پر غیر متزلزل ایمان کا نتیجہ تھا کہ وہ کسی بھی ممکنہ خطرے کی پرواہ کئیں بغیر نہایت جوش وجذبے کے ساتھ اس منزل کی جانب بڑھ رہے تھے جسکا نام پاکستان تھا۔ مسلمانان ہند نے اپنے قائدین کو کہ رکھا تھا کہ آپ قدم بڑھائیں قوم اپکو ہرگز مایوس نہیں کریگی کیونکہ انہیں اپنے رہنماؤں میں آزادی حاصل کرنے کی تڑپ اور اخلاص صاف نظر آرہا تھا۔ دوسری طرف اگر ہم ان رہنماؤں کو دیکھتے

ہیں تو وہ بھی اپنے مشن سے مخلص اور عوامی امنگوں کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ ان قائدین کے ہاں عوام کو دھوکہ دینا یا انکی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا کوئی رواج آج کی طرح سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ یہی وجہ تھا کہ جب مسلمان رہنماؤں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب ہم بحیثیت قوم ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے، بلکہ ہم اپنے لیے ایک الگ ملک جو اسلامی اصولوں پر قائم ہو لے کر رہیں گے۔ تو پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح نہایت ہی قلیل عرصے میں مسلمان اپنے لیے ایک الگ ملک لینے میں کامیاب ہوئے۔

یہ مارچ 1940 کی بات ہے کہ جب مسلمان آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس کے انعقاد کے سلسلے میں لاہور کے منٹو پارک (اقبال پارک) میں اکٹھے ہوئے۔ 22 مارچ کو یہ اجلاس شروع ہوا اور 24 مارچ تک چلتا رہا۔ اس اجلاس کی وجہ شہرت تو وہ تاریخی قرارداد بنی جو 23 مارچ کو شیر بنگال مولوی فضل الحق (پورا نام مولوی ابوالقاسم فضل الحق) نے انگریزی زبان میں پیش کی۔ جسکا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے پیش کیا اور اگلے دن یعنی 24 مارچ کو یہ قرارداد منظور ہوئی۔ یہ قرارداد، قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح سمیت دیگر سرکردہ رہنماؤں نے بھی خطاب کیا۔ گو کہ ہر رہنماء کی تقریر جگہ کی کمی کی وجہ سے پوری تحریر کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ان سب کے خطبات کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مسلمان اور ہندو صرف دو الگ

الگ قوموں کے نام ہی نہیں بلکہ دونوں کے نظریئے، عبادات، طرز معاشرت، حتیٰ کہ سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا بحیثیت قوم مسلمانوں کا انکے ساتھ اکٹھے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ محمد علی جناح کے تاریخی صدارتی خطاب کے وہ الفاظ تو پورے قوم کے لیے مشعل راہ ہیں، جس میں انہوں نے دیگر باتون کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ ان دو اقوام یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں میں کسی ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن اور کسی ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہوتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ایک ایسے وطن کو حاصل کرنا اب لازم ہوچکا ہے، جس میں وہ اسلامی اقدار کے مطابق زندگی گزار سکے۔ ان قائدین نے ان مسلمانوں کو بھی اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا تھا، جنکے لیے پاکستان بننے کے بعد یہاں آنا ممکن نہ تھا، بلکہ انہیں ہندوستان میں ہی رہنا پڑتا۔ سر عبداللہ ہارون نے ہندو لیڈران کو مخاطب کرکے کہا کہ اگر ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا گیا تو ہم اس پر بالکل بھی خاموش نہیں رہینگے۔ الغرض ایک عزم و ولولے کے ساتھ یہ اجلاس منعقد ہوا جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ یہی وجہ رہی کہ قرارداد کی منظوری کے بعد چند سال کے اندر ہی مسلمان ایک آزاد اسلامی مملکت کے حصول میں کامیاب ہوئے۔

قارئین محترم! یہ اس وقت کے مسلمانوں اور مسلمان رہنماؤں کی شبانہ روز محنت

اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے انتہائی نامساعد حالت میں بھی ہمت نہ ہاری اور لاکھوں جانوں کا نظرانہ پیش کرکے یہ وطن اس لیے آزاد کرایا کہ یہاں مسلمان قرآن و سنت کے تعلیمات کی روشنی میں زندگی بسر کریں گے۔ لیکن آفسوس اور صد آفسوس کہ انکا خواب ہمارے ناقص پالیسیوں ، غیر منصفانہ رویوں اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑنے کی وجہ سے اب تک شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ آج وہ ملک کہ جسے اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے ہمارے بزرگوں نے لاکھوں قربانیاں دی تھیں، عالمی طاقتوں اور انکے مقامی ایجنٹوں کا اکھاڑہ بن چکا ہے۔ آج اس ملک کے طاقتور طبقے جن میں سیاستدان افواج پاکستان کے بعض ذمہ داران اور بالخصوص پاکستانی میڈیا شامل ہیں۔ ہمیں انڈیا ، کے جارحانہ عزائم اور ناپاک ارادوں سے خبردار کرنے کی بجائے ہمیں یہ باور کرارہے ہیں کہ ماضی میں جو ہوچکا سو ہوچکا۔ اب موجودہ دور انڈیا سے دشمنی کا نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوستی کا ہے۔ آج انڈیا دنیا میں اسلحے کا سب سے بڑا خریدار بن رہاہے، وہ ہمارے پانیوں پر قبضہ کررہاہے، پاکستان میں دہشت گردی کو ہوا دے رہاہے، افغانستان میں بیٹھ کر ہمارے خلاف منصوبے بنارہاہے اور مسلمانون کے قاتل نریندر مودی کو وزیر اعظم بنانے کی تیاری کررہاہے۔ لیکن ہمارے بعض سیاستدان اور میڈیا کے کرتا دھرتاؤں کو یہ سب کچھ نظر نہیں آرہا۔ بلکہ انکو زندگی کے تمام تر لوازمات انڈیا سے تجارت اور ہندوستان کے ساتھ فنکاروں کے وفود کے تبادلوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ہمارے سیاسی ''

رہنماء،، مختلف فیسٹیولز میں ہندوستانی حسیناؤں کے اوپر تو لاکھوں روپے نچاور کردیتے ہیں لیکن دوسری طرف انکے عین ناک کے نیچے بھوک اور افلاس سے جاں بحق ہونے والے معصوم بچے اور انکی آہ وزاری کرتی مائیں نظر نہیں آتی۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہیکہ ہم نے بحیثیت قوم دو قومی نظریئے کو بھلادیا ہے۔ آج ہم نے اپنے ذہنوں میں یہ بات بٹھادیا ہیکہ کہ انڈیا کے جارحانہ عزائم سے پردہ اٹھانا اور انکے آگے بند باندھنا ہمارا کام نہیں بلکہ یہ کام تو صرف مذہبی پارٹیوں یا اسلامی تنظیموں کا ہے۔ حالانکہ یہ سوچ ٹھیک نہیں کیونکہ یہ ملک ہم سب کا ہے اور اسکی حفاظت کرنا ہم سب کی یکساں ذمہ داری ہے۔ للہذا آئیں اور امن کی آشا جیسے غیر حقیقی تصورات کے پیچھے پڑکر دو قومی نظریئے کی تضحیک کرنے کی بجائے 23 مارچ 1940 والا عزم دوبارہ پیدا کیجئے اور تعمیر پاکستان کے بعد تکمیل پاکستان میں بھرپور حصہ لیجیے۔ جہاں تک بات ہے ہندوستان کے ساتھ دوستی کا۔ تو یقین کیجیے کہ سب چاہتے ہیکہ پڑوسی ممالک بشمول انڈیا کے ساتھ ہمارے تعلقات بہتر ہوں۔ لیکن اس کے لیے لازم ہیکہ انڈیا اپنے رویئے پر نظرثانی کرے۔ اور پاکستان کے خلاف سازشیں کرنا چھوڑ دیں، مقبوضہ علاقے خالی کردیں، انڈین مسلمانوں کو انکا حقوق دے دیں اور سب سے بڑھکر اکھنڈ بھارت کا خواب چھوڑدے۔ تو انڈیا یقیناً پاکستان کا ایک اچھا اور مفید پڑوسی بن سکتا ہے۔

ملت کے غداروں کو پہچانیں

ذرا تصور تو کریں کہ اگر تحریک طالبان پاکستان خیبر پختون خواہ کے دارالحکومت پشاور میں وطن عزیز پاکستان کے خلاف ایک ریلی نکالتے۔ اس ریلی کو صوبے کی مذہبی جماعتیں سپورٹ کرتیں اور وہاں کی حکمران جماعت پاکستان تحریک انصاف انہیں مکمل سیکیورٹی اور تحفظ فراہم کرتیں تو پھر کیا ہوتا؟؟؟ وہی ناں کہ سیکولر سیاسی جماعتیں آستین چڑھائے پارلیمنٹ ہاؤس میں طالبان کے خلاف فوری فوجی اپریشن کا مطالبہ کرتیں، بعض نام نہاد مذہبی ٹولے سڑکوں پر طالبان کے خلاف مظاہروں کا اہتمام کرتے، راتوں کو رنگین بنانے کی خاطر جام کے جام پینے والے بعض ''بزرگ،، کالم نگار اپنے کالموں میں بھرپور ''دلائل اور ثبوتوں،، کے ساتھ طالبان کو ملک دشمن اور امریکہ، ہندوستان و اسرائیل کے ایجنٹ ثابت کرتے جبکہ پاکستان کے ''غم،، میں دن رات رونے والی سول سوسائٹی کی اراکین عاصمہ جہانگیر، فرزانہ باری اور حنا جیلانی وغیرہ رال ٹپکاتے ہوئے ٹی وی ٹاک شوز میں اس بات پر پورا زور دیتی کہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے یہ تو آئین پاکستان کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ وطن سے بغاوت بھی ہے۔ للذا اب حکومت کو نہ صرف خود زور شور سے فوجی اپریشن کرنا چاہئیں بلکہ ''محسن پاکستان،، امریکہ کو بھی چاہیے کہ وہ ڈرون حملوں کے ذریعے طالبان

کو ملیامیٹ کردیں اور پاکستان سے وفاداری کا ثبوت دیں۔ لیکن آفسوس کہ ذکر کردہ مذکورہ بالا کرداروں کو اپنا جذبہ حب الوطنی جگانے کا موقع اس لیے نہ مل سکا کہ پاکستان مخالف ریلی کا انعقاد تحریک طالبان نے نہیں بلکہ راجہ داہر کے پیروں کاروں نے کیا تھا۔

23 مارچ 2014 کو جب ملک کے طول و عرض میں مذہبی تنظیمیں اور دائیں بازوں کی سیاسی جماعتیں دو قومی نظریے کو اجاگر کرنے کے لیے ریلیاں اور کانفرنسز کا انعقاد کر رہی تھیں جن میں پاکستانی قوم بھرپور طریقے سے شریک رہی۔ عین اسی دن دوپہر کے وقت سندھ کی آزادی اور یہاں سے دوسری قومیتوں کے لوگوں کو مار بھگانے کا منشور رکھنے والی جماعت جیئے سندھ قومی محاذ نے کراچی کے مشہور و معروف ایم اے جناح روڈ پر فریڈم مارچ کا انعقاد کیا۔ اس مارچ میں جسقم کے علاوہ انکی دیگر ہم خیال پارٹیاں بھی شریک رہی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جسقم نے اس مارچ کا انعقاد سندھی عوام کے احساس محرومی کے ازالے کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ ان کا مقصد پاکستان کو توڑنا تھا۔ اسی لیے وہ برملا سندھ کی آزادی اور پاکستان کی مخالفت میں نعرے لگا رہے تھے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق مارچ کے شرکاء نہ صرف ''پاکستان کا جو یار ہے وہ غدار ہے،، کے نعرے لگارہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ افواج پاکستان کے خلاف بھی نعرے بازی کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ جو سب سے آفسوسناک بات سامنے آئی ہے وہ یہ کہ جیئے

سندھ قومی محاذ کے رہنماء کھل کر امریکہ، انڈیا اور اسرائیل جیسے اسلام دشمن ملکوں سے مدد طلب کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مارچ کے شرکاء نے بعض لوگوں پر تشدد بھی کیا اور ایم اے جناح روڈ پر مختلف جماعتوں کے یوم پاکستان کے حوالے سے لگائے گئے بینرز اور جھنڈے بھی اتار کر زمین پر پھینکتے رہے۔ واضح رہے کہ جس وقت جسقم اور اسکے اتحادی پاکستان کو عالمی امن کے لیے خطرہ اور امریکہ اسرائیل و انڈیا کو اپنے نجات دہندہ قرار دے رہے تھے اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت نے انکی حفاظت کے لیے بھاری تعداد میں سیکیورٹی اہلکار تعینات کر رکھے تھے جو پاکستان کے خلاف اسٹیج کیئیے گئے اس ڈرامے کے اختتام تک پاکستان مخالف ''اداکاروں،،اور انکے چیلوں کی حفاظت احسن طریقے سے کرتے رہے۔

جئے سندھ قومی محاذ اور اس کے اتحادی تو اس پیارے وطن کے خلاف زہر اگلتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے جہاں اب عین ممکن ہے ان ممالک نے ''جنہیں جسقم اپنے لیے نجات دہندہ تصور کرتے ہیں،، ان سے رانطہ قائم کرلیا ہوگا۔ لیکن یہاں پر چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو متعلقہ حلقوں اور لوگوں کی پیش خدمت ہیں۔ (1) پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے جواں سالہ رہنماء جو طالبان کو ملک دشمن اور اسلام دشمن کہتے نہیں تھکتے۔ اس ڈرامے پر جو جسقم نے 23 مارچ کو رچایا کیا کہیں گے۔ حالانکہ طالبان نے آج تک وطن عزیز

پاکستان کے خلاف ریلی نکالنا تو دور کی بات اس طرف کوئی اشارہ بھی نہیں دیا ہے، جبکہ جسقم نے ڈنکے کی چوٹ پر پاکستان کو توڑنے کی بات کی ہے۔ (2) وہ سیاستدان اور میڈیا پرسنز جو ہر بات پر ائین پاکستان کا حوالہ دیتے ہیں اور جنہوں نے کچھ عرصہ قبل امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب سید منور حسن کی ایک بات کا خوب بھتنگڑ بنایا۔ کیا وہ بتانا پسند کریں گے کہ جو کچھ جسقم نے کراچی میں کیا۔ کیا ائین پاکستان اس کا اجازت دیتا ہے اگر نہیں تو تم اب تک اس اہم مسئلے پر لب کشائی سے گریزاں کیوں ہو۔ (3) سول سوسائٹی اور ''انسانی حقوق،، کے علمبرداروں کے نام تو صرف اتنا ہی کہ اگر مذہبی جماعتوں کے اندر ''دہشت گرد،، ڈھونڈنے سے کچھ فرصت ملے تو خدارا جو کچھ 23 مارچ جیسے اہم دن کے موقع پر پاکستان مخالف عناصر نے بابائے قوم سے منسوب سڑک پر کیا۔ اس پر بھی کم از کم دو لفظ ہی بول دیں۔ (4) سندھ کے صوبائی حکومت اور وفاقی حکومت دونوں کی خدمت میں عرض ہے کہ اس ملک کے عوام کو آپ امن دے سکے نہ روٹی اور پانی۔ لہٰذا اب اگر آپ کو دوست اور دشمن کی پہچان بھی نہیں اور آپ اس ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے تو پھر خدارا اقتدار کسی اہل فرد یا جماعت کے حوالے کرکے آپ آرام فرمالیں کیونکہ یہ ملک اب مزید ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اخر میں سندھی عوام کو سلام پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ہر قسم کی تکلیف تو

برداشت کرلی ہے لیکن کبھی قوم پرستوں کو گھاس نہیں ڈالی اور مجھے امید ہے کہ اگے چل کر بھی علیحدگی پسندوں کے ارمان کبھی پورے نہیں ہونگے اور ہمارے سندھی بھائی اس پیارے وطن کی عظمت کے خاطر انکی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند کھڑے ہوں گے۔ انشاء اللہ

امن کا پیغام۔۔۔ لیکن کس کے نام؟

ایک طرف حکومت تحفظ پاکستان جیسے متنازعہ ارڈیننس اسمبلی میں پیش کرنے کی خواہش رکھتی ہے تو دوسری طرف اس ارڈیننس کے حوالے سے مختلف اعتراضات اور خدشات بھی سامنے آرہے ہیں۔ ان خدشات ظاہر کرنے والوں میں دیگر طبقات کے علاوہ مدارس کے منتظمین بھی شامل ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت مختلف حیلے بہانوں اور اصلاحات کے نام پر مدارس کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی لیے وفاق المدارس جو کہ دیوبند مدارس کا نمائندہ تنظیم ہے کھل کر میدان میں آچکا ہے اور اس حوالے سے وفاق نے اب تک پنجاب کے شہر ملتان، سندھ کے شہر کراچی، بلوچستان کے شہر کوئٹہ اور خیبر پختون خواہ کے پشاور میں پروگرام بھی منعقد کیں ہیں۔ باقی شہروں میں اس حوالے سے جو اجتماعات یا جلسے منعقد ہوئے اس بارے میں تو خیر آنکھوں دیکھا حال بتانے سے میں اس لیے قاصر ہوں کہ میں ان میں موجود نہیں تھا۔ لیکن سندھ ریجن کے لیے اس سلسلے کا جو اجتماع ”پیغام امن و عظمت مدارس دینیہ،، کے عنوان سے ملک کے معروف تعلیمی ادارے جامعہ دارالعلوم کراچی میں ہوا۔ میں اس میں شریک رہا۔ اس کانفرنس میں کیا باتیں ہوئی اور منتظمین نے کس جوش و جذبے کے ساتھ مدارس کے تحفظ کرنے کا اعادہ کیا۔ یہ میرے آج کے کالم کا موضوع نہیں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ میرے

ذہن میں جو دیگر باتیں ہیں۔ وہ قارئین سے شئیر کروں تاکہ کسی نہ کسی طرح یہ باتیں منتظمین وفاق کی نظروں سے گزریں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہے کہ سندھ سطح پر ہونے والے کانفرنس کا عنوان تھا'' پیغام امن و عظمت مدارس دینیہ،، لہٰذا اس پیغام ہی سے لگ رہا تھا کہ اس کانفرنس میں جو گفتگو ہوگی وہ اسی پیغام امن کے بارے میں ہوگی تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں مدارس کے حوالے سے مختلف حلقوں یا اداروں کی جانب سے جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں ہیں۔ اس کا ازالہ ہوجائے اور ان کو معلوم ہوجائے کہ مدارس کس طرح بنا کسی لالچ کے ملکی عوام اور ملک کی نظریاتی سرحدوں کا جس جانفشانی کے ساتھ خدمت و حفاظت کر رہا ہے۔ اس حوالے سے قابل قدر مقررین حضرات نے بالخصوص وفاق المدارس کے سیکرٹری جنرل قاری حنیف جالندھری نے نہ صرف مدلل تقریر کی۔ بلکہ انہوں نے مختلف اعداد و شمار کے ذریعے پاکستان کے دینی مدارس کا موازنہ دنیا کے دیگر دینی مدارس اور پاکستان کے عصری تعلیمی اداروں سے کیا اور یہ ثابت کردیا کہ کس طرح انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے پاکستان کے دینی مدارس باقی تعلیمی ادروں سے سبقت لیئے ہوئے ہیں۔ گو کہ پروگرام میں شریک تمام محترم مقررین نے باتیں تو بڑی اچھی اور مفید قسم کے کردی تھیں لیکن میرے خیال میں اس کا وہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکے گا جس کا ان دنوں مدارس سمیت تمام محب وطن لوگوں کو ضرورت ہے۔ یہ فائدہ کیوں حاصل نہیں

ہوسکے گا؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دو وجوہات ہیں۔ (1) پروگرام منتظمین نے عام لوگوں کو اس کانفرنس میں مدعو نہین کیا تھا حالانکہ ان کو چاہیے تھا کہ وہ اس سلسلے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نامور شخصیات کے سوا عام لوگوں کو بھی اس کانفرنس میں شریک کرنے کا اہتمام کرتے اور جامعہ کی جس جگہ پر اس اجتماع کا انعقاد کیا تھا اسکے بجائے دارالعلوم کے وسیع و عرض گراؤنڈ میں اس کا اہتمام کرتے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ معاشرے کے بااثر شخصیات آپ کے کردار اور اپ کے نظم و نسق کو جب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو پھر شائد ان کو حقائق جھٹلانے میں اتنی آسانی نہ ہوتی۔ دوسرا فائدہ عام لوگوں کی شرکت سے یہ ہوتا کہ ایک رائے عامہ آپ کے حق میں ہموار ہوتا۔ اور رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کرنا جتنا آج ضروری ہوچکا ہے اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ (2) پروگرام میں میڈیا کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ حالانکہ ابلاغ کی اہمیت کے بارے میں ہمارے بزرگ ہمیشہ قائل رہے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ اتنے بڑے پروگرام کے لیے میڈیا مدعو کیون نہیں کی گئی۔ جہاں تک بات ہے چند اخبارات کے نمائندگان کی شرکت کا تو عرض یہ ہیکہ اسلامی اصولون کے تحت صحافت سے منسلک ادارے تو ویسے بھی آپ کے ساتھ ہوں گے کیونکہ ان کا منشور انہیں اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ وہ اتنے اہم پروگرام کو نظر انداز کریں۔ لیکن ضرورت اس کا تھا کہ آپ ان کو بلاتے جو پروپیگنڈے کے اس جنگ میں آپ کے خلاف ہراول دستے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہوتا کہ

ہم جو پروپیگنڈہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ حقیقت بہر حال اس کے برعکس ہے۔ لیکن بد قسمتی سے منتظمین نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی یا توجہ دینا ضروری نہیں سمجھی۔ اور پروگرام میں 98 فیصد وہ لوگ شریک رہے جو مدارس سے وابستہ ہیں اور جنہیں اپنے بارے میں صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت تھی ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ تو نہ صرف مدارس کے روشن کردار کے کھلے دل سے معترف بھی ہے اور امید کی شمع جلانے میں حصہ دار بھی۔ بہر حال ان چند پہلوؤں پر توجہ نہ دینے کہ باوجود بھی کراچی کا یہ پروگرام بہت شاندار رہا۔ اور امید ہے کہ اگے چل کر ہمارے معزز علماء کرام ان پہلوؤں پر بھی بھرپور توجہ دیں گے۔ انشاء اللہ۔ اخر میں اس دعا کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ اللہ کریں مدارس کے یہ گلشن یونہی تا قیامت تروتازہ رہے آمین۔

سبزی منڈی دھماکہ اور ایک ماں کی آہیں

غور کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ایک عورت کی دل میں اس بات کی کتنی خواہش ہوتی ہے کہ اللہ پاک اسے اولاد بالخصوص اولاد نرینہ سے نواز دے۔ اور جب اللہ تعالٰی اسکی اس خواہش کو پورا کر دیتا ہے تو اس کے بعد ماں کی تمناؤں اور ارزوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ابھی محض ایک ہفتے کا ہی ہوتا ہے کہ ماں اپنی تصوراتی دنیا میں اس کے لیے دلہن ڈھونڈنے نکل جاتی ہے۔ نہ صرف دلہن ڈھونڈنے نکل جاتی ہے بلکہ وہ دلہن ڈھونڈ کر بیٹے کی شادی بھی کرا دیتی ہے اور اس کے بعد پوتے اور پوتیوں سے کھیلنے میں ایسی مگن ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے آس پاس کی بھی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ماں اس خوب صورت مگر تصوراتی دنیا سے تب واپس آتی ہے۔ جب اسکا لخت جگر رونے لگتا ہے۔ بچے کے رونے کی اواز سن کر ماں سب کچھ چھوڑ کر بچے کی خدمت میں لگ جاتی۔ بچے کی پرورش اور تعلیم تربیت میں وہ اتنی قربانیاں دے دیتی ہے کہ اس کا تصور ماں کے سوا کسی اور کے لیے کرنا ہی محال ہے۔ اور یوں اس تصوراتی دنیا کو حقیقت کے روپ میں دیکھنے کے لیے ماں کو سخت ازمائش اور انتہائی کٹھن صورت حال سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ماں کے اپنے بچے کے ساتھ انتہائی دلی لگاؤ اور محبت کا نتیجہ ہے کہ پروردگار عالم نے ماں کی مثال دیکر فرمایا کہ " میں اپنے بندے سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہوں،، اس

مثال کو سامنے رکھ کر ذرا غور کیجیے کہ ایک ماں کی شدت سے اپنے شیر خوار بچے کو جوان اور اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے خود کتنی ہی ماؤں کے منہ سے یہ بات سنی ہے کہ " میرا تو صرف دل میں ایک ہی ارمان ہے کہ میرے بیٹے کی شادی میری زندگی میں ہو جائے۔ پھر اگر موت آ جائے یو کوئی غم نہیں،، یہ ہوتے ہیں ایک ماں کے جذبات۔ کہ اگر زندہ بھی رہنا چاہتی ہے تو صرف اپنی اولاد کی خاطر۔

ذرا سوچیں کہ مذکورہ بالا جذبات کے ساتھ ایک ماں اپنے بیٹے کی بچپن سے لیکر جوانی تک خدمت کرے اور اس کے ناز نخرے اٹھائے یہاں تک کہ اس کے سر پر سہرا سجانے کے دن بھی بالکل قریب آ جائے، ایسے میں اگر کوئی ظالم اس ماں سے اسکا بیٹا چھین لے تو اخر اس پر کیا گزرے گی؟؟ یہی ناں کہ اسکا کلیجہ شدت غم سے پھٹ جائے گا۔ اور باقی زندگی وہ زندہ لاش کی مانند گزارے گی۔ وہ کبھی بیٹے کی قبر پر جاکر اس سے لپٹ کر روئے گی تو کبھی بیٹے کی یاد میں راتوں کو اٹھ کر بین کرتی جائے گی۔ کل تک بیٹے کی خاطر جینے کی دعائیں مانگنے والی ماں کہ الفاظ آج یوں ہونگے کہ " کاش میں بیٹے کی موت سے بہت پہلے مر چکی ہوتی۔ لیکن وہ بیچاری ماں سوائے صبر اور قاتلوں کو کوسنے کی سوا کچھ کر نہیں سکے گی۔ وہ انصاف مانگنے منصفوں کے در پر جائے گی لیکن اسے انصاف نہیں مل سکے گا۔ وہ خود قاتلوں کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گی لیکن ناکامی کے سوا کچھ

ہاتھ نہیں آے گا۔ ایسے میں اسکی زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اور وہ اس کیس کو اللہ کی عدالت میں پیش کرکے پھر اس تصوراتی دنیا میں چلی جائے گی جس سے واپس آنے میں وہ خود بڑھاپے کی دہلیز پر اس امید کے ساتھ پہنچ چکی تھی کہ بیٹے کے سر پر سہرا سجے گا۔ لیکن اس بار امید کی جگہ یادیں، آہیں اور آنسوؤں کی بارش کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

سوچتا ہوں کہ جو کچھ آج کے اس کالم میں لکھ چکا ہوں یا جو آگے لکھنے جارہا ہوں۔ یہ سب ایک خواب ہوتا یا کوئی فرضی کہانی۔ لیکن میرے سوچنے سے کیا ہوگا۔ کیونکہ ظالموں نے ظلم کے جو پہاڑ ڈھانے تھے۔ وہ تو سبی ریلوے اسٹیشن اور اسلام آباد کے سبزی منڈی میں بم دھماکوں کی شکل میں ڈھاچکے۔ اور ان کے جانے کے بعد وہی روایتی بیانات داغنے کا سلسلہ جاری ہے۔ کوئی اسے حکومتی غفلت کا نتیجہ قرار دے رہے، تو کوئی طالبان کی جانب انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں حالانکہ ان دونوں دھماکوں کی ذمہ داری بلوچ عسکریت پسند گروپس قبول کرچکے ہیں۔ جبکہ طالبان سبی اور اسلام اباد دونوں الم ناک واقعات کے بڑی سخت الفاظ میں مذمت کرچکے ہیں۔
حکومت نے اسلام آباد دھماکے کی ذمہ داری یہ کہکر سابق پی پی پی حکومت پر ڈال دی ہے کہ انہوں نے ایک سو کروڑ روپے ہڑپ کرکے چار کی بجائے دو اسکینرز نصب کیں تھے اور وہ بھی کام نہیں کر رہے تھے۔ متعلقہ محکمے نے اس حوالے سے کیس بھی نیب کے حوالے کردیا ہے۔ بہر حال یہ تو

مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں جو کہ کسی بھی ناخوش گوار واقعے کی فوری بعد کچھ ردوبدل کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں لیکن مجھے تو اس دھماکے میں جاں بحق ہونے والے راولپنڈی کے سجاد خان کی والدہ کا غم چین سے نہیں رہنے دیتا کیونکہ سجاد کی کچھ ہی دنوں بعد شادی ہونے والی تھی اور اسکی ماں دیگر گھر والوں کے ساتھ مل کر اس کے لیے تیاریاں کر رہی تھیں۔ لیکن دہشت گردوں نے یہ انتہائی وحشیانہ کاروائی کر کے اسے اور اس جیسے دیگر درجنوں خاندانوں پر قیامت ڈھادی۔اور اپنے اس گھناؤنے فعل کو سیکورٹی فورسز کی جانب سے کی جانے والی کارروائی کا ردعمل قرار دیا۔ حالانکہ کسی بھی طور فورسز کی کارروائیوں کی ردعمل میں عام بے گناہ عوام کو بموں سے اڑانا جائز نہیں۔ کیونکہ فورسز کو کارروائی کا آرڈر تو سجاد یا اسکی والدہ نے تو نہیں دیا تھا۔ کہ آپ نے انکی زندگی کی چراغ گل کر اسکی ماں کو ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں دھکیل دیا۔ جہاں پر وہ بے چاری اب تادم مرگ بیٹے کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرے گی۔ بہر حال جو لوگ دہشت گردی کہ ان واقعات میں جاں بحق ہو چکے ہیں۔ اللہ پاک انکی مغفرت فرمایں اور انکی لواحقین کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔امین۔

یہ تو ہونا ہی تھا

پچھلے دنوں دو انتہائی افسوسناک خبریں ہم سب کی نظروں سے گزری ہیں۔ پہلی خبر ملتان سے یہ کہ: وہاں پر ایک نوجوان نے جعلی پیر کے کہنے پر زیر زمین خزانے کو باہر لانے اور اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے گھر کے اندر ایک گڑھا کھودنا شروع کیا اور جب وہ گڑھا 40 فٹ گہرائی تک جا پہنچا تب مذکورہ نوجوان خزانے کی حصول کے لیے گڑھے کے اندر چلا گیا۔ جیسے ہی وہ نوجوان اندر اتر گیا اوپر سے مٹی کا ایک تودہ گر کر نوجوان کے اوپر جا لگا اور وہ وہی مٹی کے اندر دب کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بعد میں ریسکیو ٹیموں کو لاش نکالنے میں جس مشقت واذیت سے گزرنا پڑا وہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں۔ دوسری خبر مری سے ہے کہ وہاں پر ایک شقی القلب ماموں نے اپنے تین سگے بھانجوں کو ایبٹ آباد سے سیر و تفریح اور گھمانے کے بہانے مری لایا۔ لانے کے بعد تینوں کو جنگل میں لے جا کر ذبح کر ڈالا۔ دو معصوم پھول موقع پر ہی مرجھا گئے، جبکہ تیسرے بچے زین نے اپنے اعصاب و حواس کو برقرار رکھتے ہوئے کٹے گلے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح روڈ تک پہنچ کر لوگوں کو خود پر بیت جانے والی قیامت سے اگاہ کیا۔ لوگ جب موقع پر پہنچے تو وہاں زخموں سے چور دو ننھے بچوں کی لاشیں انکی منتظر تھیں جبکہ انکا قاتل ماموں

موقع سے فرار ہوچکا تھا۔ بعد کے بیانات سے پتہ چلا کہ کسی عامل نے بچوں کے ماموں کو کہہ رکھا تھا کہ اگر من کی مراد پورا کرنا چاہتے ہو تو کم از کم تین انسانی زندگیوں سے کھیلنا پڑے گا۔ نتیجتاً ماموں نے اس جعلی عامل کے کہنے پر لبیک کہتے ہوئے اپنے تین سگے بھانجوں کو ذبح کرڈالا۔

اس ظالمانہ واقعے کے بعد نہ صرف متاثرہ شہروں کی فضاء سوگوار ہے۔ بلکہ یہ غم پورے پاکستان میں محسوس کیا جارہاہے۔ دوسری طرف وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے سخت کارروائی کرنیکا عندیہ دے دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وزیر اعلیٰ پنجاب کے نوٹس لینے سے مجرم کو سزا مل سکی گی اور کیا نوٹس لینے کی نتیجے میں آئندہ اس قسم کی ناخوش گوار واقعات کی روک تھام ہوسکے گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلق ہے مجرم کو سزا دینے کا۔ تو اگر پولیس ایمانداری کا مظاہرہ کرے تو عین ممکن ہے کہ مجرم بہت جلد قانون کے شکنجے میں آجائے۔ اور قانون اس کے لیے سخت سے سخت سزا تجویز کریں۔ اب آئیں اس سوال کی طرف کہ کیا آئندہ اس قسم کے واقعات کی روک تھام ہوسکے گی؟ میرے خیال میں نہ تو آئندہ اس قسم کے ناخوش گوار واقعات روکنے کا کوئی چانس ہے اور نا ہی ہمیں اس حوالے سے کسی خوش فہمی میں مبتلاء ہونے کی ضرورت۔ کیونکہ جس کام کے پیچھے برسوں کی محنت، طاقتور میڈیا کا دباؤ، سول سوسائٹی کی پشت پناہی اور اعلیٰ حکومتی شخصیات اور اداروں کا بھر

پور دباؤ ہو۔ اسے چند ایک کھوکھلے بیانات سے کسی بھی صورت ختم نہیں کیا جا سکتا۔
یہاں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مذکورہ بالا اداروں اور شخصیات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ کہیں مذکورہ کردار بلاواسطہ اس قسم کے مجرمانہ سرگرمیوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ بالواسطہ مذکورہ بالا کردار ہی اس قسم کے غیر انسانی وظالمانہ حرکتوں کے پشتیبان نظر آتے ہیں۔ وہ کیسے؟ تو ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ملک ہے۔ اس لیے دین اسلام سے رہنمائی یہاں کے باشند گان کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ ضرورت اس لیے کہ دین سے رہنمائی لیے بغیر کہ ہم خود کو پہچان سکتے ہیں اور نا ہی انسانی اقدار کو۔ اور مجبوری اس لیے کہ اگر ہم دین سے رہنمائی لینا چھوڑ دیں تو پھر شاید چند سال کے اندر ہی ہمارا خاندانی نظام، بھائی چارے کی فضاء اور معاشراتی اقدار تتر بتر ہو جائے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جب سے پاکستان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں شریک ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک ایک منظم منصوبے کے تحت اہل وطن کو اسلام اور اسلام پسندوں سے بدظن کیا جا رہا ہے۔ مثلاً: حق اور باطل کے درمیان جب بھی کوئی معرکہ برپا ہوا۔ دینی تربیت کے حامل افراد نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اور کبھی بھی کسی کے دھونس، دھمکیوں اور لالچ سے مرعوب نہیں ہوئے۔ موجودہ امریکی جنگ میں بھی وہی افراد نے امریکی بالادستی

سے صاف انکار کردیا جنگی تربیت دینی خطوط پر ہوئی تھیں۔ لہٰذا امریکہ اور اس کے مقامی الہ کاروں نے کمال ہوشیاری سے امریکہ کے خلاف جہاد کو پہلے دہشت گردی سے تعبیر کیا، پھر اس '' دہشت گردیِ،، کا تعلق مدارس سے جوڑدیا، پھر یہ کہا گیا کہ مدارس دہشت گردوں کے اڈے اور ٹریننگ کیمپ ہیں۔ لہٰذا عوام کو روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے '' انتہاء پسندوںِ،، سے دور ہی رہنا چاہیے۔ اس جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوا کہ عوام نے دینی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے مستند علماء کرام کے پاس جانے کی بجائے نام نہاد عاملین کے پاس جانا شروع کردیا۔ اور پھر اس کے جو نتائج آنے شروع ہوئے اس پر دلائل و بحث و مباحثے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ ملتان اور مری کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ حالانکہ مری اور ملتان کے واقعات جیسے کئی واقعات اس سے پہلے بھی قومی اور بین الاقوامی میڈیا کی زینت بن چکے ہیں۔ اور خدشہ ہے کہ آگے چل کر اس قسم کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آئے گا۔ کیوں لگ ایسا رہا ہے کہ متعلقہ ادارے نام نہاد عاملین کے خلاف عملًا کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں بلکہ غیر محسوس انداز سے انکی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اور اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ پچھلے دنوں ایک پشتو ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس ڈرامے میں دو دفعہ دو مختلف عاملین کے '' کرامات،، کا اشتہار چلا۔ کہ کس طرح سے وہ عاملین پریشانیوں میں گھری اہل وطن کے تمام مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات میں اشتہارات اور

کیبل ٹی وی نیٹ ورک کے ذریعے جس طریقے سے ان عاملین کو عوام کا مسیحا بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ایسے عاملین کے کہنے پر اپنے دو، چار بھانجے ، بھتیجوں کو ذبح کرکے ان کی بوٹیاں بھی بنائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ جو فصل ہم نے کل بوئی تھی ،آج اسے کاٹنا توپڑے گا۔

اگر یہ "کم سن ماں" پاکستان میں ہوتی

سوچتا ہوں کہ اگر خبر کچھ یوں ہوتی کہ " پشاور کے مضافاتی علاقے میں ایک 12 سالہ شادی شدہ لڑکی ماں بن گئی جبکہ اس کے شوہر کی عمر بھی ابھی محض 13 سال ہے۔ تو پھر کیا ہوتا؟ ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے جو نقشہ میرے ذہن میں بنا تو اس کے بعد صورتحال کچھ یوں ہوتی۔ خبر سامنے آنے کے بعد سب سے پہلے سول سوسائٹی حرکت میں آتی۔ وہ سب سے پہلے کے چھوٹے بڑے شہروں کے میں زبردست احتجاج کرتی اور کم عمری میں شادی پر تشویش کا اظہار کرتی۔ اس دوران سوسائٹی کے سرکردہ رہنماء اسماء جہانگیر، حنا جیلانی اور فرزانہ باری ٹی وی ٹاک شوز کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار جبکہ بعض سیاسی جماعتوں کو دعوت دیتیں کہ وہ اس "ظلم" کے خلاف ہمارے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر آواز اٹھائیں۔ نتیجتاً حکومت اپنے مینڈیٹ کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنا کر اس علاقے میں بھیج دیتی۔ سول سوسائٹی کے اس پرخلوص اپیل پر کچھ سیاسی جماعتیں بھی میدان میں اتر کر اس واقعے کو انسانیت کے خلاف ظلم قرار دیتے ہوئے قومی و صوبائی اسمبلیوں میں منظوری کے لیے ایک اور بل پیش کر دیتیں۔ واضح رہے کہ اس تمام عرصے میں الیکٹرونک میڈیا بھرپور ذمہ داری کا مظاہرہ

کرتے ہوئے پل پل کی خبر ناظرین تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا۔ ادھر پرنٹ میڈیا میں موجود وجاہت مسعود اور یاسر پیرزادہ اور منو بھائی جیسے " دانشور" عوام کو یہ باور کراتے کہ یہ سب اسلام میں شادی و نکاح کے احکامات کا شاخسانہ ہے۔ لہٰذا اس کا اب ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ خواتین کی آزادی اور حقوق کے لیے مزید جدوجہد کی جائے کیوں کہ پاکستان خواتین کے لیے بھی ایک خطرناک ملک بن چکا ہے۔

ادھر ٹی وی چینل پر مدعو" علامہ مغربی صاحب،، اپنے تخلیق کردہ فلسفے کے مطابق عوام سے کچھ یوں گویا ہوتے " میں نے اپنی پوری زندگی پڑھتے پڑھاتے گزار دی، بدقسمتی سے سفارتی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اسرائیل نہیں جا سکا ورنہ امریکہ و برطانیہ سمیت پوری دنیا گھوما ہوں لیکن ایسا ظلم تو میں نے کہیں بھی نہیں دیکھا جو ہمارے یہاں ہو رہا ہے۔ حالانکہ ان کاموں کا "ہمارے" اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی وجہ سے ہماری کوششوں سے پچھلے دنوں سندھ اسمبلی نے اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کرنے کی قرارداد منظور کی کیونکہ کونسل کے خیال میں کم عمری کی شادی کی اسلام میں کوئی ممانعت نہیں۔ حالانکہ کونسل جس قانون کی روشنی میں یہ بات کرتی ہے اسے گزرے ہوئے چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ جبکہ جس دور میں ہم جی رہے ہیں یہ جدید اور ماڈرن دور ہے اور اس دور میں " فرسودہ روایات "کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ لہٰذا ہم نے کوشش

کرکے ایک صوبائی اسمبلی سے کونسل کو ختم کرنے کی قرار منظور کرالی ہے اور اگر دو تین عالمی خداؤں کا تعاون جاری رہا تو ہم قانون میں بھی ترمیم کرالیں گے امریکہ بفضل مغربی سرکار۔

واقعے کے تیسرے دن ایک مشہور ٹی وی چینل اپنے نامعلوم ذرائع سے یہ انکشاف کردیتا کہ جو بچہ پیدا ہوا ہے اسکی نانی کی عمر بھی محض 27 سال ہے۔ اس انکشاف سے عالمی برادری بھی حرکت میں آتی ۔ محسن ملالہ، مسٹر گورڈن براؤن آبلہ پا پاکستان تشریف لاتے، اس واقعے کو انسانیت اور انسانی حقوق کی تذلیل قرار دیتے اور لڑکی کو فوری دارلامان منتقل کرنے کی سفارش کرتے۔ اقوام متحدہ تو فوراً پاکستان پر دو چار پابندیاں ضرور لگا دیتی ممکن ہے اس میں شادی پر ہی پابندی لگ جاتی کیوں کہ وہ یہ اس سنگین صورتحال کے حوالے سے پہلے ہی یہ رپورٹ جاری کرچکی ہے، اقوامِ متحدہ کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں بلوغت کی عمر کو پہنچنے والی لڑکیوں کی مجموعی تعداد میں سے نصف چھ ممالک میں موجود ہیں، جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ اس کے بعد اسلام کا جو حشر پاکستان میں ہوتا وہ الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اب آپ اسے بدقسمتی کہیں یا خوش قسمتی کہ مذکورہ بالا واقعہ پاکستان میں پیش نہیں آیا۔ لیکن برطانیہ میں ایک ایسا واقعہ اس فرق کے ساتھ پیش آچکا کہ " وہاں پیدا ہونے والا بچہ فطری طور پر معاشرتی بندھن نکاح سے نہیں بلکہ

ناجائز تعلقات کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ واقعے کی مختصر روداد کچھ یوں ہے کہ برطانیہ کے علاقے شمالی لندن کے پرائمری اسکول میں زیر تعلیم ایک غیر شادی شدہ بچی جسکی عمر محض 12 سال ہے ایک بچے کی ماں بن گئی۔ اس بچی کا حمل جس بچے سے ٹھہرا ہے وہ بھی محض 13 برس کا ہے اور اسی سکول میں وہ بھی زیر تعلیم ہے جس میں وہ 12 سالہ لڑکی زیر تعلیم ہے۔ ان دونوں میں تعلقات ایک سال پہلے اس وقت پروان چڑھے جب لڑکی 11 جبکہ لڑکا 12 سال کا تھا۔ واضح رہے کہ ماں بننے والی لڑکی کی ماں یعنی پیدا ہونے والی بچی کی نانی بھی محض 27 سال کی ہے۔ خیال رہے کہ یہ وہی برطانیہ ہے جس کے سابق وزیر اعظم اور اب اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی برائے تعلیم گورڈن براؤن پچھلے دنوں پاکستان آکر اس عزم کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ اور ان کا ملک پاکستان کو کم عمری کی شادی سے پاک علاقہ بنانے کے لیے پر عزم ہے۔ یہاں ایک بات اور یاد آئی کہ حقوق نسواں کے حوالے سے کام کرنے والی کچھ این جی اوز کا کہنا ہے کہ کم عمری میں شادی کی وجہ سے لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی عموماً منقطع ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے چکر میں ان لڑکیوں کے حوالے سے کون آواز اٹھائے گا جو اپنی جوانی کی عمر سے گزر چکی ہیں۔ ان کے سروں پر بڑھاپے کی سفید چاندی اتر چکی ہے۔ والدین پریشان ہیں کہ بیٹی کے پاس تعلیم تو بہت اعلیٰ ہے لیکن اب عمر کی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کوئی اس سے شادی کرنے کو تیار نہیں۔

مسٹر گورڈن براؤن کے اس بیان کے بعد سندھ اسمبلی نے اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کرنے کی قرارداد منظور کی تھی۔ کیونکہ کونسل کا خیال ہے کہ اسلام میں کم عمری کے نکاح پر کوئی پابندی نہیں۔ سندھ اسمبلی کے اس اقدام اور مسٹر گورڈن براون کے دورے کو ملک کے غیر جانب دار حلقے ایک ہی اقدام کی کڑیاں قرار دے رہے ہیں۔

ان دو باتوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا نہیں یہ تو آنے والے دنوں میں معلوم ہو ہی جاے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر سابق برطانوی وزیر اعظم پاکستانی بچیوں کی اتنی فکر کیوں لاحق ہے کہ بہر صورت یہاں کم عمری کے نکاح کو جرم قرار دینے کے سر توڑ کوششیں کر رہا ہے۔ جبکہ دوسری جانب ان کے اپنے گھر کا حال یہ ہے کہ محض 11 سال کی عمر میں ایک بچی کا حمل ٹھہرتا ہے اور وہ ایک ناجائز بچے کی ماں کا تمغہ سینے پر سجا لیتی ہے لیکن براؤن کو وہ نظر نہیں آتی۔ حلانکہ اگر کہیں کوئی مسلمان اپنے بیٹے کی شادی کم عمری میں کرا بھی دیتا ہے تو اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ برسر روزگار ہونے تک اس لڑکے اور اس کی ہونے والی بیوی کے تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جائے۔

دوسری اہم بات یہ کہ لڑکا اور لڑکی نکاح کے اس مقدس بندھن میں بندھے جاتے ہیں جس کو توڑنا بیوی یا شوہر کے لیے اتنا اسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ

اگر کبھی ایسا جوڑا مشکلات کا شکار ہو بھی جائے تو وہ ایک دوسرے سے جان نہیں چھڑاتے بلکہ مشکل کی ہر گھڑی میں ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن جو کچھ برطانیہ میں ہوا ہے وہ ہر لحاظ سے باعث شرم اور تکلیف دہ ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ ناجائز تعلقات ان کے ہاں کوئی معیوب چیز نہیں لیکن سوچتا ہوں کہ کیا وہ 13 سال کا لڑکا اپنا، اس بچی اور اس کے ماں کا بوجھ اٹھا سکے گا۔ تو مجھے ہر طرف سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے کیونکہ جس معاشرے میں خاندانی نظام کو ٹوٹے برسوں ہو چکے ہو وہاں کوئی کیونکر کسی کا غمگسار بنے گا۔ لہٰذا لگ یہی رہا ہے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ لڑکا اس لڑکی کو خیر باد کہ دے گا۔ نتیجتاً اس لڑکی کو اپنا اور اس بچے کا بوجھ خود ہی اٹھاپڑے گا۔ اور ایک 12 سالہ لڑکی کس طرح سے یہ بوجھ اٹھائے گی اس کے لیے ارسطو یا افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ناجائز بچے کی ماں خود کو پرسکون رکھنے کے لیے کن کن ناجائز ذرائع کا سہارا لے گی اور انسانیت کا کس طرح خون کرے گی یہ سوچتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے ہم خود کو بچانے اور اغیار کے پروپیگنڈے میں نہ آئیں، اس کے بعد جو ظلم اس برطانوی لڑکی کے ساتھ ہوا ہے اسے اس ظلم سے نکالنے کے لیے اسلام کا پیغام ان معاشروں تک پہنچائیں۔ صرف یہی واقعہ نہیں بلکہ بی بی سی اور دیگر ذرائع ابلاغ ایسی رپورٹس سے بھرے پڑے ہیں جن میں برطانوی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں استحصال کا شکار ہیں، لیکن اہل مغرب و یورپ اور

پاکستان میں موجود ان کے چیلوں کو صرف پاکستان اور اسلامی ممالک کی فکر ہے۔
اسلامی معاشرے میں آکر اگر وہ کم عمری میں ماں بھی بن جاتی ہے تو اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے سر پر نکاح کا مضبوط سائبان اور اس کے پہلو میں دنیا کا مضبوط ترین خاندانی نظام جو ہوگا۔

خواہش ناتمام

امریکی صدر باراک اباما نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ: اللہ مجھے مسلمانوں پر مظالم بند کرنے کی توفیق دے۔ امریکی صدر کے اس بیان کے بعد مسلمانوں کی اکثریت نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی اور ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک روایتی بیان ہے ورنہ حقیقت میں صدر امریکہ مسٹر اباما بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں جس پر اس کا پیشرو سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش چل چکے ہے۔ جبکہ بعض مسلمان اس بیان کو نیک شگون بھی قرار دے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ باراک اباما نے پچھلے دنوں مسلم اکثریتی ملک ملیشیاء کا دورہ کیا تھا۔ 1966 کے بعد کسی بھی امریکی صدر کا یہ پہلا ملیشیائی دورہ تھا۔ اس سے پہلے 1966 میں اس وقت کے امریکی صدر جانسن نے ملیشیا کا دورہ کیا تھا۔ ملیشیا کے اپنے اس دورے میں اباما نے جہاں حکومتی زعماء اور دیگر طبقات کے عہدیداران سے ملاقاتیں کی ہے تو وہی وہ ملیشیا کے دارالحکومت کوالالپور کے سب سے بڑی نیشنل مسجد بھی گئے۔ جہاں انہوں نے ملک کے مفتی اعظم جناب اسماعیل محمد سے بھی ملاقات کی ہے۔ العربیہ کے مطابق امریکی صدر مسجد کے مختلف حصوں کا دورہ کرنے کے علاوہ مسجد سے متصل مزارات پر بھی گئے۔ اس دوران اس نے مسلمانوں کے بارے میں اپنے جذبہ خیر سگالی کا اظہار بھی کیا اور مذہب اسلام کو وہ احترام دینے کی کوشش بھی۔ جو کہ اس مذہب کا شایان شان

ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ملاقات میں جہاں دیگر امور پر دونوں شخصیات کے مابین گفتگو ہوتی رہی، تو وہی مفتی اعظم نے صدر امریکہ کی توجہ دنیا بھر میں مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ رویئے، غیر منصفانہ سلوک اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کی طرف دلاتے ہوئے صدر سے اس سلسلے میں کردار ادا کرنے کو کہا۔ اس کے جواب میں مسٹر اباما نے کہا کہ مظلوم کوئی بھی اور کسی بھی مذہب کا ہو، میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں اور ہر صبح جب میں نیند سے بیدار ہوتا ہوں تو ان جھگڑوں کے خاتمے کی کوششوں میں جت جاتا ہوں جو انسانی معاشروں پر منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ اس موقع پر اباما نے مفتی اعظم سے درخواست کی کہ وہ دعا کریں کہ اللہ پاک مجھے مسلمانوں پر مظالم بند کرنے کی توفیق دے۔ اس سے پہلے کوالالمپور ہی میں جامعہ ملایا کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر کا کہنا تھا کہ: ہم سب کو انسانوں کے درمیان نسلی امتیاز کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔

قارئین گرامی! سوال یہ ہے کہ کیا جو کچھ اباما نے کہا ہے، وہ ان کی دل کی آواز ہے یا صرف مسلمانوں کو بے وقف بنا کر ان کی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش؟ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ اباما نے کہا ہے۔ اس کی مثال ''رات گئی بات گئی،، جیسی ہے۔ کیونکہ جو شخص دوسری دفعہ صدارت میں ہونے کے باوجود اپنے عوام کو وہ حقوق نہ دلا سکے جس کا انہوں نے ان سے انتخابی مہم نے دوران وعدہ کیا

تھا۔ تو وہ مسلمانوں کا ہمدرد کیسے ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج امریکہ کی معیشیت دباؤ کا شکار ہے۔ جس کے نتیجے میں بے روزگاری کی شرح بڑھ رہی ہے اور غربت میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر اوبامہ کو اپنے ملک سے نسلی و مذہبی تفریق ختم کرنے میں بھی ناکامی کا سامنا ہے۔ جس کے نتیجے میں جہاں سیاہ فام امریکیوں کو گوروں کے مقابلے میں زیادہ معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تو وہی مسلمان امریکیوں کو بھی صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے تعصب کا سامنا ہے۔ حالانکہ معیشیت کی بہتری اور نسلی تفریق کا خاتمہ اوبامہ کے ترجیحات میں شامل تھا۔ ایسے میں بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے بارے میں اوبامہ کے جذبات یقیناً کسی لطیفے یا مذاق سے کم نہیں۔ کیونکہ جب ہم عالمی سطح پر مسلمانوں کے بارے میں امریکی پالیسی کو دیکھتے ہیں۔ تو اس میں یہودی لابی کا کردار صاف نظر آتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے بارے میں یہودیوں کی سوچ ہمیشہ سے معتصبانہ رہی ہے۔ لہٰذا اگر بالفرض اوبامہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی سوچ تبدیل کرنا چاہے بھی، تو تب بھی وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ امریکی سوچ پر قابض یہودی اسے ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ اور شائد یہی وجہ ہے، کہ وہ اپنے انتخابی منشور کے برعکس اب تک سابق صدر جارج واکر بش کے نقش قدم پر اس سے بھی زیادہ تیزی سے چل رہے ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ وہ شخص جو ایک آزاد اور خود مختار فلسطینی ریاست کا حامی تھا۔ آج کس طرح اسرائیل کے پشت پر کھڑے

ہو کر ان کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر کے منصفانہ حل کی خواہش تو شائد ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ جو اوبامہ نے دیکھا تھا۔ لہٰذا اب وہ اس کا تذکرہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ کشمیر و فلسطین کے حوالے سے اوبامہ کے کردار کو دیکھنے کے بعد ذرا افغانستان اور پاکستان کے بارے میں ان کے کردار کا جائزہ لیجیے۔ تو نظر یہ آتا ہے کہ اس خطے کے مسلمانوں کے خون کا تو وہ اس قدر رسیا ہو چکا ہے کہ افغانستان میں ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے امریکی اور اس کے اتحادیوں نے نہ تو معصوم بچوں کو معاف کیا، نہ جنازوں کا احترام کیا، نا شادی کے تقریبات کو ماتم کدے بنانے سے گریز کیا اور نا ہی قرآن مقدس کی حرمت کو خاطر میں لایا۔ بلکہ ہر جگہ اپنی درندگی کے وہ نشان نقش کیں جو مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکیں گے۔ پاکستان کا حال بھی افغانستان سے کم نہیں۔ ڈرون حملے اوبامہ کے دور میں فاٹا سے نکل کر بندوبستی علاقوں تک پھیل گئے۔ ان حملوں میں جاں بحق افراد کی تعداد سینکڑوں سے نکل کر ہزاروں میں جا پہنچی جن میں اکثریت بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی ہیں۔ وطن عزیز کی بازاریں اور مساجد بلیک واٹر کی درندگی کا نشانہ بنے، ان کارروائیوں میں ہزاروں افراد لقمہ اجل بنے تو ہزاروں مستقل اپاہج بھی ہوئے۔ سلالہ میں افواج پاکستان کے غیور جوانوں پر امریکی بمباری، ایبٹ آباد اپریشن اور ریمنڈ ڈیوس کیس کے بارے میں کیا کہنا، کہ وہ تو اوبامہ انتظامیہ کی طرف سے مسلمانان پاکستان و مسلمانان عالم کے لیے خاص تحائف تھے۔ اس کے علاوہ اگر نظر باقی دنیا پر

دوڑائی جائے۔ تو مصر سے لے کر شام تک، سوڈان سے لے کر میانمار تک، صومالیہ سے لے کر یمن تک عراق سے لے کر لیبیا تک اور مالی سے لے کر انگولا تک اباما کے سرپرستی میں امریکہ، اسکے اتحادی و ایجنٹ کس طرح مسلمانوں سے ان کے حقوق چھین کر انہیں جبر و ستم کا نشانہ بنا رہے۔ وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لہٰذا انتہائی ادب و احترام کے ساتھ ملیشیاء کے مفتی اعظم جناب الشیخ اسماعیل محمد کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق صلیب کے علمبردار باراک اباما سے مانگنے کے بجائے مسلمان حکمرانوں کی توجہ اس طرف دلائیں۔ اگر آپ اور آپ جیسے دیگر معزز شخصیات اس سلسلے میں بھرپور کردار ادا کرنے کی کوشش کریں تو امید ہے کہ مسلم حکمرانوں کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد آجائے۔ لیکن اگر آپ جیسے معزز اور قابل احترام شخصیات یہودیوں کے نرغے میں گھرے باراک اباما سے مسلمانوں کے لیے مدد مانگتے رہے تو میرے خیال میں یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ بلکہ یہ خواہش، خواہش ناتمام ہی رہے گی۔

چار دن علم و ادب کے گلشن میں

انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی کے صوبائی ریجنل سینٹر دعوۃ اکیڈمی کراچی میں صحافیوں اور میڈیا پرسنز کے لیے ہونے والی چار روزہ اسلامی تربیتی ورکشاپ میں شرکت کا موقع ملا، جو 13 مئی تا 16 مئی جاری رہی۔ اس ورکشاپ میں کئی ماہرین علم، اسلامک اسکالرز اور سینئر صحافیوں نے پیشہ ورانہ تربیت اور اصلاحی موضوعات پر لیکچرز دیے۔
13 مئی کو ورکشاپ کے آغاز پر کوآرڈینیٹر ریجنل دعوۃ سینٹر کراچی ڈاکٹر شہزاد چنا نے شرکاء کو دعوۃ اکیڈمی کے قیام کے اغراض و مقاصد اور اس کی ملکی و بین الاقوامی سطح پر پیش کی جانے والی خدمات سے آگاہ کیا۔ تعارفی نشست کے بعد چیئر مین اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی ڈاکٹر انوار احمد زئی نے افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا کہ آج صحافت اور صحافیوں کو نسلی، لسانی و علاقائی تعصبات کا سامنا ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ آزادی وطن کے فوری بعد اس ملک کے خلاف سازشیں شروع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ہم کافی عرصے تک بغیر کسی دستور کے چلتے رہے۔ بعد میں جب دستور بنا تو اسے مارشل لاء نافذ کرکے توڑا گیا اور یہ آنکھ مچولی 1973 تک چلتی رہی۔ 1973 کے دستور کو کسی نے توڑا تو نہیں لیکن اسے مختلف ادوار میں معطل کیا جاتا رہا۔ جو کہ غیر قانونی

اقدام تھا۔

موجودہ حالات کے حوالے سے پروفیسر صاحب نے کہا کہ آج اس ملک اور اس کے نظریے کی خلاف سازشیں ہورہی ہے۔ لہٰذا صحافت سے وابسطہ افراد پر یہ دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف ایسے عناصر کے آگے دیوار بن جائیں تو دوسری طرف مسلسل قوم کو اصل حقیقت سے آگاہ رکھا جائے۔ دعوۃ اکیڈمی کے انچارج اور معروف علمی شخصیت و محقق جناب ڈاکٹر سید عزیزالرحمٰن نے قرآن ایک تعارف کے عنوان سے لیکچر دیا۔ اپنے لیکچر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ قرآن پاک کا موازنہ دوسرے کتابوں سے کرانا ممکن نہیں۔ کیونکہ قرآن جیسی کتاب نہ پہلے کبھی آئی ہے اور نا تا قیامت ایسا ممکن ہے۔ انہوں نے مزید کہا قرآن کریم ایک ایسی مقدس اور بابرکت کتاب ہے کہ جو کئی صدیاں گزرنے کی باوجود بھی اپنے الفاظ، اپنے بیان میں بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ نبی مہربان ﷺ کے دور مبارک میں تھی۔ اور یہ تا قیامت تک ایسے ہی رہے گی۔

عربی زبان کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عزیزالرحمان نے کہا کہ ہر زبان میں ہمیں متروک لفظ ملیں گے لیکن عربی میں ایسے الفاظ ہرگز نہیں ملیں گے اور یہ صرف قرآن ہی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ عربی زبان میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی اور نا آئندہ کوئی تبدیلی آئیگی۔ قرآن ایک تعارف کے علاوہ سید

عزیزالرحمٰن نے حرمت قلم اور اس تقاضے اور سیرت طیبہ ﷺ پر بڑے مؤثر، خوبصورت اور جامع انداز میں لیکچرز دیے۔ جن سے شرکاء پروگرام نے خوب استفادہ کیا۔

ڈاکٹر عامر طاسین نے ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈہ کے عنوان سے لیکچر دیا۔ انہوں نے پروپیگنڈے،اس کی اہمیت اور منفی یا مثبت استعمال کے حوالے شرکاء کو آگاہ کیا۔ پاکستانی میڈیا کی موجودہ صورتحال پر بات کرتے ہوئے عامر طاسین نے کہا کہ: پوری دنیا میں یہ اصول رائج ہے کہ جو بندہ ٹی وی یا اخبار نکالنا چاہتا ہو تو اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ خود جرنلزم سے وابستہ بھی ہو اور اسے جرنلزم کا خاطر خواہ تجربہ بھی ہو۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا، بلکہ یہاں ان کو بھی لائسنس مل جاتا ہے جن کا صحافت سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ پیمرا قوانین کے حوالے سے ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ قوانین تو موجود ہیں لیکن پیمرا باوجود کوشش کے اس پر عمل درآمد نہیں کرپاتا۔

ذمہ دارانہ رپورٹنگ کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے جامعہ کراچی کے شعبہ ماس کمیونیکیشن (ابلاغ عامہ) کے سابق چیئرمین وپروفیسر ڈاکٹر محمود غزنوی نے کہا کہ ذمہ دارانہ رپورٹنگ کے لیے لازم ہے کہ خبر شائع یا نشر کرنے سے پہلے

اس کی صحت کیتیین یا کم از کم دو ذرائع سے تصدیق کردی جائے۔ اگر دو یا دو سے زائد معلوم ذرائع سے خبر کی تصدیق ہو جائے تو پھر خبر کو آگے بڑھادیا جائے ورنہ نہیں۔
پاکستانی میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ رویئے پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ خبر کہاں سے آ رہی ہے اور اس کے نشر یا شائع کرنے کے کیا نقصانات ہو سکتے ہیں۔ بس ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم سب سے آگے بڑھ سکیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے میڈیا ہاوسز کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن ڈھٹائی اس قدر ہے کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف پھر بھی نہیں کرتے۔ ذمہ دارانہ رپورٹنگ کے حوالے سے مزید بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ خبر میں اپنی رائے شامل نہ کرنا اور اسے اس کی صحت کے مطابق معاشرے کے اصلاح و بہتری کے نیت سے آگے بڑھانا ذمہ دارانہ رپورٹنگ کہلاتا ہے۔ لیکن آج صورتحال اس قدر خراب ہے کہ ہم نیوز میں اپنے ویوز شامل کرکے خبر دیکھنے یا پڑھنے والے والوں پر اپنی رائے مسلط کر رہے ہوتے ہیں۔ ایجنڈا سیٹنگ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود غزنوی نے کہا کہ پوری دنیا کی میڈیا کا اپنا ایک مخصوص ایجنڈا ہوتا ہے اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کیا کرنا اور کہاں جانا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے پاکستانی میڈیا کا کوئی ایجنڈا سیٹنگ نہیں اور وہ شتر بے مہار بنی ہوا ہے۔
ماہر تعلیم و ماہر نفسیات منیر احمد راشد نے نفسیات اور صحافت کے حوالے سے

لیکچر دیا اور مختلف چارٹس کے ذریعے سے عملی طور پر شرکاء کو نفسیات و صحافت کے حوالے سے اگاہ کیا۔ اس پروگرام کے تیسرے دن شرکاء کو جامعہ کراچی کے شعبہ ماس کمیونیکیشن لے جایا گیا جہاں شعبہ ماس کمیونیکشن کے سربراہ ڈاکٹر طاہر مسعود کے زیر صدارت ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر طاہر مسعود نے شرکائسے خطاب کیا۔ اپنے لیکچر میں ڈاکٹر مسعود نے میڈیا پر پابندیوں اس کے بعد میڈیا کے آزادی اور اب میڈیا کی بے لگام صورتحال کے بارے میں تفصیلًا بتایا اور کہاں کہ آج معاشرے کو معتدل رکھنے کے لیے لازم ہے کہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ میڈیا کے لیے بھی ایک ایسا ضابطہ اخلاق مرتب کرکے اس پر سختی کے ساتھ عمل درآمد بھی کرالینا چاہیے کہ جس سے معاشرے میں مثبت اقدار فروغ پائے۔اور اس کام کے لیے صحافی برادری کو خود ہی آگے بڑھنا پڑے گا۔ کراچی یونیورسٹی کے اس دورے میں محترم ڈاکٹر محمود غزنوی نے اپنے نگرانی میں جامعہ کے ایف ایم ریڈیو کا دورہ کرایا اور تفصیلًا اس کی ٹرانمیشن اور دیگر سسٹم وغیرہ کے بارے میں شرکاء کو آگاہ کیا۔

دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریجنل دعوۃ سینٹر کراچی میں اس پروگرام کا اختتام چوتھے روز نماز جمعۃ المبارک سے پہلے ہوا۔ اختتامی تقریب سے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، دعوۃ اکیڈمی جناب ڈاکٹر محمد امتیاز ظفر نے بطور مہمان خصوصی خطاب کیا اور اخر میں شرکاء کو تحائف دے کر

رخصت کر دیا گیا۔

ہمارے لیے یہ ورکشاپ بہت سی نئی چیزوں کے سیکھنے کا سبب بنی۔ اگر صحافیوں کے لیے اسی طرح کے تربیتی پروگرام دیگر میڈیا ہاوسز بھی شروع کر دیں۔ تو اس کے نتائج بہت موثر نکل سکتے ہیں۔

صرف ہندوستان ہی نہیں، ہندوستان کے ہم خیال ممالک بھی پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اب پاکستان کو کرہ ارض سے مٹانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہندوستانی فوجی افسران خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہے تھے کیونکہ 1965 کی پاک بھارت جنگ کے دوران لاہور میں شراب پینے کا ان کے بڑوں کا جو خواب چکنا چور ہوگیا تھا۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد وہ اپنے اس ادھورے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتا دیکھ رہے تھے۔ ان کے غرور کا عالم یہ تھا کہ وہ آنے والے دنوں میں لاہور میں شراب کے ساتھ کرشمہ کپور اور مادھوری کی خوبصورت اور دل لبھانے والی ڈانس سے بھی خود کو محظوظ ہوتے دیکھ رہے تھے۔

دوسری طرف اسلامی دنیا پر سوگ کی سی کیفیت طاری تھی کیونکہ تمام تر ناکامیوں اور غلط پالیسیوں کے باوجود بھی وہ پاکستان کو اپنا رہبر و رہنماء مانتے تھے۔ اس ساری صورتحال میں خود پاکستانیوں کی کیفیت بڑی دلچسپ تھی۔ گو کہ انہیں کسی نے باقاعدہ طور پر تو نہیں کہا تھا کہ پاکستان ایٹمی قوت بن چکا ہے لیکن 1974 میں انڈیا کے ایٹمی دھماکے کے جواب میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو تاریخی جملہ کہا کہ: " ہم ایٹم بم بنا کر رہیں گے چاہے اس کے

لیے ہمیں گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑے،، قوم نے اس پر ایسا یقین کر لیا تھا کہ 1998 میں ہر پاکستانی کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم موجود ہے اور پاکستان انڈیا کو بھرپور جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن ایک فکر جو قوم کو بہر حال لاحق تھی۔ وہ یہ کہ امریکہ اس پورے مسئلے میں مکمل طور پر انوالو ہو چکا تھا اور وہ بہر صورت پاکستان کو جوابی رد عمل سے روکنا چاہ رہا تھا اور اس کے بدلے ہر قسم کے عزت و تکریم دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ پاکستان چونکہ 1971 میں امریکی دوستی کا مزہ چھک چکا تھا اس لیے 1998 میں بجا طور پر اہل وطن اس فکر میں مبتلاء تھے کہ کہیں پاکستان ایک بار پھر امریکی وعدوں پر اعتبار نہ کر بیٹھے۔ امریکہ نے جب دیکھا کہ کوئی لالچ کام نہیں کر رہا تو وہ دھمکیوں پر اتر آیا اور کہا کہ اگر پاکستان نے انڈین ایٹمی دھماکوں کا رد عمل دیا تو اسے معاشی پابندیوں کے ساتھ دنیا میں تنہائی کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ یہی وہ وقت تھا کہ جب پاکستانی وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف سخت دباء محسوس کر رہے تھے اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ ایک طرف وزیر اعظم اس کیفیت سے دوچار تھے تو دوسری طرف قوم کی طرف سے اس پر کچھ کر دکھانے کے لیے دباؤ بڑھتا رہا۔ جب ہر طرف سے یہ صدائیں آنی شروع ہوئی کہ ہم گھاس کھانے کو بھی تیار ہے لیکن بھارتی چوہدراہٹ کا بھرپور جواب دیا جائے۔ تو میاں صاحب کو بھی ایک نیا حوصلہ ملا اور اس نے کچھ کر دکھانے کا عزم کیا۔

یہ 28 مئی 1998 کا دن تھا کہ جب عصر کے وقت محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر اپنی ٹیم کے ساتھ، افواج پاکستان کے افسران اور ان کے دبنگ جوان، انجینئرز اور دیگر عملہ پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے علاقے چاغی میں موجود تھا اور ایک اہم مشن کو سر کرنے والے تھے۔ موقع پر موجود لوگوں نے وہی کیا جو مسلمان صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔ یعنی پہلے بارگاہ رب العزت وحدہ لاشریک میں دست بدعا ہوئے۔ دعا کے فوری بعد فضا اللہ اکبر کے رعب دار نعروں سے گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی چاغی کا وہ مضبوط پہاڑ لرزنے لگا۔ موقع پر موجود لوگوں اور آفیشلز نے پہاڑ کا رنگ بدلتے دیکھا تو انہوں نے نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کیونکہ پاکستان اب دنیا کا ساتواں جبکہ عالم اسلام کا پہلا ایٹمی قوت بن چکا تھا۔ اس عظیم کارنامے کی خبر جب قوم کو ہوئی تو ان کو تو خوش ہونا ہی تھا لیکن ذرا نگاہیں دوسری طرف اٹھائیں کہ دنیا نے اس پر کس طرح کا رد عمل دیا۔

دنیا میں ہمیں دو طرح کے رد عمل دیکھنے کو ملے۔ پہلا رد عمل جو ہم نے اسلامی دنیا اور پاکستان دوست ممالک کا دیکھا تو ہمیں فلسطین کے لوگ سجدہ شکر ادا کرتے دکھائی دیے تو جکارتہ کی گلیوں میں لوگوں کو مٹھائیاں بانٹتے اور جشن مناتے دیکھا یہ صورتحال پورے عالم اسلام کی تھی۔ دوسرا رد عمل ہم نے اہل کفر

کا دیکھا کہ ان کی آنکھیں پھٹے کے پھٹے ہی رہ گئیں۔ کیونکہ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہمیشہ سے داخلی انتشار کا شکار ملک بھی کبھی اس قابل بن جائے گا کہ وہ ہندوستان کے پانچ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں اس سے زیادہ قوت والے چھ دھماکے کر دے گا۔ خود انڈیا اور اس کے ہم نوا اسرائیل کے تو اوسان ہی خطاء ہو گئے تھے کہ آخر یہ ہو کیا گیا ہے۔ اس دو طرفہ رد عمل سے جو بات ثابت ہوئی وہ یہ کہ پاکستان صرف جغرافیائی حدود میں قید زمین کے کسی ٹکڑے کا نام نہیں بلکہ پاکستان ایک نظریئے کا نام ہے۔ اس نظریے کا نام جو کفر اور اسلام کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ یعنی لاالٰہ الااللہ۔

بہر حال جب عالم کفر نے دیکھا کہ پاکستان کو تو پورا عالم اسلام اپنا حقیقی ترجمان اور جائے پناہ تصور کرتا ہے تو انہوں دو کام کیے۔ پہلا کام یہ کہ ہمارے اوپر معاشی پابندیاں لگا کر ہمیں اپنے قدموں میں بٹھانے کی کوشش کی۔ دوسرا کام جو انہوں فوری تو نہیں کیا لیکن اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی وہ یہ کہ ہمیں ہمارے اقدار سے دور لے جایا جائے اور ہمیں غیروں کے رسم و رواج کا دلدادہ بنا کر دو قومی نظریے سے دور کرنے کا کام شروع ہوا تاکہ پاکستان عالم اسلام کے ترجمان کی حیثیت کھو کر اغیار کے لیے تر نوالہ بن جائے۔

جب امریکہ نے پاکستان کے اوپر پابندیاں لگا کر بظاہر ہمیں مفلوج کر دیا تو اس وقت سعودی عرب پورے عزم و اعتماد کے ساتھ ہمارے شانہ بشانہ کھڑا ہوا اور ہمارے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول کر رکھ دیے۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان ایٹمی دھماکوں کے بعد خود پر پڑنے والے عالمی دباؤ کے آگے ڈٹ گیا جس کے نتیجے میں عالمی طاقتیں ہم سے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرانے میں ناکام رہیں۔ کامیاب ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عوام بالخصوص حکمران طبقہ یہ عہد کرتا کہ اتنے بڑے انعام کے بعد ہم کبھی بھی اللہ پاک کی نافرمانی نہیں کریں گے اور خود کو حقیقی معنوں میں اسلام کے سپاہی اور مظلوم مسلمانوں کے مسیحا بنائیں گے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور حکمران طبقہ عوام کی بھلائی کرنے کے بجائے ذاتی مفادات میں الجھ کر رہ گیا۔ نتیجتاً اللہ پاک نے پرویز مشرف کی شکل میں ایک عذاب ہم پر مسلط کیا۔ پرویز مشرف جب اس قوم پر مسلط ہوئے تو اس کے کچھ عرصے بعد امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ پیش آیا۔

نائن الیون کے بعد پرویز مشرف نے اس پاک وطن کے عزت و ناموس کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور ایک ایٹمی ملک یہود و ہنود کا غلام بن کر رہ گیا۔ ایک مسلمان پڑوسی ملک کو تباہ کرنے کے لیے پاکستان کی فضائیں، سمندر اور خشکی امریکہ کے حوالے کرنا، عافیہ صدیقی سمیت سینکڑوں لوگوں کو اغیار کے ہاتھوں فروخت کرنا، برادر اسلامی ملک کے سفیر کو بے توقیر کرکے صلیب کے پجاریوں کے قدموں میں ڈالنا اور باجوڑ کے مدرسے پر امریکی حملے کو

اپنا "کارنامہ" قرار دینا تو پرویزی دور کے سیاہ کارناموں کی صرف ایک جھلک ہے۔ ورنہ اس ظالم نے تو وہ کام بھی کر دیے جو کسی ایٹمی ملک کے تو کیا کسی کمزور ملک کے بھی شایان شان نہیں تھے۔ بہر حال پرویز مشرف سے تو اللہ پاک نے جان چھڑا دی لیکن افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ اس سیاہ دور کی بیشتر پالیسیاں اب بھی چل رہی ہے۔ حالانکہ اہل وطن نے زرداری حکومت کو اس لیے مسترد کر کے میاں صاحب کو زمام اقتدار تھما دیا تھا کہ زردای حکومت پرویز مشرف دور کی پالیسیوں سے جان چھڑانے میں سنجیدہ نہیں تھی۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ایٹمی دھماکوں کا سہرا اپنے سر سجانے والے میاں نواز شریف صاحب بھی پرویز اور زرداری دور کی پالیسیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ آج میاں صاحب بڑے عرصے بعد اقتدار میں آکر یوم تکبیر تو منا رہے ہیں لیکن یہ بھی صاف نظر آ رہا ہے کہ آج کے میاں صاحب میں وہ جذبہ اور امریکہ واس کے ایجنٹوں کے سامنے ڈٹ جانے کی وہ ہمت نہیں جو 1998 والے میاں صاحب کے اندر تھی۔ آج ہم یوم تکبیر تو منا رہے ہیں لیکن ہماری حکومت تکبیر کے معنی و مفہوم کو بھلا کر اس کے تقاضوں کو فراموش کر چکی ہے۔ اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ ایک طرف حکومت یوم تکبیر بھی منا رہی ہے تو ساتھ میں دو اداروں کے درمیان جاری تنازعے میں اس ادارے کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں جس پر ملکی سلامتی کے حوالے سے کئی الزامات لگ چکے ہیں اور جن کے چیف کو پاکستان کے ایک مقبول سیاسی جماعت کے قائد مناظرے کا چیلنج بھی دے چکے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف

صورتحال یہ ہے کہ یوم تکبیر منانے سے چند دن پہلے حکومت شمالی وزیرستان میں بڑی فوجی کارراوئی کا آغاز کرچکی ہے، جو کہ شروع دن سے امریکی مطالبہ بھی تھا اور ان کی خواہش بھی۔ ایسے میں یوم تکبیر منانا ایک رسم تو ہوسکتا ہے لیکن اللہ کی عزت و وقار کا اقرار اور ایٹمی قوت بن جانے پر اس کا شکر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ شکر اور کفر کبھی ایک ہوسکے ہیں اور نا ہوسکیں گے۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ وہ پہلے یوم تکبیر کے تقاضوں کو سمجھے اور اگر سمجھ آجائے تو پھر آج کے اس یوم تکبیر کو یوم التوبہ کے طور پر منا کر اپنی پالیسیوں اور کردار پر نظرثانی کرے۔

احساس کیجیے

کراچی سے خیبر پختون خواہ کے شہر سوات شفٹ ہوئے مہینے گزر گئے، لیکن بد قسمتی سے اس عرصے میں کوئی کالم نہیں لکھ سکا۔ اس پر میں نہ صرف ان تمام احباب کا جو میرے کالم نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً حوصلہ بھی بڑھاتے رہے ہیں معذرت خواہ ہوں بلکہ اپنے ان محسن دوستوں سے بھی معذرت خواہ ہوں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ میرے ہاتھوں میں قلم تھمایا بلکہ اس قلم کو چلانے کے لیے قدم قدم پر میری رہنمائی کرتے رہے ہیں اور تاحال کر رہے ہیں۔ ان محسنان میں جناب احمد ندیم اعوان اور انکی ٹیم کے دیگر ارکان محترم محمد نعیم، فاروق اعظم اور جناب حفیظ خٹک بطور خاص شامل ہے۔

میں چونکہ یمن کے حوالے سے پاکستانی پارلیمان کی مشترکہ اجلاس کے حوالے سے لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا، لیکن بدھ 8 اپریل کو نماز مغرب کے وقت ایک بات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کی بجائے اس بات پر لکھنے کی کوشش کروں جو بات آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے۔

8 اپریل کو مدنی مسجد واقع سید آباد گنبد میرہ، مینگورہ سوات میں مغرب کی

نماز کے بعد ایک شخص بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ یوں گویا ہوئے۔ ''اللہ تعالی کے واسطے میرے ساتھ روٹی سالن کی مد میں کچھ تعاون کیجیے تاکہ میں وہ روٹی سالن اپنے بچوں کو کھلا سکوں، میں ایک ٹھیلہ لگانے والا آدمی ہوں اور آپ مجھے جانتے بھی ہے۔ لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہے کہ میں دوا اور غذا دونوں کا انتظام کرسکوں،،۔ اتنا کہہ کر وہ شخص پیشہ ور بھکاریوں کی طرح دروازے پر جاکر نہیں بیٹھا بلکہ انہوں نے آرام سے سنتیں پڑھی اور سنتیں پڑھنے کے فوری بعد محلے کا ایک تندور والا اسے اپنے ساتھ تندور پر لے گیا۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ تندور والے نے اس کے ساتھ اور کیا تعاون کیا ہوگا؟ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ واپسی میں ان کے ہاتھوں میں روٹیوں سے بھرا ایک شاپر موجود تھا، جس میں آٹھ، دس روٹیاں موجود تھیں۔

قارئین کرام! اس بندے کی کہانی ملاحظہ کرنے کے بعد آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کی آخر کن وجوہات کے بنا پر ایک صحت مند اور جوان آدمی نے لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلایا۔ ان وجوہات کے بارے میں تو خیر میں آپ کو بتاوں گا ضرور لیکن اس سے پہلے یہ بھی پڑھ لیجیے کہ آنے والے دنوں میں سوات کے مرکزی شہر اور اس کے گرد و نواح میں اس قسم کے واقعات اور بھی دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ لیکن کیوں مل سکتے ہیں تو آئیں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قدرتی حسن سے مالامال وادی سوات اپنی خوب صورتی کے بنا پر پاکستان کا سوئٹزرلینڈ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال بڑی تعداد میں ملکی اور غیر ملکی سیاح اس وادی کا رخ کرتے ہیں اور یہاں کے خوب صورت قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اس خوبصورت علاقے کے باسیوں کو ہمیشہ سے ایک مسئلے کا سامنا رہا ہے اور وہ مسئلہ ہے روزگار کا۔ یہاں روزگار کے ذرائع اتنے نہیں ہے جتنے کہ ہونے چاہئیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر اور اس علاقے کے لوگ دوسرے شہروں یا پھر وطن عزیز سے کوسوں دور دیار غیر میں محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو یا وہ لوگ جو بڑے پیمانے پر کاروبار کررہے ہیں ان کو چھوڑ کر دیگر لوگ جو سوات شہر میں محنت مزدوری کرکے اپنے اہل وعیال کے لیے دو وقت کی روزی کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے پاس دو آپشنز ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اگر ان کے پاس کچھ روپیہ پیسہ ہے تو اس سے ایک رکشہ لے لیں اور اسے چلاتا رہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی شخص رکشہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ '' جو کہ لوگوں کی بڑی تعداد نہیں رکھتا'' تو وہ کرایہ پر ایک ٹھیلہ لے کر اس پر پھل یا سبزی لگائے اور اسے فروخت کرکیااپنے اہل و عیال کی پرورش کرتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کے محنت کش ان دو ذرائع سے اپنے خاندان کی کفالت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں پر کسی نہ کسی شکل میں چھوٹے پیمانے پر انڈسٹری بھی موجود ہے۔ لیکن ان کارخانوں میں لیبر کا جو استحصال کیا جاتا ہے اس کے لیے ایک الگ کالم لکھنے کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک عام آدمی کسی کارخانے میں کام کرنے کی بجائے ٹھیلہ لگانے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن ان دنوں سوات کا وہ محنت کش جو ٹھیلے کے کام سے وابستہ تھا، عجیب کشمکش کا شکار ہے۔ اسے سمجھ نہیں آرہی کہ وہ آخر کرے تو کرے کیا۔ کیوں کہ ان کاروبار ختم اور پریشانیوں کا دور شروع ہوچکا ہے۔ ان محنت کشوں کا روزگار ختم کیوں اور کیسے ہوا؟ !ملاحظہ فرمائیں

ضلع سوات کے مرکزی شہر مینگورہ اور اسکے قریبی بازاریں یہاں کے بڑی تجارتیں مراکز میں سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی الصبح سے لے کر شام تک یہاں گہما گہمی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے سوات شہر کا مرکزی سڑک جو کہ ڈاک خانہ روڈ سے شروع ہوکر رحیم آباد تک جاتی ہے اتنی کشادہ نہیں ہے کہ وہ بیک وقت گاڑیوں، پیدل چلنے والوں اور ٹھیلے والوں کا بوجھ برداشت کرسکے۔ اسی بناپر یہاں اکثر ٹریفک جام رہتی ہے۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ دو مہینے پہلے یہاں کے ضلعی انتظامیہ نے مختلف سڑکوں پر سے تجاوزات کے خاتمے کے لیے آپریشن کا آغاز کیا۔ اس آپریشن کے زد میں سب سے پہلے وہ ٹھیلہ لگاکر محنت کرنے والے مزدور آئے، اور یوں ان کا کاروبار ختم ہوکر رہ گیا۔

تجاوزات کیسے بھی ہوں اور کہیں بھی ہو یہ کسی بھی شہر کے سڑکوں اور بازاروں میں ایک بدنما داغ کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے خاتمے کی جو بھی کوشش ہوتی ہے اس کوشش کی بلاوجہ مخالفت کوئی بھی باشعور شخص یا مہذب معاشرہ نہیں کرسکتا۔ اسی بنا پر سوات میں تجاوزات کے خلاف جو آپریشن ہو رہا ہے اس کالم کا مقصد ہرگز اور ہرگز اس کی مخالفت یا اس پر تنقید کرنا نہیں۔ لیکن اس کالم کا مقسد اتنا ضرور ہے کہ سوات کے ضلعی انتظامیہ اور پاکستان تحریک انصاف کے صوبائی قیادت کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف دلائے جن سے آج کل سوات کے مزدور طبقہ پریشان ہے۔ جیسا کہ اس کالم میں عرض کیا جاچکا ہے کہ سوات میں عوام کی ایک بڑی تعداد ٹھیلہ لگا کر اس پر پھل سبزیاں فروخت کرکے اس سے اپنے خاندانوں کی معاشی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ اب چونکہ سوات میں تجاوزات کے خلاف آپریشن کے بعد مذکورہ طبقہ کام سے محروم ہوچکا ہے۔ اور اب ان کے گھروں میں پریشانیوں کا دور دورا ہے۔ جس کی ایک مثال ہم مدنی مسجد میں دیکھ چکے ہیں۔ اور نہ جانے آگے یہ سلسلہ کہاں تک جائے گا۔ اس لیے اس سلسلے کو یہی پر روکنے کے لیے یہاں کے ضلعی انتظامیہ اور پی ٹی آئی کے مقامی و صوبائی قیادت کو آگے بڑھتے ہوئے ان محنت کشوں کا سہارا بننا ہوگا۔ اور اس کے لیے میرے خیال میں سب سے اہم کام یہ ہوگا کہ ان لوگون کو ایسے مختلف جگھوں پر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ جہاں ان کا کام بھی چلتا رہے اور عام عوام پریشانی سے بھی بچے رہے۔ اگر دل میں درد ہو تو ایسے جگھون

کی تلاش یقیناً کوئی مشکل کام نہیں۔

آخر میں ایک اہم بات یہ کہ اگر پاکستان تحریک انصاف کی صوبائی حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہ کی تو عین ممکن ہے کہ آنے والے بلدیاتی انتخابات میں نتائج ان کے حق میں اتنے بہتر نہ ہو جتنا کہ وہ توقع لگائے بیٹھے ہے۔

قصور کیا تھا ان بچاروں کا

وطن عزیز پاکستان کا صوبہ بلوچستان ایک بار پھر دہشت گردی کا نشانہ بنا۔ اس بار صوبہ بلوچستان کا علاقہ تربت دہشت گردوں کا ہدف رہا۔ جہاں درندوں نے دن بھر کے تھکے ہوئے مزدوروں کو اس وقت نشانہ بنایا جب وہ سو رہے تھے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق تربت میں ایک زیر تعمیر پروجیکٹ پر کام کرنے والے مزدوروں کو دہشت گردوں کے ایک گروہ نے رات ڈیڑھ بجے نشانہ بنایا۔ جس میں بیس افراد جاں بحق جبکہ باقی تین زخمی ہو گئے۔ جاں بحق افراد کا تعلق سندھ اور پنجاب سے تھا۔ جن کی میتیں گھروں میں پہنچانے کے بعد کہرام مچا۔ ان گھروں میں قیامت صغریٰ کے مناظر تھے۔ روتے پیٹتے رشتہ دار اور سسکتی ماؤں کے غم دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔ ہر کوئی اس سوچ میں تھا۔ کہ آخر قصور کیا تھا ان بچاروں کا۔

وزیر اعلیٰ بلوچستان کے ترجمان کے مطابق مزدوروں کی حفاظت پر مامور سیکیورٹی اہلکاروں اور دہشت گردوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا۔ لیکن دہشت تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمین گاہوں کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ میڈیا کو دیئے گئے ایک بیان میں صوبائی وزیر داخلہ کا کہنا تھا کہ واقعے کے پیچھے ہندوستان کا ہاتھ ہے اور یہ کہ مذکورہ

کارروائی بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کے فنڈڈ دہشت گردوں نے کی ہے۔ یاد رہے کہ ان مزدوروں کی سیکیورٹی پر مامور 8 اہلکار غفلت برتنے پر فوری گرفتار کر لیے گئے تھے۔

مذکورہ بالا دہشت گردانہ کارروائی بلوچستان میں کوئی پہلی بار نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے پہلے بھی کئی بار ملک کے مختلف حصوں بالخصوص بلوچستان میں دہشت گرد اس قسم کی کارروائیاں کر چکے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے تانے بانے ہندوستان سے جا کے ملتے ہیں۔ اور اس کا اندازہ آپ صوبائی وزیر داخلہ کے حالیہ بیان کے علاوہ ماضی میں دیئے گئے حکومتی اور اعلیٰ سیکیورٹی عہدیداران کے بیانات سے لگا سکتے ہیں۔ لیکن افسوس سے لکھنا پڑتا ہے۔ کہ ان سب واقعات اور اس کے بعد مختلف حکومتی بیانات کے بعد جب ہم اپنی خارجہ پالیسی بالخصوص نواز حکومت کی خارجہ پالیسی پر نظر ڈالتے ہے۔ تو وہاں ہندوستان کے لیے سوائے ہمدردی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ کوئی بھی پاکستانی یہ نہیں چاہتا کہ ہم جا کر ہندوستان پر یلغار کر دیں، بلکہ ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ چونکہ ہندوستان ہمارا ہمسایہ ملک ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ بہتر تعلقات ہونے چاہیے۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم بات کریں ہندوستان کی۔ تو وہاں ہمیں ہر سطح پر سوائے پاکستان کی مخالفت کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ خود کو عالمی سطح پر

سیکولرزم کا علمبردار ملک ظاہر کرنے والے ملک میں جب وزیر اعظم جیسے انتہائی اہم عہدے کا چناؤ ہوتا ہے تو جیت اکی ہوتی ہے۔جو مسلم امہ بالخصوص پاکستان دشمنی میں اپنی مثال آپ ہو۔لہٰذا ایک ایسے ملک کہ جس کے منشور میں یہ بات شامل ہو۔کہ جلد یا بدیر پاکستان کو ختم یا اس کے جغرافیائی سرحدوں کو تبدیل کرنا ہے۔ایسے ملک سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم لاکھ ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے، اس کے روییۓ میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ ہمیشہ پاکستان کوزک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔

یہ ہندوستان ہی تھا کہ جسکی مکاریوں اور چالبازیوں کی وجہ سے ایک طرف ہمیں سقوط ڈھاکہ جیسا عظیم سانحہ دیکھناپڑا، تو دوسری جانب سیاچن اور کشمیر وغیرہ میں ہمیں بھارتی غاصبانہ قبضے کا سامنا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پاکستانی پانیوں پر غیر قانونی ڈیم بنانا اور آئے روز سرحدی علاقوں میں بلااشتعال کارروئیاں کرنا ہندوستان کا وطیرہ بن چکا ہے۔ خود اگر ملک کے اندر نگاہ ڈالی جائے تو بھارت ہر لمحے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے وطن عزیز کو غیر مستحکم کرنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتا ہے۔ جس کی ایک مثال سانحہ تربت کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ جس کی ذمہ داری بلوچستان لبریشن فرنٹ قبول کرچکی ہے۔ گوکہ اس سانحے کے فوری بعد ہماری سیکیورٹی فورسز نے ایک کارروائی میں اس

حملے کی منصوبہ بندی کرنے والے بعض دہشت گردوں کو مار گرایا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت وقت نہ صرف بھارت کے ساتھ اس اہم مسئلے کو پر زور طریقے سے اٹھائے، بلکہ عالمی برادری کی توجہ بھی بھارت کے جارحانہ عزائم کی طرف دلائے۔ یہی نہیں بلکہ حکومت کو بیانات سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے فوری اقدامات اٹھانے ہونگے۔ ساتھ ہی ساتھ بلوچ عوام کو روٹی کپڑے، مکان، تعلیم اور علاج جیسے انتہائی اہم اور بنیادی حقوق فاالفور مہیاں کرنے ہونگے۔ تاکہ کسی بھی مشکل میں وہ بھی افواج پاکستان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر دشمن کے عزائم ناکام بنانے کے قابل ہو۔ فی الوقت صورتحال یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے تو وہاں پر ہندوستانی عزائم کو ناکام بنا رہے ہیں۔ لیکن سیاسی قیادت کو اس سلسلے میں ابھی اور بھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچستان کے بعض علاقے اور وہاں کے لوگ اس دور جدید میں بھی بعض بنیادی سہولیات سے محروم ہی نہیں ناآشنا بھی ہے اور اس کی ایک جھلک ہم ماشکیل میں ہونے والے زلزلے کے بعد وہاں کی عوام کی حالت زار جان کر دیکھ چکے ہیں۔

بھائی کی پکار

یہ جو دو دہشت گرد ہم نے پکڑے ہیں انہوں تسلیم کیا ہے کہ یہ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ایجنٹ ہے۔ یہ اور ان جیسے کئی دیگر دہشت گردوں کو ہندوستانی حکومت اور انکی خفیہ ایجنسی را تربیت دیتی ہے اور پھر ان کو پاکستان بھیج کر یہاں پر دہشت گردی کرائی جاتی ہے۔ ان دہشت گروں جن کے نام جنید اور طاہر لمبا ہے۔ انکا تعلق متحدہ قومی مومنٹ سے ہے۔ متحدہ قوی مونٹ کے قائد الطاف حسین ،ندیم نصرت اور محمد انور کے ہندوستانی خفیہ ایجنسی را سے بڑے قریبی تعلقات ہے۔ الطاف حسین "را" سے احکامات لے لندن سیکٹریٹ کے ندیم نصت اور محمد انور کو دیتے ہیں۔ وہ کراچی میں ایم کیو ایم ہیڈ کوارٹر میں موجود حماد صدیقی اور فاروق سلیم کو اور وہ انہی ہدایات کو متعلقہ سیکٹر کے حوالے کر دیتا ہے ۔ جس کے بعد اس پر کاروائی شروع ہو جاتی ہے۔ایم کیو ایم طالبان سے بھی زیادہ خطرناک تنظیم ہے۔ کیونکہ طالبان صرف معصوم لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ جبکہ ایم کیو ایم براہ راست دشمن ملک ہندوستان اور اس کے خفیہ ایجنسی سے رابطے میں ہے اور ملک کو نقصان پہنچانے میں مصروف ہے۔ یہ ایک دہشت گرد تنظیم ہے۔ میرے خیال میں اس پر پابندی عائد ہونی چاہیے اور میں اس کے لیے سفارش کروں گا۔ کراچی میں ایس ایس پی ملیر

راؤ انوار کا انکشافات بھری پریس کانفرنس ختم ہوئی تو ہر طرف ہلچل مچ چکی تھیں۔ اہل وطن بالخصوص اہل کراچی منتظر تھے کہ اب ایم کیو ایم کا کیا ردعمل آئے گا۔ گو کہ شہر میں جاری ٹارگٹڈ اپریشن اور دہشت گردوں کے خلاف قانوں نافذ کرنے والے اداروں کی مؤثر کارروائیوں کے بعد یہ امکان تو نہیں تھا کہ ایم کیو ایم کسی ہڑتال وغیرہ کی کال دے گی۔ لیکن اس بات کا امکان ضرور تھا کہ ایم کیو ایم اپنے اعلان کردہ پریس کانفرنس میں ضرور کسی قانونی چارہ جوئی کے لیے عدالت جانے کا اعلان کر سکتی ہے۔ کچھ دیر میں جب ایم کیو ایم کی پریس کانفرنس شروع ہوئی تو اس میں انہوں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی سختی سے تردید کی اور پاکستان کے ساتھ بھرپور وفاداری کا اظہار بھی کیا۔ اپنے اس روایتی پریس کانفرنس میں ایم کیو ایم کے رہنماء حیدر عباس رضوی نے ایس ایس پی راؤ انوار کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے ان کو قاتل اور کرپٹ ترین پولیس اافسر قرار دیا۔ بلکہ حیدر عباس نے انہیں سندھ میں حکمران جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کا چیلہ بھی قرار دیا۔ قارئین کرام ! ان دونوں پریس کانفرنسز پر بحث ابھی جاری تھی اور بہت سارے لوگ اور تجزیہ نگار راؤ انوار کے بریک گراؤنڈ کو دیکھ کر کشمکش میں مبتلاء تھے کہ اچانک متحدہ قائد بذریعہ ٹیلیفون لائن اکھاڑے میں کھود پڑے۔ موصوف نے سب سے پہلے ”مہاجروں“ کو یہ تلقین کی کہ وہ ہر قسم کے حالات کے لیئے

خود کو جسمانی طور پر تیار رکھیں، کارکنان اسلحہ چلانا سیکھیں اور اس کے لیے کلفٹن جا کر مشق کیجیے۔ کارکنان کو ''نصیحت'' کے بعد بھائی اپنے روایتی حریف یعنی پاک آرمی پر بھی خوب گرجے۔ پھر ان کو جی ایچ کیو، کامرہ بیس وغیرہ پر دہشت گردانا حملوں کا طعنہ دیتے ہوئے کہا: کہ پہلے اپنے اندر کے مجروں کو تو سنبھالو بعد میں ہماری طرف دیکھنا۔ اس کے بعد بھائی نے دھاڑتے ہوئے ''را'' کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ راااا والوں ایک بار تو ہماری مدد کو آ جانا۔ تاکہ میں دیکھ لوں کہ مخالفین میں کتنا دم خم ہے۔

سوچتا ہوں کہ بھائی تو پریس کانفرنس کے بعد لندن میں چائے کا چسکا لیتے ہوئے خوب لطف اندوز ہو چکے ہوں گے۔ کیونکہ جو بات بھائی پچھلے کافی عرصے سے اشاروں میں اہل پاکستان کو سمجھا رہے تھے لیکن اہل وطن بالخصوص سیاسی جماعتوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آج صاف صاف اور بغیر کسی لگی لپٹی بیان کرکے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر دیا تھا۔ لیکن کیا حال ہوا ہوگا پاکستان میں پریس کانفرنس کرنے والے متحدہ رہنماؤں بالخصوص حیدر عباس رضوی کا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے بے چارے حیدر عباس رضوی وطن عزیز پاکستان سے محبت کا دم بھر رہے تھے، وہ اس پاک دھرتی سے وفاداری کی قسمیں کھا رہے تھے۔ لیکن بھائی نے آ کر اس کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ رسید کیا جس کی تپش وہ تادیر محسوس کریں گے۔ بشرطیکہ حیدر عباس رضوی نے جھوٹی نہیں سچی قسمیں کھائی ہو۔ میں اس بات پر

بھائی کا انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے مؤقف کو بیان کیا اور منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کا تعین بھی کر لیا۔ بھائی کے اس بیان کے بعد ٹی وی ٹاک شوز میں بیٹھے تجزیہ نگاروں کی مشکل بھی آسان ہو جائیں گی کیونکہ وہ بے چارے کافی عرصے سے اس فکر میں مبتلاء تھے کہ اگر متحدہ ملک دشمن تنظیم اور بھائی کے ''را'' سے رابطے ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے۔ اب امید ہے کہ بھائی کی باتوں سے انہوں کچھ نہ کچھ اندازہ لگالیا ہوگا۔ اگر ان کو اب بھی اندازہ نہیں ہو رہا تو پھر بہتر ہوگا کہ وہ بھی بڑے سائیں جناب قائم علی شاہ صاحب کے پاس تشریف لے جائے۔ کیونکہ وہ ایک شریف النفس انسان ہے اور بدمزگی کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ ٹارگٹ کلنگ میں مارے جانے والے پولیس آفیسرز اور جوانوں کے جنازوں کو کندھا دینے کا جذبہ رکھتے ضرور ہے۔ لیکن بدمزگی پیدا ہو جانے کی خدشے کے پیش نظر وہ ایسا کرتے نہیں۔ البتہ بدمزگی دور کرنے کے لیے کسی پولیس آفسر کی قربانی دینی پڑ جائے۔ تو شاہ صاحب اس سے بالکل بھی دریغ نہیں کرتے۔ کچھ یہی حال شاہ صاحب کی پارٹی کے دیگر رہنماؤں کا بھی ہے اب تک ''بھائی'' کے ترجمان بنے ہوئے ہیں۔ جہاں بات ہے بادشاہ مفاہمت تو ان کا اب تک جو مؤقف سامنے آچکا ہے وہ وزیر اعظم کا نہیں بلکہ ایم کیو ایم کے کسی کارکن کا لگ رہا ہے۔ البتہ ان کے چھوٹے بھائی پرنس آف پنجاب میاں شہباز شریف نے بھائی'' کی باتوں کو ملک سے غداری کا مترادف قرار دیا ہے۔ وزیر دفاع نے بھی اس'' بار اپنے منصب کا خیال

رکھتے ہوئے بھائی کی باتوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ لیکن جس چیز نے پیر آف کی یا جانب سے جاری بیان ۔ISPR لندن کی غبارے سے ہوا نکال دی ہے۔ وہ ہے جس کے بعد پیر آف لندن چنگاڑنے کی بجائے منمناتے نظر آرہے ہیں۔ لیکن شائد اب کے بار منمنانا کام نہ آئے کیونکہ ہر غلطی معاف ہو سکتی ہے لیکن ''را'' سے مدد مانگنا ہرگز نہیں۔ آخر میں صرف اتنا کہ جو کام بلوچستان اسمبلی نے ''بھائی'' کے ہرزہ سرائی کے خلاف قرارداد منظور کر کے کیا ہے۔ اہل وطن اس پر بلوچستان کے غیور عوام کو سلام پیش کرتی ہے۔

اگر ووٹ امانت ہے۔۔۔

خیبر پختون خواہ میں جوں جوں بلدیاتی الیکشن قریب آ رہا ہے ، بلدیاتی الیکشن لڑنے والے امیدواروں کی مصروفیات بھی ویسے ویسے بڑھ رہی ہیں۔آئے روز صوبے کے مختلف علاقوں میں مختلف سیاسی جماعتوں اور آزاد امیدواران کی جانب سے کارنر میٹینگز، ریلیوں اور ڈور ٹو ڈور رابطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ چند دن پہلے ضلع سوات کے یونین کونسل ملوک آباد سے الیکشن لڑنے والی ایک سیاسی پارٹی کے مقامی امید وار نے اپنے سپورٹرز کے ہمراہ علاقے کے ایک معزز شخصیت کے گھر کا دورہ کیا۔ چونکہ مہمان اپنی آمد اور آمد کا مقصد پہلے سے بتا چکا تھا۔ اس لیے حاجی صاحب نے بھی موقع کی مناسبت کو مد نظر رکھتے ہوئے آڑوس پڑوس سے چیدہ چیدہ لوگوں کو اپنے مہمان خانے پر مذکورہ بالا سیاسی شخصیت کے آنے سے پہلے مدعو کیا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس سیاسی شخصیت کے حاجی صاحب سے تعلقات بس علیک سلیک کی حد تک تھے۔ اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ اس پروگرام میں مہمانوں کے لیے جس ظہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ پختون روایات کے برعکس اس کا انتظام مہمان یعنی اس سیاسی شخصیت نے خود کیا تھا۔ اگرچہ حسب توقع حاجی صاحب نے اس پر کافی برا منایا تھا۔ بہر حال مہمان حضرات تشریف لے آئے اور حاجی صاحب کی جانب سے ان کا پر تپاک استقبال کیا گیا۔ اس

کے کچھ دیر بعد بلدیاتی الیکشن لڑنے والے امیدوار نے علاقے اور اہل علاقہ سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا اور حسب ''سیاسی روایات'' حاضرین سے کچھ وعدے کیے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ 30 مئی کو اگر آپ نے مجھ پر اعتماد کیا اور مجھے ووٹ دیا۔ تو میں آپ لوگوں کو مایوس نہیں کروں گا۔ امیدوار نے جب اپنی بات مکمل کی تو حاجی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ حاجی صاحب نے ویسے باتیں تو اور بھی کہیں لیکن جو بات خصوصی طور پر قابل ذکر ہے اور جس بات نے مجھے یہ کالم لکھنے پر مجبور کیا وہ یہ کہ موصوف نے اپنی گفتگو کا اختتام کچھ یوں کیا۔ ووٹ خو بہ اسی بل یو خنزیر لہ ور کوؤنو تالہ ہئ راکو۔ جس کا مطلب ہے '' ووٹ تو ویسے بھی کسی خنزیر کو دینا ہے، تو آپ ہی کو دے دیں گے'' حاجی صاحب کے اس انداز گفتگو کا ممکن ہے حاضرین میں سے کسی نے برا منایا ہو، یا کسی نے مذاق سمجھ کر زیر لب مسکرانے پر ہی اکتفا کیا ہو، لیکن جب مجھے حاجی صاحب کے اس جملے کا ایک نہایت ہی بااعتماد ذرائع نے بتایا۔ تو مجھے الیکشن 2013 یاد آیا۔ 2013 کے الیکشن سے پہلے عالم اسلام کے ایک نامور دینی ادارے '' جامعہ دارالعلوم کراچی'' کے صدر نہایت ہی قابل احترام جناب مفتی رفیع عثمانی یا غالبًا ان کے چھوٹے بھائی عالم اسلام کے نامور شخصیت محترم جناب مفتی تقی عثمانی کی جانب سے تحریر کردہ وہ کتابچہ یاد آیا۔ جس میں ووٹ کو ایک امانت قرار دے کر اسے اہل اور مستحق فرد کو دینے اور اہل فرد ہونے کے باوجود ووٹ کسی نااہل شخص کو دینے اور پھر اس کے

نتائج کے بارے میں کھل کر ہدایات بیان کی گئی تھی۔ میں نے جب اس کتاب کے بارے میں غور کیا اور پھر حاجی صاحب کے رویئے کے بارے میں سوچا تو میں سوچوں میں گم ہوتا چلا گیا۔ میں سوچ ہی سوچ میں اس مقام تک پہنچا کہ جہاں کچھ عرصہ پہلے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ہی ووٹوں سے منتخب کردہ ایم پی اے کے خلاف بڑے سخت الفاظ میں صرف اس لیے بول رہے تھے۔ کہ ایم پی اے صاحب نے منتخب ہونے کے بعد علاقے میں ترقیاتی کام کرنا تو کجا اہل علاقے کو اپنا دیدار کرانے کا بھی قابل نہ سمجھا۔ میں نے اس موقع پر ایک صاحب سے پوچھ لیا کہ بھیا! آج دل جلانے سے بہتر نہ تھا کہ کل انتخاب کے وقت آپ سوچ سمجھ کر کسی موزوں شخص کو ووٹ دیتے؟ تو وہ صاحب یوں گویا ہوئے: یہی تو سب سے زیادہ موزوں تھا۔ میں نے پھر سوال کیا وہ کیسے؟ تو اس نے کہا کہ یار اس کا جو بڑا سیاسی حریف ہے اس سے تو ہماری برادری والوں کی بنتی ہی نہیں۔ وہ کتنی بار ووٹ مانگنے آچکے ہیں۔ لیکن ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسے ووٹ بالکل بھی نہیں دیں گے۔ دوسرے ایک مولانا کھڑے تھے، تو ابھی آپ خود سوچیں کہ ایک مولانا بے چارہ ہمارے لیے کر بھی کیا سکتا ہے۔ جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کے کئی معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں کسی با اثر شخص کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ مثلاً: تھانہ، تحصیل سے لے کر کورٹ کچہری تک کے معاملات۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ملا کی دوڑ مسجد تک اب اگر ایک ملا کہ جس کی رہائش بھی مسجد کے گھر میں ہو۔ اسے بھلا کوئی کیوں ووٹ دے۔ میں نے ان سے

آخری سوال یہ پوچھا کہ آپ کی برادری کا ووٹ بنک کتنا ہوگا اور ان میں سے کتنے لوگ ایسے ہوں گے جن کو کورٹ کچہری جیسے مسائل کا سامنا ہے؟ تو اس نے کہا کہ ووٹ تو ہمارا ہزاروں میں ہے جبکہ دو چار لوگوں کو کورٹ کچہری جیسے مسائل کا سامنا ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا سوچیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر ایسا ہوتا کہ ہم بات تو نظریے اور اصول کی کرتے ہیں۔ لیکن جب اس پر عمل کرنے کا موقع آتا ہے تو ہمارا عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اگر ہم صرف الیکشن ہی کی بات کریں تو اس میں بھی یہی ہوتا ہے۔ کہ ایک باکردار، شریف النفس اور خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والا شخص صرف اس لیے ہمارے ووٹ سے محروم رہ جاتا ہے کہ اس سے ہمارا ذاتی تعلق، برادرانہ مراسم بہت زیادہ گہرے نہیں ہوتے یا پھر ان کے ہاتھ اتنے "لمبے" نہیں ہوتے۔ ہم اس وقت تو ذاتی تعلق، برادرانہ مراسم اور جس کو ہم ووٹ دیتے ہیں ان کے اثر ورسوخ کو سامنے رکھتے ہوئے منتخب کر لیتے ہیں۔ لیکن بعد میں ہمارے پاس سوائے پچھتانے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے کل کے پچھتاوے اور پیشمانی سے بچنے کے لیے لازم ہے کہ ہم ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اہل اور ایماندار افراد کو منتخب کریں۔ چاہے وہ قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوں یا پھر بلدیاتی انتخابات۔ اگر ہم نے اہل

لوگوں کو منتخب کرلیا تو پھر ان شاء اللہ ہم انہیں اپنے درمیان موجود بھی پائیں گے اور جب وہ موجود نہیں ہوں گے تب ان کی تعریف بھی کریں گے۔ ناکہ ان پر غصہ نکالیں گے ۔ لیکن ''حاجی صاحب سے معذرت کے ساتھ'' اگر ہم ووٹ ''خنزیروں'' میں بانٹنے کے باوجود بھی بھلائی کی امید رکھیں تو پھر ممکن ہے کہ لوگ ہمیں نارمل انسان تصور کرنا چھوڑ دیں۔ تب اس صورت میں قصور ہمارا ہی ہوگا ناکہ لوگوں کا۔

یوم آزادی ایک نئی امید کے ساتھ

یوم آزادی کے حوالے سے خصوصی تحریر

الحمداللہ ! اہل وطن آج یوم آزادی ایک بار پھر نہایت ہی جوش و ولولے سے منا رہی ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی تو ہے ہی کہ اس دن باوجود تمام تر مشکلات کے ایک عظیم اسلامی مملکت وجود میں آئی ۔ یہ الگ بات ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کی شہادت کے صلے ملنے والی اس عظیم مملکت کو تو ہم اپنی نااہلیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اسلامی تو کیا ایک درمیانے درجے کی فلاحی مملکت بھی نہ بنا سکے۔ یہی وجہ رہی کہ ہر سال یوم آزادی مناتے وقت جہاں خوشی محسوس ہوتی ،تو وہی دل کے کسی گوشے میں مارے افسوس کے ٹھیس سی بھی اٹھتی تھی۔ کیونکہ جس مقصد کے لیے اس پاک وطن کو ہمارے بزرگوں نے حاصل کیا تھا، اس مقصد کو ہم مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں اوراس بات کااندازہ آپ اس بات سے لگائیں ،کہ اسلام کے نام پر بننے والے اس پاک وطن میں ہر وہ کام دھڑلے سے کیا جارہاہے، جس کا اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ کرپشن، اقربا پروری، قتل و غارت گری ، سود خوری اور لسانی تعصب اس کی واضح مثالیں ہیں۔ دوسری طرف اگر بات کی جائے اپنی مقبوضہ علاقاجات کی، قریب میں موجود ہمسائے مگر وطن عزیز کے

ازلی دشمن ہندوستان سے چھڑانے کی۔ تو اس سلسلے میں وطن عزیز کی سیاسی قیادت بشمول حکومت اور اپوزیشن (چند ایک کو چھوڑ کر) مکمل طور غفلت کے شکار اور خواب خرگوش سوتے نظر آرہے ہیں۔ اسی بنا پر یوم آزادی مناتے وقت اہل وطن کے ذہنوں میں یہ سوال ضرور سر اٹھاتا رہا ہے۔ کہ کیا کبھی پاکستان قائد کا پاکستان بن سکے گا؟ میں اس بات پر خوش ہوں اور اہل وطن کو بھی یہ خوش خبری دینا چاہتا ہوں۔ کہ بڑے عرصے بعد یہ امید ہو چلی ہے اور ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اب یہ آس لگا سکتے ہیں کہ اب انشاء اللہ یہ ملک قائد کا ملک بنے گا اور ہم بتدریج اس منزل تک پہنچیں گے۔ جن تک پہنچنا کچھ عرصے پہلے تک کسی خواب سے کم نہ تھا۔ میں یہ امید کیوں لگائے بیٹھا ہوں؟ تو اس کے پیچھے کچھ ٹھوس وجوہات اور مضبوط دلائل ہیں۔ مثلاً: انڈیا: کہ جس نے آزادی سے لے کر آج تک ہمیں دل سے نہ صرف یہ کہ تسلیم ہی نہیں کیا، بلکہ اس نے ہمیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دوسری طرف اگر ہم اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ڈالے۔ تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ انڈیا سے بہتر تعلقات اور دوستی کے لیے بے تاب نظر آتا ہیں۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش ہی کیا کہ موجودہ دور میں کوئی ملک یا قوم جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بات ہندوستانی قیادت کو سمجھ نہیں آتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں

کہ کب پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ملے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اسی بنا پر میں یہ بات لکھنے پر مجبور ہوں کہ ایسے عیار اور مکار ہمسائے کے لیے نیک خواہشات رکھنا خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے اور اب تک ہماری قیادت یہ کلہاڑی اپنے پیروں پر مارتی چلی آئی ہے۔ لیکن مقام شکر ہے۔ کہ اب حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں اور ہندوستانی عزائم کو ناکام بنانے کے لئے سیاسی و عسکری قیادت سمیت پوری قوم یکسو ہو چکی ہے۔ قوم یہ توقع بھی رکھتی ہے کہ نواز حکومت آگے چل کر بھی یکطرفہ دوستی کے بجائے قومی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے انڈیا سے تعلقات کے حوالے سے فیصلہ کرے گی۔ جہاں تک تعلق ہے عسکری قیادت کی۔ تو انڈیا کے حوالے سے اس وقت ان کا موقف اور پاک چین اقتصادی راہداری میں ان کی دلچسپی اور ان کی راہ میں دشمن کی جانب سے کسی بھی سازش کو ناکام بنانے کا عزم نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ لائق تحسین بھی ہے۔ دوسری اہم اور مثبت تبدیلی جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ کراچی کے حوالے سے ہے۔ کسے امید تھی کہ قائد کا شہر، کروڑوں پاکستانیوں کی ممتا کی گود کی مانند اور پاکستان کا معاشی شہ رگ ایک بار پھر روشنیوں کا شہر بن سکے گا۔ کیونکہ مفاد پرستانہ پالیسیوں کی بھینٹ چڑھنے والے اس شہر میں بھتہ خوری ایک انڈسٹری کا روپ دھار چکی تھی، سرکاری اراضی اور رفاہی پلاٹوں پر قبضہ جمانا بعض سیاسی جماعتیں اور ان کے ہمدرد اپنا صوابدیدی حق سمجھتے تھے، زندہ انسانوں کو صدقے کے بکرے سمجھ کر اپنے اپنے قائدین کے درازی

عمر کی خاطر دھڑا دھڑ ان کا خون کرنا اور اغوا برائے تاوان کو آنکھ مچولی سمجھ کر اسے دہرانا روز کا معمول بن چکا تھا۔ ایسے حالات میں اہل کراچی مکمل طور پر خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ اہل کراچی یہ بھی سوچ رہے تھے کہ شائد حالات اب کبھی بھی نہیں سدھریں گے۔ کیونکہ جن کا کام مسیحا بن کر عوام کو سکھ اور چین پہنچانا تھا، وہی بھیڑیں بن کر عوام کا خون چوس رہے تھے۔ لیکن پھر پاکستان رینجرز نے کراچی میں تمام تر سیاسی دباو کو مسترد کرتے ہوئے بھرپور ٹارگٹڈ اپریشن کا آغاز کیا'' جو کہ تا حال جاری ہے'' جس کے نتیجے میں خوف کے سائے تلے زندگی گزارنے والے اہل شہر نے سکھ کا سانس لیا اور امن و امان کی صورتحال بھی کافی حد تک بہتر ہو گئی جس کے بعد اب امید ہے کہ نہ صرف ملک چھوڑنے والے سرمایہ کا اب شہر قائد میں بلاخوف وخطر سرمایہ کاری کریں گے بلکہ ممکن ہے کہ دیگر ممالک کے کاروباری حضرات بھی کراچی کا رخ کریں گے۔ ایک اور امید افزا بات بلوچستان کے حوالے سے ہے۔ معدنی زخائر سے مالا مال، رقبے کی لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بلوچستان کچھ حکومتوں کی ناروا سلوک اور کچھ اغیار کی سازشوں کی وجہ سے مکمل طور تباہی کے دہانے پہنچ چکا تھا۔ جہاں پاکستان کا نام لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن اب امید ہو چلی ہے کہ انشاء اللہ بتدریج بہتر ہونے والے حالات بہت جلد پائدار امن میں تبدیل ہو جائیں گے۔ یہاں ایک اہم بات سپرد قلم کرتا چلوں کہ بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے اہل وطن کے حالات زار کسی طور پر بہتر نہیں اور

وہ بیشتر بنیادی حقوق سے محروم ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ اداروں کو کاغذی منصوبے بنانے کی بجائے عملی طور میدان میں اتر کر اقدامات کرنا ہوں گے اور اس سلسلے میں کسی غفلت اور لاپرواہی کی اب قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ بلوچستان کے ساتھ ساتھ خیبر پختون خواہ پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو دہشت گردی سے بری طرح متاثر ہونے والے اس صوبے میں اب حالات اطمینان بخش ہے۔

مذکورہ بالا کئی امید افزاء باتوں کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ وطن عزیز کے خزانے کو ذاتی مال سمجھ کر عیاشیاں کرنے والوں کے خلاف بھی اب گھیرا تنگ ہو رہا ہے جو کہ یقیناً پاکستان جیسے ملک میں بڑی اہم پیش رفت ہے۔ اسی بنا پر ہم کہ سکتے ہیں کہ اس یوم آزادی کو ہم ایک نئے امید کے ساتھ منائیں گے۔ لیکن اس ساتھ ہمیں اس بات کا بطور خاص خیال رکھنا ہوگا کہ آرمی پبلک سکول پشاور کے پھول جیسے بچوں کی شہادتوں کے صلے ملنے والا موقع کہیں ذاتی، گروہی یا سیاسی مفادات کی نذر نہ ہو جائے۔ بلکہ ہمیں اس موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھا کر پاکستان کو حقیقی معنوں میں قائد کا پاکستان بنانا ہوگا۔ یعنی اسلامی فلاحی پاکستان اور مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان بنے گا۔ قائد کا پاکستان ۔انشاء اللہ۔

قدرتی آفات۔ آزمائش بھی، شامت اعمال بھی

ترجمہ؛ اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) خوف سے، اور (کبھی) بھوک سے، اور (کبھی) مال وجان اور پھلوں میں کمی کر کے۔ اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں ان کو خوشخبری سنادو۔ (سورۃ البقرۃ آیت 155)۔ قرآن مجید، فرقان حمید کی اس آیت کے بعد سب سے پہلے 26 اکتوبر کو آنے والے زلزلے میں جاں بحق افراد کے لواحقین سے اظہار تعزیت، کہ اللہ رب العزت تمام جاں بحق افراد کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنی رحمت خاص سے نوازے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام زخمیوں کو جلد از جلد صحت کاملہ عطاء فرمائے اور متاثرین زلزلہ کے تمام نقصانات کا بھی انہیں جلد اچھا اور بہتر متبادل عطاء فرمائے۔

قارئین کرام! وطن عزیز میں یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا کہ کوئی قدرتی آفت آئی، بلکہ اگر ہم گذشتہ چند سالوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں وطن عزیز مکمل طور پر قدرتی آفات کی زد میں نظر آتا ہے۔ مثلاً 2005ء کا زلزلہ آیا۔ حکومتی ذرائع کے مطابق ہزاروں جبکہ اس وقت کے متاثرین زلزلہ کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد اس زلزلے کی نذر ہوئے۔ کھربوں کے حساب سے مالی نقصانات ہوئے جبکہ لائیو سٹاک کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ 2010ء میں اہل وطن کو ایک بہت ہی

بڑے اور نقصان دہ سیلاب کا سامنا کرنا پڑا۔ خیبر پختون خواہ سے سندھ کے ساحل تک آنے والے اس سیلاب میں نہ صرف یہ کہ کئی قیمتیں جانیں چلی گئیں بلکہ معاشی طور پر ملک کو بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ سیلاب متاثرین کو اس وقت کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ یہ ایک الگ مگر دردناک داستان ہے۔ 2011ء میں ایک بار پھر سیلاب آیا۔ سندھ اس سیلاب کا مرکز تھا جبکہ ضلع بدین بری طرح اس سے متاثر ہوا۔ 2012ء وطن کے کئی علاقوں میں سیلاب آیا۔ اس بار خیبر پختون خواہ، جنوبی پنجاب اور بالائی سندھ شدید متاثر ہوئے اور ان علاقوں کے باشندگان کو سخت نقصان اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے لیے 2013ء بھی آزمائش کا سال رہا۔ اس سال مذکورہ علاقے سیلاب کی لپیٹ میں آئے اور جیسا کہ سطور بالا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس سال بھی لوگوں کو شدید معاشی نقصانات کے علاوہ اپنے پیاروں کی جدائی کا غم بھی سہنا پڑا۔ 2014ء میں اہل کشمیر اور اہل پنجاب سیلاب کی زد میں آئے جبکہ رواں سال سندھ، پنجاب اور خیبر پختون خواہ میں سیلاب اپنا بھیانک روپ دکھا چکا ہے۔ خیبر پختون خواہ کا ضلع چترال شدید متاثرہ اضلاع میں سے تھا، جہاں بڑے پیمانے پر جانی نقصانات ہوئے جبکہ مالی نقصانات اس کے علاوہ تھے۔

مندرجہ بالا قدرتی آفات کے علاوہ بلوچستان کے علاقے ماشکیل میں آنے والے والا زلزلہ بھی اس لحاظ سے ناقابل فراموش ہے۔ کہ اس سانحے کے بعد وہاں کے

رہنے والوں کے جو حالات سامنے آئے کہ وہ کس طرح بنیادی انسانی حقوق سے محروم تھے۔ وہ حقائق دل دہلا دینے والے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ہم ہی قدرتی آفات کے شکار کیوں؟ اس کیوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے دارالعلوم کراچی کے نائب مفتی جناب حضرت مفتی عبدالمنان صاحب سے رابطہ کیا۔ تعارف کے بعد جب میں نے مفتی صاحب سے قدرتی آفات کے متعلق پوچھا تو انہوں نے سب سے پہلے قرآن شریف کی وہ آیت بمعہ ترجمہ پڑھ کر سنائی جو آپ کالم کی ابتداء میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ دنیا جائے امتحان ہے۔ یہاں کبھی انسان پر خوشی کے لمحات بھی آتے ہیں تو کبھی غم اور پریشانی کے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ ایسے حالات میں کیا کرتا ہے۔ آیا وہ صبر و شکر سے کام لے کر اللہ پاک کی خوشنودی حاصل کرتا ہے یا اپنی من مانی کرکے اللہ کو ناراض کرتا ہے۔ 26 اکتوبر کے زلزلے کے حوالے سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ اس دنیا میں مسلمان پر کوئی تکلیف ایسی نہیں آتی کہ جس سے یا تو اس کے درجات میں اضافہ نہ ہو رہا ہو یا پھر گناہ معاف نہ کیے جاتے ہوں۔ اس حوالے سے مفتی صاحب نے ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ مسلمان کو اگر ذرا برابر تکلیف بھی پہنچتی ہے مثلاً اگر اسے کوئی چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے تو اس سے یا تو ان کے درجات بلند ہوتے ہیں یا پھر ان کے گناہ دھلتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ ہم پر جو بھی مصیبت آئے اس پر صبر سے کام لیں اور زبان پر ایسا کوئی لفظ بھی نہ آئے جو اللہ کی

ناراضگی کا باعث ہو۔ آخر میں مفتی صاحب نے خبر دار کرتے ہوئے کہا کہ زلزلہ ہو یا کوئی اور مصیبت۔ اس میں ہمارے اعمال کا بھی دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا عوام کو چاہیے کہ فی الفور گناہوں سے تائب ہو کر اللہ پاک کے حضور توبہ و استغفار کریں۔ مفتی صاحب کے علاوہ امیر جماعۃ الدعوۃ جناب پروفیسر حافظ محمد سعید صاحب نے اس حوالے سے اپنے بیان میں کہا کہ پوری قوم کو اللہ کے سامنے جھک جانا چاہیے کیونکہ جب انسان غافل ہوتا ہے تو اللہ پاک پہلے ہلکے جھٹکے دے کر سمجھاتا ہے۔ لیکن جب غفلت زیادہ ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کی پکڑ آتی ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ عوام سے لے کر حکمرانوں تک کو سمجھائیں کہ وہ توبہ و استغفار کریں اور اپنے معاملات کی اصلاح کریں۔

قارئین کرام! محترم مفتی عبدالمنان صاحب اور جناب حافظ محمد سعید صاحب کے بیانات کو سامنے رکھ کر اگر ہم اپنا اور اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیں تو صورت حال مایوس کن حد تک خراب ہے دکھائی دے گی۔ آج ہمارے معاشرے سے حرام و حلال کی تمیز ختم ہو چکی ہے۔ مساجد نمازیوں سے خالی نظر آتی ہیں اور جو حضرات نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں ان میں اکثریت کو نماز کے لازمی احکامات کا علم ہی نہیں ہوتا۔ بے حیائی اور فیشن پرستی نے ہمیں مکمل طور پر اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ صورت حال آج اس قدر خراب ہے کہ جس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں اس کی بیگم بھی پڑوس کی شادی کے لیے تین ہزار روپے کا سوٹ خریدنا

فرض عین سمجھتی ہے۔ چاہے اس کے لیے کڑی شرائط پر قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ آج ہمارے اس مسلم معاشرے میں کئی لوگ ایسے ملیں گے جو قرآن کے بجائے میوزک کو روح کی غذا سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم پر قدرتی آفات نہ آئیں تو اور کیا آئے؟ یہ تو پھر بھی اس ذات عالی کا رحم و کرم ہے کہ وہ تمام تر نافرمانیوں کے باوجود بھی ہم پر اس قدر مہربان ہے کہ ایسے آفات اور مصائب بھی ہمارے درجات میں اضافے اور گناہوں سے نجات کا ذریعہ بناتی ہے۔ لہٰذا اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس اللہ رب العزت کی مہربانیوں کا اعتراف کرکے اور اسے سامنے رکھتے ہوئے اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرتے ہوئے ان کے سامنے سر بسجود ہو جائیں۔ اب اگر ہم نے اللہ پاک سے اپنا تعلق جوڑ لیا تو یقیناً ہم دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران رہیں گے۔ لیکن اگر ہمارا رویہ اس کے برعکس رہا تو کوئی شک نہیں کہ عذاب الٰہی ہمیں گھیر لے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم پر اپنا خصوصی رحم و کرم فرمائے۔ آخر میں کالم کا اختتام اس آیت قرآنی پر کرتا چلوں ترجمہ: ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟ اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔'' (سورت آل عمران آیت 160

ہندوستان کے خطرناک عزائم اور خطے پر اس کے منفی اثرات

اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ موجودہ دور جنگ و جدل کا نہیں۔ بلکہ یہ دور ہے افہام و تفہیم کا، بین المذاہب ہم آہنگی کا اور سب سے بڑھ کر انسان کو انسان تسلیم کرنے کا۔ لیکن افسوس اور صد افسوس کہ بعض عالمی قوتیں طاقت، تکبر اور غرور میں اس قدر مبتلاء ہیں کہ وہ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ اب جبکہ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے اور خود کو سب سے اعلیٰ اور ممتاز تصور کرتے ہیں بلکہ اس سے ایک قدم آگے یہ کے وہ پوری دنیا اور خطے پر بالادستی کو اپنا حق سمجھتے ہیں تو ایسی قوتوں سے محتاط رہنے میں ہی عافیت ہے۔

یہ صرف ہماری ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی بد قسمتی ہے کہ اس وقت عالمی سپر پاور امریکہ اور خود کو علاقائی سپر پاور سمجھنے والا ہندوستان مکمل طور پر درجہ بالا مرض میں مبتلاء ہے جس سے نہ صرف علاقائی امن بلکہ عالمی امن بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔ حالانکہ مذکورہ دونوں ممالک اگر اپنی موجودہ روش ترک کر دیں۔ تو یقیناً دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ چین کی مثال ہمارے سامنے ہے اس نے دنیا کو بزور قوت زیر کرنے کے بجائے علم و ترقی کا راستہ اپنایا تو آج ہمارے سامنے ہے کہ پوری دنیا اس کی دست نگر ہے۔ آج دنیا کا

کون سا ملک اور کون سا گھر ایسا ہے جہاں چینی سائنسی ایجادات اور چینی مصنوعات موجود نہیں۔ لیکن کیا کیجیے انڈیا اور امریکہ کا انہیں یہ سب کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یا اگر نظر آتا بھی ہے تو طاقت کے نشے میں چور دونوں ممالک اس سے صرف نظر کر دیتے ہیں۔ بالخصوص بات کی جائے اگر ہندوستان کی تو صورتحال وہاں اس قدر خراب ہے کہ آدھی آبادی کو مناسب خوراک میسر ہے، نہ پینے کا صاف پانی۔ حتیٰ کہ کئی لوگ بیت الخلاء جیسی سستی اور انتہائی ضروری شے سے بھی محروم ہیں۔ میڈیا کی بعض رپورٹوں کے مطابق ممبئی جیسے چکاچوند والے شہر میں کئی لوگ ایسے موجود ہیں جن کو فٹ پاتھ کے سوا رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ میسر نہیں۔ ایسے حالات میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستانی عوام ایسے افراد کو بطور حکمران منتخب کرتے، جو نہ صرف سیکولر ہندوستان کے معیار پر پورے اترتے بلکہ ہندوستانی عوام کو غربت کی دلدل سے نکالنے کے لیے بہتر اور جامع منصوبہ بندی کرتے۔ کیونکہ جس ملک کے اندر بااثر طبقات کے ظالمانہ رویوں اور غیر منصفانہ حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے غریب عوام بالخصوص اقلیتیں جانی، مالی اور آبرو کے لحاظ سے غیر محفوظ ہو۔ اس ملک کو یہ قطعی طور پر زیب نہیں دیتا کہ نریندر مودی جیسا انتہا پسند ان کا وزیر اعظم اور سشما سوراج جیسی تنگ نظر اور محدود سوچ کی حامل عورت ان کی وزیر خارجہ ہو۔ بہر حال یہ تو ہندوستان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ لیکن جو تشویش ہمیں لاحق ہے وہ ہے بھارت کا جنگی جنون۔ کیونکہ بھارت نہ صرف جنگی صلاحیتوں میں اضافے کے

علاوہ ہتھیاروں کی دوڑ میں پیش پیش ہے بلکہ دیوانہ وار بھاگتا جارہا ہے۔ اس حوالے سے روزنامہ جنگ نے یکم نومبر کے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ ''دفتر خارجہ کے ترجمان قاضی خلیل اللہ نے اس امر پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے عالمی برادری کو خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارتی جنگی جنون علاقائی امن کے ضامن اسٹریٹجک توازن کو تہہ و بالا کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ترجمان نے بھارت کے دفاعی بجٹ میں مسلسل اضافے، بڑے پیمانے پر جدید ہتھیاروں اور تیاری اور بھارت کی جانب سے جنگی تیاریوں پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے پاس جنگ کے خطرے کو ٹالنے کے لیے اپنی جوہری صلاحیت پر انحصار بڑھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ان کے مطابق بھارت اور پاکستان کے درمیان روایتی جنگی صلاحیت میں بڑھتا ہوا یہ عدم توازن علاقائی استحکام کو کمزور کرنے کے علاوہ اسٹریٹجک ڈیٹرنس پر بھی منفی اثرات مرتب کررہا ہے۔ انہوں مزید کہا کہ پاکستان ہتھیاروں کی دوڑ میں شامل نہ ہونے کی پالیسی پر کاربند ہے تاہم اپنی قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے تمام ممکنہ اقدامات عمل میں لائے جائیں گے۔''

دفتر خارجہ کا یہ ہفتہ وار بیان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جہاں ایک جانب پاک چین اقتصادی راہداری پر کام جاری ہے تو دوسری طرف ہماری فورسز غیر ریاستی عناصر کے خلاف مسلسل مگر کامیاب کارروئیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جس

سے نہ صرف وطن عزیز میں امن واپس لوٹ رہا ہے۔ بلکہ ملک کا معاشی حب کراچی پھر سے روشنیوں کا شہر بننے جارہا ہے۔ ایسے میں ہندوستان کا چیں بہ جبیں ہونا کوئی اچھبھے کی بات نہیں۔ اب یہ عالمی برادری کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہندوستان کو سمجھائے۔ یہ وقت دوسرے ممالک میں مداخلت، وہاں پر دہشت گردوں کو سپورٹ اور بزور قوت کسی پر قبضہ جمانے کا نہیں۔ بلکہ اس وقت کسی بھی ملک اور وہاں کی حکومت کی اولین ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عوام کو بنیادی انسانی حقوق مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معیاری زندگی بلند کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔ اور انڈیا کو یہی کام جنگی بنیادوں پر کرنا چاہیے، نہ کہ پاکستان کے خلاف جنگی اقدامات۔ لیکن اگر ہندوستان امن اور محبت کی زبان نہیں سمجھتا تو پھر اسے یاد رکھنا چاہیے کہ دفاع وطن میں یہ قوم نہ کل پیچھے تھی اور نہ آج۔ بلکہ وقت آنے پر یہ قوم میدان کارزار میں اپنی فوج کے شانہ بشانہ کھڑی ہوگی۔ انشاء اللہ۔ عالمی برادری کو یہ بات سوچنا ہوگی کہ اگر ہندوستان کو آج ان کے خطرناک عزائم سے روکا نہ گیا تو وہ کل کو خطے کے کسی کمزور ملک پر دست درازی بھی کرسکتا ہے۔ سری لنکا کے باغی تنظیم تامل ٹائیگر کو سپورٹ کرنے کا مثال عالمی برادری کے سامنے ہے۔

وہ جسے ہم نے نظر انداز کر دیا

سچی بات یہ ہے کہ مجھے قوم پرستی سے لگاؤ ہے نہ قوم پرست سیاسی جماعتوں سے محبت۔ اسی لیے ان کے لیڈران سے ملنے کی خواہش نے کبھی دل میں انگڑائی لی ہے اور نہ میں نے کبھی ایسی کوئی جستجو کی ہے۔ کیونکہ میں قوم پرستی پر یقین رکھتا ہوں، نہ ایسی جماعتوں کے منشور سے اتفاق۔ لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ :ایسی پارٹیوں میں ایسے ایسے انمول ہیرے موجود ہوتے ہیں۔ کہ نظریاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی دل چاہتا ہے کہ ایسے ہیروں کی عزت کی جائے۔ افضل خان لالا (مرحوم) المعروف خان لالا بھی ایک ایسے ہی شخصیت تھے کہ: جو عزت کے قابل تھے، ہے اور رہیں گے۔ میرے سامنے اس وقت 2 نومبر کے کئی اخبارات پڑے ہیں ۔ جن میں موصوف کی خدمات ،پیدائش سے لے کر وفات کے دن تک تحریر ہے۔ میں چاہوں تو ان اخبارات کے حوالے دے کر یا خان لالا کو خوب سٹڈی کرکے ان پر ایک اچھا کالم لکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا کچھ بھی نہیں لکھ رہا۔ میرے آج کی تحریر میں آپ کو ایسا کچھ پڑھنے کو نہیں ملے گا: کہ خان لالا کب پیدا ہوئے، ان کی بچپن کیسی گزری،انہیں سکول میں کب داخل کرایا گیا، وہ پڑھائی میں کیسے تھے، ان کی جوانی کیسی گزری، وہ کتنی بار صوبائی اسمبلی کے رکن رہے، قومی اسمبلی کے ممبر کب بنے، وہ کون سی وزارت پر فائز رہے،پارلیمان میں ان کو کیا منصب ملا، والی سوات کے دور میں

ان کے دائرہ خدمت کیا تھا، وہ بارہا سوات بار کے بلامقابلہ صدر کیسے منتخب ہوئے،وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ میں یہ سب کچھ اپنے سواتی قلم کار بھائیوں کے لیے چھوڑتا ہوں۔ کہ وہ اس پر بہتر انداز میں روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اور وہ اس پر روشنی ڈالیں ضرور۔ جبکہ مجھے سوات آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اور اس عرصے میں میری اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ میں اپنی دل کے آواز پر لبیک کہتے ہوئے کچھ باتیں ایسی ضرور تحریر کرونگا۔ جسے میں اپنے پر قرض سمجھتا ہوں۔ ایک اور بات یہ کہ کسی بھی شخصیت کے اچھے اور برے پہلو ہوتے ہیں۔ میرا ارادہ نہ تو مرحوم کے گن گانے کا ہے اور نا ہی اس پر طنز کے تیر برسانے کا۔ بلکہ میں ذکر کروں گا اس زیادتی کا جو ان کے ساتھ ہوئی ہے۔ میں لکھوں گا اس مقام اور حق کے لیے جو افضل خان لالا کو ملنا چاہیے تھا۔ لیکن حکومتیں اس سلسلے میں غفلت کی شکار رہی۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہے کہ :اصل آرٹیکل اور فیچرز تو میرے سواتی بھائی لکھیں گے ۔لیکن میں اتنا ضرور لکھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ : اس شخص کو بحثیت پاکستانی قوم ہم اور ہماری حکومت نے وہ مقام نہیں دیا جو کہ اس کا حق تھا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ جب ملالہ یوسفزئی پر حملہ ہوا تو پاکستان سمیت پوری دنیا میں ایک ہل چل مچ سی گئ تھی۔ کیا علاقائی، کیا قومی اور کیا عالمی رہنماء سب کے سب حالت اضطراب میں تھے۔ پوری دنیا میں ملالہ کی صحت یابی کے لیے

دعائیہ تقریبات منعقد ہوئی۔ کسی نے شمعیں جلائی تو کسی نے پھولوں کے ذریعے ان سے اظہار یکجہتی کیا۔ پھر جب وہ بفضلہٖ تعالیٰ صحت یاب ہوئی تو ان پر انعامات اور ایوارڈز کی بارش کردی گئی۔ یہاں تک کہ مس ملالہ اور ایک ہندوستانی شخصیت، کہ جس نے بچوں کی فلاح و بہبود کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ دونوں کو مشترکہ طور پر نوبل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ نے 10 نومبر کا دن ملالہ کے نام سے منصوب کردیا ہے۔ اب آتے ہیں ملالہ کی خدمات کی جانب۔ ملالہ کی جو خدمات ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے وادی سوات میں شورش کے دوران طالبان کے مظالم کے خلاف گل مکئی کے فرضی نام سے ڈائری لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں کہاں جارہا ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں فکر مند ہے۔ جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے ملالہ کی سوچ ہے۔ وہ سوچ ہم سب کی سوچ ہے اور اس کام میں یقیناً ہر کوئی ملالہ کے قدم سے قدم ملا کر چلنا پسند کرے گا۔ البتہ ان ڈائریوں کے صحت پراس وقت کئی سنجیدہ حلقوں نے کئی سوالات اٹھائے تھے۔ جو آج بھی جواب طلب ہے۔

ملالہ یوسفزئی کے بعد اب آتے ہیں افضل لالا کی جانب۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق کشیدہ حالات کے دوران ان پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے، متعدد رشتہ داران کے قتل، جبکہ املاک تباہ ہوئے۔ لیکن افضل خان کوہ استقامت بن کر حالات کے سامنے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ جب سوات خالی ہو رہا تھا۔ افضل خان اس وقت بھی

ڈٹا رہا۔ اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک غیور قوم کا غیور سپوت ہے۔ بعض لوگوں نے اس حوالے سے یہ بھی کہا کہ: چونکہ لالا کا بیٹا پاک فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور سیکیورٹی کے معقول انتظامات کیئے گئے تھے۔ اس لیے وہ سوات میں موجود رہے۔ ایسے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب خوف کسی کے دل میں بیٹھ جائے سیکیورٹی ان کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔ بلکہ ایسے لوگ شورش والی جگہوں سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن خان لالا ایسے بے خوف آدمی تھے کہ: اگر وہ تنہا بھی ہوتے تب بھی حالات کا مقابلہ کرتے۔ افضل خان لالا نے جو کردار ادا کیا۔ وہ بلا شبہ قابل فخر ہے۔ لیکن جو باعث شرم ہے۔ وہ ہے اس حوالے سے حکومتی رویہ۔ کیا افضل خان لالا اس قابل تھے کہ انہیں ایک ایوارڈ اور بابائے امن کا لقب دے کر جان چھڑا لیا جاتا؟ یقیناً تمغہ شجاعت بہت بڑا ایوارڈ ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص مرنا بھی اپنے ملک میں پسند کرتا ہو اور ملالہ کے مقابلے میں جن کی خدمات وسیع ہو۔ ان کو یقیناً اس سے زیادہ عزت ملنا چاہیے تھی۔ جو کہ نہیں مل سکی۔ اب چونکہ افضل خان لالا ہم میں نہیں رہے۔ لیکن ہماری حکومت اتنا تو کر سکتی ہے کہ کوئی سڑک یا تعلیمی ادارہ ان کے نام سے منسوب کیا جائے۔ بہتر ہو گا کہ یونیورسٹی آف سوات کو ان کے نام سے منسوب کیا جائے۔ اگر حکومت نے ایسا کیا تو یقیناً اس کوتاہی کی کچھ تلافی ہو جائے گی جو افضل خان کے حوالے سے حکومت سے ہوئی ہے۔

پی ٹی آئی قائدین کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا

2013 کے عام انتخابات میں پاکستان تحریک انصاف نے یقیناً اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ انتخابات کے بعد جہاں کئی جہاں دیدہ قلم کاروں کے علاوہ اس ناچیز نے بھی ایک تحریر لکھی۔ جو کہ 22 مئی 2013ء کو کراچی کے ایک اخبار کے علاوہ آن لان بھی ’’عام انتخابات اور پاکستان تحریک انصاف‘‘ کے عنوان کے سے شائع ہوئی۔ اس کالم کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔ اگر عمران خان اور اس کی پارٹی کا موازنہ دوسری سیاسی جماعتوں سے کیا جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی اور تجربہ کار سیاسی جماعتوں کے ہوتے ہوئے 2013ء کے عام انتخابات میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری سیاسی جماعتوں کے پاس نہ صرف یہ کہ وسیع تجربہ تھا، بلکہ ان میں برسر اقتدار جماعتوں کے پاس کچھ ترقیاتی کاموں کے کریڈٹ کے علاوہ کسی نہ کسی درجے کے اختیارات بھی تھے۔ ان کے مقابلے میں پاکستان تحریک انصاف کے پاس نہ تو سیاسی تجربہ اتنا وسیع تھا اور نہ ہی کسی قسم کے اختیارات۔ اس لیے موجودہ کارکردگی کو بڑی کامیابی سمجھ کر مزید کامیابیاں سمیٹنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں بندہ ناچیز نے چند تجاویز بھی اس کالم میں پی ٹی آئی کے ذمہ داران کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ وہ تجاویز کیا تھیں؟ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔ (1) عمران خان اور ان کی

جماعت عوام سے کیے گئے وعدوں کی لاج رکھتے ہوئے اسے وفا کرنے کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ (2) مرکز میں میاں نواز شریف کے ساتھ غیر ضروری محاذ آرائی سے گریز کریں، بلکہ اہم ملکی اور بین الاقوامی امور میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ (3) ملک میں جاری دہشت گردی اور ڈرون حملوں کے خاتمے کے لیے بھرپور اور توانا آواز اٹھائیں، نیز لاپتہ افراد کا مسئلہ میاں صاحب کے ساتھ مل کر حل کریں۔ (4) خیبر پختون خوا میں ترقیاتی منصوبے شروع کرانے، لوڈشیڈنگ اور مہنگائی جیسے اہم مسائل کو حل کرنے کے لیے اتحادی جماعتوں سے بھرپور رابطہ رکھیں۔

اب ہم اس بات کا بغور جائزہ لیں گے کہ پی ٹی آئی کا الیکشن سے لے کر اب تک ملکی سیاست میں کیا کردار رہا ہے۔ دیکھا جائے تو دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اور ڈرون حملوں کے خلاف مزاحمت پاکستان تحریک انصاف کے ایسے اقدامات تھے اور ہیں جو یقیناً لائق تحسین ہیں۔ خیبر پختون خوا میں پاکستان تحریک انصاف کے صوبائی حکومت کی جانب سے اصلاحات کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ صوبائی دارالحکومت کو ایک جدید شہر بنانے کی جو کوشش صوبائی حکومت کر رہی ہے وہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسی دارالحکومت کے باسی جو پانی پی رہے ہیں PCRWR کی رپورٹ کے مطابق وہ اسی فیصد آلودہ ہے۔ پشاور سے ذرا آگے بڑھتے ہے سوات کی

جانب۔ سوات یوں تو ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے اور ہر بندے کی یہ خواہش ہے کہ وہ زندگی میں ایک دفعہ ہی سی سوات دیکھنے ضرور جائے۔ ان کی یہ خواہش بے جا اس لیے نہیں کہ سوات کو اللہ نے جس خوبصورتی سے نوازا ہے۔ یہ خوبصورتی ہر قطعہ زمین کو میسر نہیں۔ لیکن اسی سوات کے متوسط اور غریب طبقات پر نظر ڈالیں تو دل بے اختیار رونے کو چاہتا ہے۔ کیونکہ پی سی آر ڈبلیو آر نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں یہ بات آشکار کردی ہے کہ سوات کے مرکزی شہر مینگورہ کے باسیوں کو جو پانی دیا جارہا ہے وہ سو فیصد آلودہ اور مضر صحت ہے۔ ستم بالا ستم یہ کہ شہر سے متصل کئی علاقوں میں پانی وہ نایاب شے بن چکا ہے جو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ یونین کونسل ملوک آباد ایسے ہی علاقہ ہے جہاں پانی کی عدم دستیابی کے شکایات عام ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ گرمیوں میں جس کے گھر دس، بیس لیٹر پانی آجائے تو وہ خود کو غنی سمجھتا ہے۔ ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ خیبر پختون خوا حکومت نے امریکی کے تعاون سے بعض مقامات پر جو ہینڈز پمپ نصب کر رکھے ہیں۔ وہ USAID ادارے چلانے میں اتنے سخت ہیں کہ اسے چلانے کے لیے عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ اسے چلانے کے لیے آدمی کا مکمل طور پر فٹ اور صحت مند ہونا لازمی ہے۔ پانی کے علاوہ اہل سوات کو روزگار کے حوالے سے وہ سہولیات میسر نہیں جو پنجاب اور اہل سندھ کو حاصل ہے اور اس سلسلے میں صوبائی ترجیحات کیا ہیں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ صحت کے حوالے سے صورتحال اور بھی مایوس کن ہے۔ سیدو ٹیچنگ

ہسپتال جائیں تو مریض کرائے پر چارپائیاں لے کر، اس پر برآمدوں میں بے یاروں مددگار پڑے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹرز حضرات خود کہتے ہیں کہ ہسپتال آنے والے مریضوں کو جو سہولیات میسر ہیں وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس سلسلے کو بہتر بنانے کے لیے ذمہ دار شخصیات کو ہنگامی بنیادوں پر اقدامات اٹھانے ہوں گے۔ دوسری تجویز جو میاں نواز شریف کے ساتھ غیر ضروری محاذ آرائی سے گریز کرنے کی دی تھی۔ وہ گریز آرمی پبلک سکول پشاور پر حملے کے بعد محدود سے وقت کے سوا کہیں نظر نہیں آئی۔ بلکہ خان صاحب نے نواز شریف کو ہر وقت اور ہر لمحے للکارتے نظر آئے۔ انتخابی دھاندلی پر جس یقین و وثوق کے ساتھ پی ٹی آئی ذمہ داران باالخصوص خان صاحب بات کرتے نظر آئے۔ اس سے ہر کسی کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ دھاندلی ہوئی ہے اور بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ اسی لیے قوم نے پی ٹی آئی کا بھرپور ساتھ دیا لیکن جب وقت آیا ثبوت اس عدالتی کمیشن کے سامنے پیش کرنے کا جس کے قیام کی پی ٹی آئی کو خود تمنا تھی تو اس میں پی ٹی آئی کے وکلاء اور رہنماء ناکام نظر آئے۔ حالانکہ یہ بات وطن عزیز کے ہر باشعور شہری کے علم میں ہے کہ اسی 2013ء کے انتخابات میں زبردست دھاندلی ہوئی تھی اور دیگر علاقوں کے علاوہ کراچی بھی اس کی ایک مثال ہے۔ سپریم جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ تحریک انصاف کے لیے ایک ایسا کاری وار ثابت ہوا، کہ اس سے ابھی تک وہ سنبھلے نہیں جا رہے۔ اس فیصلے سے نہ صرف یہ کہ تحریکی ورکرز اپنے رہنماؤں سے مایوس ہوئے۔ بلکہ نواز لیگ کو بھی بیٹھے

بٹھائے وہ اعتماد ملا کہ وہ دس سال کی محنت سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بقول پاکستان
پیپلز پارٹی کے رہنما سعید غنی نے کہا کہ پاکستان تحریک انصاف نے وزیر اعظم کو ISO
وزیر اعظم بنادیا۔ Certified

یہ شاید بنا تحقیق اور شواہد کے الزامات لگانے کا نتیجہ ہے کہ سندھ اور پنجاب میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں پاکستان تحریک انصاف کی کارکردگی مایوس کن رہی۔ اسی وجہ سے پارٹی کے ایک رہنماء اور لاہور کے آرگنائزر شفقت محمود نے اپنے عہدے سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ ایسے حالات میں جب پارٹی ورکرز بالخصوص وہ طبقہ جو صرف اور صرف پاکستان تحریک انصاف کے منشور اور خان صاحب کے مخلصانہ رویے کی وجہ سے سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ وہ مایوسی کے شکار ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے میں پارٹی کے مخلص رہنماؤں کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور ان عوامل کا جائزہ لے کر جس کی وجہ سے پارٹی آج گومگو کی کیفیت میں ہے، ان کا تدارک کرنا ہوگا۔ ایک اور بات یہ کہ جن لوگوں کو آپ شعور دینے چلے تھے، ان کو آپ نے اتنا بے شعور کیسے سمجھ لیا کہ وہ آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیتے۔ لہٰذا آئندہ کے لیے پارٹی چیئرمین کو یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ جو بھی بات کریں گے وہ ٹھوس شواہد اور مکمل دلائل سے کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ پی ٹی آئی کے ارکان ضرور ان باتوں پر توجہ دیں گے کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

جوناگڑھ !جو کبھی پاکستان کا حصہ تھا

یہ بات بھی یقیناً بحث طلب ہے کہ نواب آف جوناگڑھ نواب مہابت خانجی سر پر ایک خطرناک دشمن کے سوار ہوتے ہوئے کیوں خوش فہمی کا شکار رہے۔ یہ بات بھی جواب طلب ہے کہ انہوں نے یہ بات کیوں اپنی ذہن میں بٹھائی کہ ریاستی افواج کسی بھی بیرونی مداخلت کی بھرپور جواب دے سکتی ہے۔ وہ اتنے بھولے کیسے بنے بیٹھے رہے کہ انہوں نے ریاست کے ان ہتھیاروں کو دشمن کے مقابلے کے لیے کافی سمجھ لیا، جو کہ قطعاً بیرونی مداخلت روکنے کے لیے موزوں نہ تھے اور سب سے بڑھ کر وہ پاکستانی اتھارٹیز کو سب ٹھیک اور سب خیر ہے کی داستان کیوں سناتے رہے۔ یقیناً یہ ایسے امور ہے کہ جن پر بحث ہونی چاہیے اور خوب ہونی چاہیے، لیکن کیا کسی دوسرے ملک کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسے حالات میں جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کے علاقے پر بزور قوت اپنا تسلط جمائے؟ تو اس کا جواب ہوگا کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ ایسا جارحیت جس ملک کی طرف سے بھی ہوگا وہ بلاشبہ قابل نفرت اور قابل مذمت اقدام تصور کیا جائے گا۔ لیکن انڈیا جو کہ خود کو سیکولرزم اور جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ملک تصور کرتا ہے اس کے آگے ان باتوں کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ بلکہ وہ ہر لمحے تاک میں رہتا ہے کہ کب کوئی ''شکار'' نظر آئے اور وہ جھٹ سے اس پر جھپٹ پڑے اور یہی کچھ

اس نے پاکستانی ریاست جوناگڑھ کے ساتھ بھی کیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بزرگان تحریک پاکستان کی قربانیاں رنگ لارہی تھیں اور تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت مختلف ریاستوں کا الحاق پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ ہورہاتھا۔ جوناگڑھ بھی ایک ایسی ہی ریاست تھی جس نے بخوشی ورضا پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کردیا تھا۔ الحاق کے بعد بانی پاکستان محمد علی جناح نے 19 ستمبر 1947 کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں اس حوالے سے قرارداد پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی اور یوں ریاست جوناگڑھ ہمارے وجود یعنی پاکستان کا حصہ بن گیا۔ چونکہ جوناگڑھ جغرافیائی لحاظ سے اہم ، قدرتی وسائل سے مالامال ، تاریخی لحاظ سے مسلمانوں کا ایک اہم ریاست اور آزادی کے وقت ہندوستان کے 562 ریاستوں میں چھٹی بڑی اور امیر ترین ریاست تھی لہذا اس اہمیت کے پیش نظر انڈیا کے منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی اور وہ تاک میں بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ کب موقع ملے اور وہ اس اہم ریاست پر جھپٹ پڑے۔ ادھر چونکہ نواب آف جوناگڑھ مطمئن تھے کہ ریاستی مشینری کسی بھی مداخلت کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ لہذا جب نواب مہابت خانجی کچھ ضروری امور پر قائد سے بات کرنے پاکستان آئے تو ان کی غیر موجودگی میں ہندوستان نے 9 نومبر 1947 کو اپنی افواج جوناگڑھ میں داخل کراکر زبردستی اس کے اوپر قابض ہوگیا۔ انڈیا کے غاصبانہ قبضے کو چھڑانے کے لیے پاکستان نے اس وقت اقوام متحدہ سے

رجوع کرلیا لیکن جلد ہی قائد دنیا سے رحلت فرماگئے اور یوں یہ اہم ترین مسئلہ بھی حالات کے گرد کے نیچے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

آج اس اہم ریاست پر ہندوستان کے قابض ہوئے 68 سال پورے ہوجائیں گے۔ لیکن آفسوس کے دنیا کے تمام ممالک میں تصفیئے اور مظلوم کو ان کا حق دلانے کے لیے وجود میں آنے والا ادارہ اقوام متحدہ مجرمانہ حد تک خاموش اور اپنی ذمہ داریوں سے بے پرواہ نظر آتا ہے۔ دوسری طرف صورت حال اس سے بھی باعث شرم ہے کیونکہ آج وطن عزیز کی اکثریت کو یہ بات معلوم ہی نہیں کہ جوناگڑھ بھی کبھی پاکستان کا حصہ تھا۔ عوام اس حوالے سے بے خبر کیوں رہے؟ تو اس کا جواب میں یہی دوں گا کہ میڈیا اور حکومتوں کی غفلت کی وجہ سے ۔آج اہل وطن کی اکثریت کو معلوم ہی نہیں جوناگڑھ بھی کبھی پاکستان کا حصہ تھا بلکہ حکومت نے یہ کافی سمجھ لیا ہے اس دن کے حوالے سے جوناگڑھ ہاؤس کراچی میں جس تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے اس میں کسی نمائندے کو بھیجا جائے جو وہاں پر ہمدردی کے دو بول ،بول یہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کرلیا جبکہ میڈیا اس تقریب کا کسی نہ کسی درجے میں کوریج کرکے یہ سمجھتا ہے کہ فرض اس نے بھی ادا کرلیا۔ حالانکہ حقیقت کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ تاحال دونوں اپنے فرائض منصبی سے غفلت کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ یہ فرض اسی وقت ادا ہو ہوسکتا ہے جب میڈیا عوام کو درست نقشہ دکھائے جبکہ حکومت

وقت اقوام متحدہ سے ایک بار پھر رجوع کرلیں جہاں یہ کیس پہلے سے بھی پڑا ہوا ہے
اور مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا ضرور کیونکہ امید پر زندگی قائم ہے جبکہ
ناامیدی کفر ہے۔

ہندوستانی عوام کے فیصلے کو سراہنا ہوگا

بھارت کے عام انتخابات میں جیت کے بعد نریندر مودی کا وزارت عظمی جیسے اہم منصب پر فائز ہونا تجزیہ نگار نہ تو خطے کے لیے نیک شگون قرار دے رہے تھے اور نا ہی ہندوستان کے لیے۔ کیونکہ وزارت عظمیٰ کے قلم دان سنبھالنے کے بعد مسٹر مودی کا جو روپ سامنے آیا ہے وہ انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش ہی کیا کہ ہندوستان میں جو بھی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے ان کی یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ پاکستان کو دباؤ میں رکھا جائے۔ لیکن جو منفی رویہ مسٹر مودی نے اختیار کیا ہے اس کی نظیر ماضی میں کہیں نہیں ملتی اور اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ مودی کے برسر اقتدار آنے کے بعد پاکستانی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ ہندوستانی افواج کا روز کا معمول بن چکا ہے۔ دوسری طرف مودی کے برسر اقتدار آنے کے بعد جہاں ایک طرف نچلی ذات کے ہندوؤں کی زندگی اجیرن بنا دی گئی ہے تو وہی اقلیتیں بھی مکمل طور پر عدم تحفظ کی شکار نظر آتی ہے۔ اقلیتوں میں بھی اگر مسلمانوں کی حالات زار کا جائزہ لیا جائے تو وہ مکمل طور پر بے یار ومددگار نظر آتے ہیں جہاں ان پر ظلم وستم روز کا معمول بن چکا ہے کیونکہ بھارت کی انتہاپسند جماعتوں کا یہ منشور ہے کہ مسلمان یا تو اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو بن جائے بصورت دیگر ملک چھوڑ دیں یا پھر موت کو گلے لگانے کے لیے

تیار ہو جائیں۔ ایسے میں اوالذکر دونوں کام ممکن نہیں لہٰذا ہندوستانی مسلمان ہر لمحہ خوف اور لاچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ایک عام مسلمان پر ہندوستان میں جو گزر رہی ہے وہ ایک طرف۔ ہندوستان کے انتہاپسندوں کی چیرہ دستیوں سے عالمی سطح پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے والے سپر سٹار اداکار شارخ خان بھی محفوظ نہیں اور ان کو آئے روز طرح طرح کے طعنے دئیں جارہے ہیں۔ایک ایسے وقت کہ جب ہندوستان کی اقلیتیں شدید عدم تحفظ کے شکار ہے۔ بھارتی ریاست بہار کے ریاستی انتخابات میں مودی حکومت کی شکست کو تجزیہ نگار ایک امید کی کرن کے طور پر دیکھ رہے ہیں کیونکہ ان انتخابات میں انتہا پسندی کے پرچار کرنے والوں کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تفصیلات کے مطابق بھارتی ریاست بہار کے اسمبلی انتخابات میں برسراقتدار بی جے پی اور اس کے حمایتیوں کو وہاں کی عوام نے مکمل طور پر مسترد کردیا ہے جبکہ ان کے مدمقابل نتیش کمار کے راشٹریہ جنتا دل اور لالوپرساد یو کے راشٹریہ جنتا دل یونائیٹڈ اور اس کے اتحادیوں کو بھاری تعداد میں ووٹ دے کر ریاست کے باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھما دیئے ہے۔ انڈیا کی سیاست پر نظر رکھنے والے حلقوں کا کہنا ہے کہ 243 کے ایوان میں محض 59 نشستیں حاصل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ریاستی عوام کو بی جے پی اور اس جیسے دیگر انتہا پسند تنظیموں کے منشور اور پالیسیوں سے کوئی سروکار نہیں۔انتخابی نتائج کے بعد لالوپرساد نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ بی جے پی کا مزید رہنا ملک توڑنے کے

مترادف ہے۔ انہوں یہ بھی کہا کہ بہار کی عوام نے مودی کی پالیسیاں مسترد کردی ہے اور اب ان کو گجرات واپس جانا ہوگا۔ جنتا دل اتحاد کے ایک اور رہنماء نتیش کمار نے بھی زبردست کامیابی پر عوام کا شکریہ ادا کیا ہے۔ دہلی کے وزیر اعلیٰ اور رہنماء عام آدمی پارٹی اروند کیجریوال اور کانگریس کے رہنماء راہول گاندھی نے بھی اپنے اپنے بیانات میں کہا ہے کہ بھارت میں نفرت کی سیاست کی کوئی جگہ نہیں اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑا کر کوئی بھی نہیں جیت سکتا۔

یہ بات یقیناً باعث طمانیت ہے کہ ریاست بہار کی عوام نے نفرت کے بیج بونے والوں کو مسترد کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ انتہا پسند ہے اور نا ہی انتہا پسندی پر یقین رکھتے ہیں۔ اب یہ منتخب ہونے والی پارٹیوں کے رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عوامی مینڈیٹ کا احترام کرتے ہوئے خود بھی تعصب سے باز رہیں اور ملکی سطح پر بھی بھائی چارے کی فضاء قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ آئندہ ہونے والے عام انتخابات میں بھی انتہاء پسندوں کی راہ روکی جائے اور مجھے امید ہے کہ جیتنے والا اتحاد ضرور اس بارے اقدامات اٹھائیں گے۔ لیکن اگر اتحاد نے اپنے منشور سے روگردانی کی تو پھر اس یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ آج جس انتہا پسندی کو انھوں نے شکست دی ہے، کل کو اسی انتہا پسندی کا لیبل ان پر بھی چسپاں ہوسکتا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ

لیبل ان پر چسپاں نہ ہو جائے کیونکہ اتحاد میں شامل بھارت کی سابق حکمران جماعت انڈین نیشنل کانگریس ایک ایسی جماعت ہے کہ جس کا رویہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ معتصبانہ رہا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت اور اس کے ذمہ داروں کو کھلی چھوٹ اس بات کا غماز ہے کہ جب تک انڈین نیشنل کانگریس اپنے کردار سے ثابت نہیں کرتی کہ ان کا اب تعصب اور نفرت سے کوئی تعلق نہیں۔ تب تک ان پر اعتبار کرنا ناممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

سازش یا مخلصانہ مشورہ

مجھے یاد ہے کہ جب پرویز مشرف ایوان اقتدار سے رخصت ہوئے تو ہمارے سیاسی قائدین نے سکون کا سانس لیا کہ اب وہ کسی غاصب کے ہتھے نہیں چڑھیں گے۔ وہ اس لیے کہ اس وقت کے چیف آف ارمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے عادات و اطوار سے کہیں نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ملکی سیاست میں کسی بھی قسم کی دل چسپی لے رہے ہیں اور ہوا بھی ایسا ہی کہ جنرل موصوف نے دوران سروس یہ ثابت کر دکھایا کہ اسے اس میدان میں کودنے کا کوئی شوق نہیں۔ جنرل کیانی کے سبکدوش ہونے کے بعد جب موجودہ آرمی چیف نے عہدہ سنبھالا تو حسب روایت معاشرے کے مختلف طبقات نے اس پر تبصرے کیں۔ ان تجزیوں اور تبصروں میں جو بات سامنے آئی وہ یہ کہ زیادہ تر لوگ پر امید تھے کہ جنرل راحیل شریف وطن عزیز کو مشکل حالات سے نکالنے کا سبب بنیں گے۔

اب جنرل صاحب سے لوگوں نے جو امیدیں وابستہ کرلی تھی وہ کس قدر بار آور ثابت ہوئی ۔ تو اس کا اندازہ ہم اندرون ملک امن و امان کی صورت حال دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ یہ زیادہ دور کی بات نہیں کہ جب وطن عزیز میں قتل و غارت گری عروج پر تھی اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حالات ماضی قریب میں بہتر ہو سکیں گے۔ لیکن موجودہ عسکری قیادت نے جس انداز سے بلا تفریق ملک کے

کونے کونے کو امن کا گہوارہ بنانے کا عزم کیا بفضلہ تعالیٰ وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ یہ اسی عزم مصمم کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف اہل خیبر سکون کا سانس لے رہے ہیں تو دوسری طرف وطن عزیز کا معاشی شہ رگ پھر سے روشنیوں اور خوشیوں کی جانب لوٹ رہا ہے اور بلوچ بھی اب قومی دھارے میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جنرل راحیل شریف بھی اپنے پیشرو کی طرح سیاسی معاملات میں ٹانگ اڑانے کا قائل نہیں اور یہ بات اس نے پاکستان تحریک انصاف کے طویل دھرنے کے دوران اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا۔ کیونکہ اس وقت کئی حلقوں کا یہ خیال تھا کہ جس تھرڈ ایمپائر کی انگلی اٹھنے کی جانب خان صاحب اشارہ کر رہے ہے وہ راحیل شریف ہی ہو سکتے ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ان تمام حقائق کے باوجود بعض سیاسی جماعتیں اور ان کے قائدین جنرل کے اس بیان کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں، جس میں انہوں اشارہ دیا تھا کہ حکمران اپنا طرز حکمرانی بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ ملک میں اس وقت جس بیڈ گورننس کا دور دورا ہے اس سے ہر شخص پریشان اور مایوس دکھائی دے رہا ہے۔ ایسے میں راحیل شریف کے اس بیان کو اہل وطن اپنے دل کی آواز سمجھ کر بڑے پیمانے پر اس کی تائید کر رہے ہیں۔ عام آدمی کے علاوہ جمیعت علماء اسلام کے امیر جناب مولانا فضل الرحمٰن اور پاکستان تحریک انصاف نے بھی اس بیان کی تائید کی ہے۔ ایک ایسے وقت میں کہ پی ٹی آئی کی مخالفت میں مولانا صاحب ہر وقت حکومت کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہے، ان کی جانب سے اس بیان کی تائید

ظاہر کرتا ہے کہ ان کے اتحادی یعنی نواز حکومت کہیں نہ کہیں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ضرور ہے۔ ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومتی ذمہ داران سیخ پا ہونے کے بجائے ان کمزوریوں پر توجہ دیں، جس کی جانب آرمی چیف نے توجہ دلائی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عوامی حمایت، حکومتی مرضی اور سیکورٹی فورسز کی قربانیوں کی بدولت ملک میں امن و امان کی بہتر ہوتی ہوئی صورتحال بہت جلد دیرپا امن میں تبدیل ہوجائیگی۔ لیکن اگر حکومت نے اس پیغام پر کان نہ دھرے اور محمود خان اچکزئی جیسے خوشامدیوں کو ہمدرد اور غمگسار تصور کرتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ جس اندھیرے سے نکلنے کی ہم تگ و دو کر رہے، کہیں اس اندھیرے میں ہم مکمل طور پر غرقاب نہ ہوجائے۔ کیونکہ یہ سچ ہے کہ جو حکومت خوشامدیوں میں گر جائے اور مصلحتوں کا شکار ہوجائے انکے لیے طرز حکمرانی کو بہتر کرنا دن میں تارے دیکھنے کے مترادف ہے۔

خوش فہمی میں نہ رہئیں، اپنی اصلاح کیجیے

ان کی فیملی اچھی خاصی مذہبی فیملی تھی لیکن جب وطن عزیز میں روشن خیالی کی ہوا چلائی گئی،، تو ان کی فیملی بھی غیر محسوس طریقے سے روشن خیال کلب میں شامل ہو گئی۔ شروع شروع میں تو روشن خیالی کو ان کے گھر میں جگہ بنانے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس وقت روشن خیالی کو بڑی کامیابی ملی جب خاندان میں ایک شادی کی تقریب اٹینڈ کرنے کے لیے گھر کی عورتوں اور جوان لڑکیوں نے برقعے کی بجائے ہلکے دوپٹوں کا استعمال کیا۔ اس کے بعد مزید تبدیلیاں تیزی سے رونماء ہونے لگی مثلاً: پہلے گھر میں ضرورت کے لیے ایک موبائل فون موجود تھا لیکن اب ہر خاتون کی جستجو تھی کہ ان کے پاس الگ الگ فون موجود ہو۔ چونکہ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اس لیے جلد ہی سب کی مرادیں بر آئیں اور سب لڑکیوں نے مارکیٹ جا کر اپنی اپنی پسند کے موبائل فون خرید لیئے۔ موبائل آنے کے بعد اب دن کے اکثر وقت کزنز وغیرہ سے بات چیت میں گزرنے لگی۔ کبھی ان کو اپنے ہاں کھانے پر بلالیا تو کبھی ان کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے چلے گئے۔ روز روز کے اس بے تکلفی کا یہ نتیجہ نکلا کہ خاندان کے لڑکے، لڑکیوں میں جو روایتی شرم وحیا تھی وہ جاتی رہی۔ پھر جب 3 G ٹیلی کام کمپنیوں نے صارفین کو سروسز فراہم کرنی شروع کر دی۔ تو انھوں نے بھی اس سے بھرپور

کی دنیا میں جابسا۔ فیس بک پر پہلے پہلے Facebook فائدہ اٹھایا اور ہر ایک اپنی دنیا یعنی تو صرف اپنے عزیزوں سے رابطے ہوتے رہے لیکن ایک دن خاندان کی ایک جوان لڑکی کو ان کے اکاؤنٹ پر کسی انجانے لڑکے نے فرینڈ ریکویسٹ بھیجی۔ پہلے تو لڑکی نے accept کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن پھر روشن خیالی نے اسے شہ دی کہ بھئی درخواست قبول کرلو کیونکہ یہ اکیسویں صدی ہے کوئی پتھر کا دور تھوڑی ہے۔ کچھ شش وپنج کے بعد اس نے فرینڈ ریکویسٹ قبول کرلی اور علیک سلیک کے بعد اس نے رابطہ منقطع کرلیا۔ دوسرے دن دونوں میں پھر رابطہ ہوگیا اور پھر رفتہ رفتہ رابطے بڑھتے بڑھتے ملاقاتوں تک جا پہنچے۔ اس دوران لڑکی اسلامی احکامات اور ثقافتی روایات سے باالکل بے پرواہ ہو کر رہ گئی۔ نماز، تلاوت ،ذکرو اذکار ان کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر گئے جبکہ انڈین فلمیں اور فیس بک چیٹنگ ان کی زندگی کا مقصد بن گئی۔ زندگی گزرتی گئی لڑکی کا کیا کسی کا بھی وہم و گمان میں نہ تھا کہ لڑکی بھرپور جوانی میں موت جیسے تلخ مگر اٹل حقیقیت کا سامنا کرے گی لیکن کوئی تسلیم کرے چاہے نہ کرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ قرآن مجید، فرقان حمید میں مالک کل جہان کا فرمان عالی شان ہے۔ جس کا مفہوم ہے۔ کہ جب کسی کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو اس میں پھر سیکنڈ بھر آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتا۔ لہذا سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی اور بارش برستی رات کو گرم لحاف میں لیٹی اس لڑکی کو موت نے دبوچ لیا اور کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ صبح جب وقت مقررہ پر لڑکی نے بستر نہ چھوڑا

تو گھر والوں نے آواز دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر ان کی یہ کوشش بے سود رہی۔ پھر جب پلنگ کے پاس جا کر دیکھا تو ان کی لاش بے یار و مددگار پڑا تھا۔ گھر میں جب سب کو پتہ چلا تو کہرام مچ گیا، کسی نے بال نوچنے شروع کر دیئے تو کسی نے سینہ کوبی کی۔ یہ شور و غوغا جب پڑوس کی گھروں تک جا پہنچی تو وہ بھی میت والے گھر پہنچ گئے اور اہل خانہ کو دلاسہ دینا شروع کر دیا۔ گھر میں چونکہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ میت کو غسل کیسے دیا جاتا ہے لہٰذا دوسرے محلے سے تبلیغی صاحب کی اہلیہ کے ہاں پیغام بھیجا کہ میت کو غسل دی جائے۔ غسل کے بعد جب جنازہ اٹھانے کا وقت آیا تو قدرت کا کرنا ایسا ہو کہ مطلع باالکل صاف ہوگیااور ٹھنڈک بھی قدرے کم ہوئی۔ موسم صاف کیا ہوئی کہ ہر عورت نے حسب توفیق اس پر تبصرہ کرنا فرض عین سمجھا۔ کسی نے کہا کہ دیکھ لیا ناں میں تو کہتی ہو کہ ہماری یہ بیٹی ڈائرکٹ جنت میں جائے گی کیونکہ اتنی خراب موسم کا اچانک صاف ہونا اس بات کی علامت ہے کہ بی بی بہت نیک تھی۔ دوسرے کونے سے دوسری عورت نے کہا، کہ بھی مانا کہ نماز روزے میں ان سے سستی ہوئی ہوگی لیکن یہ مہینہ اور یہ موسم اس سے تو صاف لگ رہا ہے کہ بی بی بہت خوش قسمت تھی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مجھے جب ان سب باتوں کا علم ہوا تو میں نے بھی یہی سوچا کہ اللہ پاک غفورالرحیم ذات ہے۔ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں تو ہوگی واقعی بی بی خوش قسمت۔ لیکن دل تھا کہ مطمئن ہونے کا نا ہی نہیں لے رہا تھا۔ کیونکہ علماء کرام اور مفتیان عظام سے ہم نے

بار ہااللہ پاک کی ارشادات اور نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں یہ بات سنی ہے کہ اللہ پاک کے فرمانبردار بندوں کو موت اور بعد از موت کیا کیا اعزازات ملیں گے، تو ساتھ میں ان وعیدوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ سنا ہے کہ قصداً نماز چھوڑنے پر کیا کیا وعیدیں آئی ہے، نامحرم کے ساتھ تعلق جوڑنا آخرت میں کتنی ذلت کا باعث بن سکتا ہے، زندگی قیمتی سرمایہ ہے اسے لہو لعب میں گزار دینے پر کن کن سزاؤں کو بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اس الجھن کو سلجھانے کے لیے میں نے اپنے محلے کے پیش امام جناب اقبال علی صاحب سے رابطہ کیااور ان سے سوال کیا کہ ساری زندگی اللہ و رسول کی نافرمانی میں گزارنے کے بعد کسی آدمی کے جنازے کے وقت موسم صاف ہو جائے، نماز جنازہ کوئی بڑا عالم دین پڑھائے یا قبرستان میں قبر کے لیے کوئی موزوں جگہ مل جائے تو کیا یہ اس بات کی علامت ہے کہ مردہ خوش نصیب ہے اور یہ کہ اس کا بیڑہ پار ہے؟ مولانا صاحب نے تسلی سے بات سننے کے بعد فرمایا کہ موت کے بعد مردے کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہوگا اس بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ جہاں تک بات ہے کہ مردہ خوش قسمت تھا یا بد نصیب یہ سب لوگوں کی قیاس آرائیاں ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ اگر کسی بندے کی ساری زندگی اللہ و رسول کی اطاعت میں گزر جائے اورگناہوں پر توبہ کی توفیق بھی مل جائے تو قرآن و سنت کی روشنی میں ہم اس بارے میں امید لگا سکتے ہیں کہ اللہ پاک نے ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرمایا ہوگا۔اس کے برعکس اگر کسی مسلمان بندے کو اس حال میں موت

آجائے کہ اس کی ساری زندگی رحمٰن کی نافرمانی میں گزری ہو تو ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلاء ہو جانے کی بجائے اس کے لیے زیادہ سے زیادہ استغفار کرنا چاہیے تاکہ اللہ پاک ان سے بھی عفو درد گزر کا معاملہ فرمائے۔

قارئین کرام! کالم میں لوگوں کی قیاس آرائیاں اور اس پر مولانا صاحب کا موقف آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ آخر میں صرف اتنا کہ کسی کو خوش نصیب یا بد نصیب کہنے کی بجائے ہمیں اس زندگی سے "جو کہ اللہ پاک کی بہت بڑی نعمت ہے،، فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ اللہ نے یہ زندگی ہمیں کسی مقصد کے لیے دی ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ ہم یہ زندگی اللہ پاک کی احکامات کو نبی آخرالزامان صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہو طریقوں کے مطابق گزار دیں لہذا خوش فہمیوں میں بتلاء ہونے کی بجائے ہمیں اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے تاکہ دنیوی زندگی کے ساتھ ساتھ اخروی زندگی میں بھی چین و سکون ہمارا مقدر ٹھہرے۔

داجی میں بے گناہ ہوں

2 مئی کو روزنامہ آزادی سوات کا ادارتی صفحہ جیسے ہی کھولا تو اس کالم پر نظر پڑی جس کا عنوان تھا'' داجی میں بے گناہ ہوں،، اپنے اس کالم میں محترم کالم نگار نے عورت کی مظلومیت کا رونا اتنی معصویت سے رویا ہے کہ پڑھنے والے کا دل بھی بے اختیار رونے کو چاہتا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ عورت آج اس مقام سے محروم ہے، جو اس کا حق تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت کا اپنے جائز حقوق سے محرومی عالمی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو کسی ملک، علاقے یا قوم سے جوڑنا قطعاً جائز نہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک ایسا حساس معاملہ ہے کہ اس پر قلم اٹھانے سے پہلے بندے کو مکمل تحقیق کرلینی چاہیے، کیونکہ محض سنی سنائی باتوں کو قلم بند کرکے عوام تک پہنچانا نہ صرف لکھاری کو ناقابل اعتماد بنا سکتی ہے بلکہ ان سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے جو ہمیشہ وطن عزیز کے خلاف منفی پروپیگنڈے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ کہ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ عورت پر ظلم آخر ہوتا کیوں ہے لیکن بدقسمتی سے محترم جاوید شیخ صاحب نے اپنے کالم ''داجی میں بے گناہ ہوں،، میں ان سب باتوں کا لحاظ نہیں رکھا۔ مثلاً: کالم کے پہلے پیراگراف کے تیسری سطر میں محترم لکھتے کہ، یہ بھی تاریخ عالم کی تلخ حقیقت ہے کہ دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں عورت کو وہ

مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق ہے۔،، بس دنیا کے تہذیبوں کے بارے میں موصوف اتنا لکھنے کے بعد خاموش ہے لیکن جب بات پاکستان کی آتی ہے تو فاضل قلم کار کا قلم رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ بھی خواتین پر تشدد ہے۔ پاکستان میں ہر مرد کلہاڑی اور تیزاب لے کر اپنی عورتوں کو نشان عبرت بنانے پر تلا ہوا ہے اور عورت غیرت کے نام پر قتل ہو رہی ہے۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ بھائی نے بہن کو غیرت کے نام پر قتل کر دیا، ماموں نے غیرت کے نام پر بھانجی کو ابدی نیند سلا دیا، شوہر نے غیرت کے نام پر بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا پھر باپ نے اپنی ہی بیٹی کو۔ ایسا واقعہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بیٹوں نے اپنی ماں تک کو غیرت کا نام قتل کیا ہے۔ایک جگہ اس نے ایک واقعے کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ کس طرح ایک ظالم اور درندہ صفت باپ نے اپنی جواں سال بیٹی کو غیرت کے نا پر قتل کیا۔ لکھتے ہے کہ اس نے پہلے معصوم بیٹی کو گھر کے ایک کمرے میں ایک ہفتے تک بھوک و پیاس کی حالت میں تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایک ہفتہ بعد جب ظالم باپ نے رائفل کلاشنکوف اٹھائی اور لڑکی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس معصوم کی زبان پر یہ الفاظ آئے کہ ”داجی میں بے گناہ ہوں،، مجھے قتل مت کرو۔،، لیکن اس ظالم اور بے رحم باپ نے اپنی معصوم بیٹی پر پہلے وحشیانہ تشدد کیا اور بعد میں اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ تیسرے پیراگراف کے شروع میں جاوید شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ اس طرح کے درجنوں واقعات روزانہ کے حساب

سے دیکھنے میں آتے ہیں۔

قارئین کرام ! اب ہم محترم جاوید شیخ صاحب کے لکھی ہوئی باتوں کا تجزیہ کریں گے کہ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا فسانہ۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ عورت کو وہ حقوق نہیں مل رہے ، جوان کا حق ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے ہندو ہو یا عیسائی یہودی ہو یا بدھ مت کے اننے والے یہ سب عورت کو بجائے عزت دینے کی منحوس شے، سماج پر بوجھ اور گناہوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔ جدید دور پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو آج کی جدید تہذیب نے عورت کو سبز باغ دکھا کر گھر سے بے دخل کردیا اور آج وہ بی چاری دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے آج ایک ماں جب صبح کو گھر سے اپنا چھوٹا سا بچہ چھوڑ کر معاش کی تلاش میں نکلتی ہے تو اس بارے میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دل پر کیا گزر رہی ہوگی ۔ سارا دن غیر مردوں کے ذوں معنی جملوں اور بدن کو چھیرتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے جب شام کو گھر لوٹتی ہے تو اس کا روح گھائل جبکہ جسم تھکن کے مارے درد سے چور ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ بیبچاری چاہتی ہے کہ اسے سکون و اطمینان ملے۔ آفسوسناک امر یہ ہے کہ سکون کے اصل زرائع کو ان کی نظروں رکھنے کے لیے جدید تہذیب نے عورت کو ڈش، کیبل ، سی ڈی ، فلم ، تھیٹر، ڈرامے اور مخلوط محافل کے پیچھے لگا دیا جس سے اس بیچاری کی حالات ایسی ہو گئی ہے کہ بیچاری گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ اس کے برعکس اسلام عورت کو

گھر کی ملکہ، شوہر کا لباس و سکون ، بھائی کی ہمدرد، باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اچھی تربیت کرنے کی صورت میں جنت کی ضمانت قرار دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جنت جیسے عظیم نعمت کے بارے میں اسلام کہتا ہے کہ وہ ایک عورت یعنی ماں کے قدموں تلے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ عورت اپنے اس مقام کو سمجھے جو کہ اسلام نے اسے دے رکھا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام سے پہلے لڑکی کی پیدائش کو باعث عار سمجھا جاتا تھا اور ان کو زندہ دفن کرنے کی رواج عام تھا لیکن اسلام نے اسے تحفظ دیا نہ صرف تحفظ دیا بلکہ باعزت اور اعلیٰ مقام بھی دیا۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اور انشاء اللہ آئندہ کسی کالم میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ جہاں تک تعلق ہے پاکستانی معاشرے کا تو اس میں یقیناً کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ہمارے اس معاشرے میں کسی نہ کسی حد تک عورت کا استحصال ہو رہا ہے لیکن موصوف کی یہ بات مکمل طور مبالغہ آرائی پر مبنی کہ پاکستان میں ہر مرد ہاتھ یں تیزاب یا کلہاڑی لے کر عورت کو قتل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ بھی موصوف کی بدگمانی ہے کہ اس طرح کے واقعات "یعنی عورتوں کی قتل کے واقعات،، درجنوں کے واقعات روزانہ کے حساب سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ نہ جانے محترم نے کہاں کی تصویر کشی کی ہے کیونکہ ہر باخبر شخص جانتا ہے کہ وطن عزیز میں واقعتاً نہ تو ہر مرد ہاتھ میں کلہاڑی لے کر کھڑا ہے اور ناہی تیزاب کی بوتلیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ایسے واقعات اکثر نہیں بلکہ شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں اگرچہ اصولی بات یہ ہے کہ اس قسم کا ایک بھی واقعہ

ہم سب کے لیے باعث شرم ہے لیکن جیسا کہ کالم کی ابتداء میں عرض کرچکا ہو کہ ہمیں سوچنا ہوگا کہ اس قسم کے واقعات ہوتے کیوں ہے؟ تو اس کا جواب اس بات کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ دین سے دوری، اعلیٰ معاشرتی اور ثقافتی اقدار کی کمیابی آنکھیں بند کرکے غیر مسلموں کی پیروی ہی وہ عوامل ہے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ عورت آج اپنے حق سے محروم ہے بلکہ مرد حضرات کا اس سے بھی برا حال ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر سننے اور پڑھنے میں آتا ہے کہ بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو قتل کردیا، یا جوان لڑکی گھر سے سونا اور پیسے لے کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ معاشرہ پر سکون اور مطمئن ہو تو ہمیں سیکولرز کے پڑھائے گئے سبق کو بھولنا ہوگا اور اس کے بدلے اسلامی اقدار کو گلے سے لگانا ہوگا۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

حسینہ کا بھیانک چہرہ

چلیں تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ ایک غدار اور سفاک انسان تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے غداری آخر کی کس سے ۔ بنگلہ دیش سے ؟ تو بھائی گزارش یہ ہے کہ جس وطن سے غداری کے الزامات شہید مطیع الراحمٰن نظامی پر لگائے گئے تھے، اس وقت تو اس وطن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا بلکہ اس وقت وہ ایک ایسی جنگ میں دفاع وطن کا فریضہ انجام دے رہے تھے جو غدار ملت شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے ملک توڑنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ للہذا آزمائش کے اس موقع پر مطیع الرحمان شہید) دفاع وطن کا جو فریضہ انجام دے ہا تھا وہ وقت کا تقاضہ اور ان کا دینی اور قومی) فریضہ تھا۔ یہ ہماری بد قسمتی تھی کہ وہ اور ان کے دیگر رفقاء اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے اور پاکستان کا وہ بازو ٹوٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد جماعت اسلامی بنگلہ دیش نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بنگلہ دیش کی ترقی میں صرف کر دیے کیونکہ اب وہی ان کا وطن تھا اور وطن سے غداری جیسے الفاظ جماعت اسلامی جیسی جماعت کے ڈکشنری میں موجود نہیں۔ یہی وجہ رہی کہ بنگالی عوام نے ہر موقع پر جماعت اسلامی پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ جس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی مختلف وقتوں میں حکومتوں کا حصہ رہی اور ان کے وزراء نے ملکی ترقی کے لیے قابل قدر

خدمات انجام دیئے لیکن کیا کیجیے شیخ مجیب کی بیٹی حسینہ واجد کا کہ اس کو انسانی خون کا ایسا چسکا لگا ہے کہ وہ لگاتار بے گناہ مسلمانون کا خون کر رہی ہے اور اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ حالانکہ ہمارے اس ''مہذب معاشرے،، اور امن کے عالمی ٹھیکداروں کا حق بنتا ہے کہ وہ درندہ صفت حسینہ کا ہاتھ روکے۔ کیونکہ دنیا کا ہر وہ شخص جس کا ضمیر زندہ ہو، جانتا ہے کہ بنگال کی حسینہ نے اپنے مخالفین کو ٹھکانے لگانے کے لیے جو وار ٹریبیونلز بنائے ہے۔ان کا کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ یہاں تک کے اقوام متحدہ نے بھی ان جنگی ٹریبیونلز کے قانونی حیثیت پر کئی سوالات اٹھائے ہیں لیکن آ فسوس کہ اپنے باس انڈیا،، کو خوش کرنے اور پاکستان کو نیچا دکھانے کے لیے حسینہ مسلسل جماعت اسلامی'' بنگلہ دیش کے اہم اور سرکردہ شخصیات کے خون سے ہاتھ رنگ رہی ہے اور اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ کسی اور سے کیا گلہ۔ جس وطن کی دفاع کا وہ جنگ لڑ رہے تھے۔ اس وطن کے پالیسی سازوں نے اس اہم ایشو کو وہ اہمیت ہی نہیں دیا جو کہ دینا چاہیے تھا اگرچہ مطیع الرحمان نظامی کے شہادت کے بعد پاکستان کے قومی اسمبلی اور پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر قرارداد مذمت منظور کی ہے جو کہ یقیناً ایک اچھی بات ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مذمتی قراردادوں سے بڑھ کر پاکستان کو کردار ادا کرنا ہوگا کیونکہ بنگالی حسینہ کے یہ اقدامات غیر منصفانہ اور ظالمانہ ہے بلکہ اس وقت پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش کے مابین ہونے والے معاہدے کی بھی صریح خلاف ورزی ہے۔ جس میں

جنگی و سیاسی قیدیوں کو معافی کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ پہلے براہ راست حسینہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں ہمارے سرتاج عزیز صاحب کو بنگلہ دیش کا دورہ کرنا بھی پڑ جائے تو اسے اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، دوسرا آپشن ہمارے پاس یہ بھی ہے کہ ہم سفارتی دباؤ کے ذریعے بنگلہ دیش کو ان کے ظالمانہ اقدامات سے روکے۔ اس سلسلے میں چین ، سعودی عرب اور دیگر دوست ممالک سے تعاون کی اپیل کی جا سکتی ہے، ایک اور مگر آخری راستہ ہمارے پاس یہ بھی ہے کہ ہم بنگلہ دیش کے ساتھ سفارتی تعلق کو منقطع کر دیں اور اقوام متحدہ کی توجہ بھرپور طریقے سے اس جانب مبذول کرانے کی کوشش کریں۔ میں یہ بات یقین کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ نواز حکومت کو مندرجہ بالا اقدامات میں سے کسی ایک پر بھی عمل کرنی کی توفیق مل جائے تو شیخ حسینہ کو ان کے مذموم کرتوتوں سے باز رکھا جا سکتا ہے اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ نہیں بلکہ پاکستان کا معاملہ ہے کیونکہ اس وقت جنگ بنگلہ دیش کی نہیں بلکہ پاکستان کی بقا کی لڑی جا رہی تھی۔ لہٰذا حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اپنے محسنوں کو اس بھیڑیئے کی شکنجے سے چھڑانے کے لیے فی الفور میدان میں اتریں۔ جہاں تک بات ہے جماعت اسلامی پاکستان کی۔ تو ان کے لیے میرے پاس یہی تجویز ہے کہ وہ احتجاج کے ساتھ ساتھ قومی و صوبائی اسمبلیوں میں اس معاملے کو زندہ رکھے۔ اس کے علاوہ امیر جماعت ، وزیر اعظم نواز شریف سے ملاقات کرکے ان

کو یہ احساس دلائے کہ آج جن کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے وہ کبھی ہمارے محسن اور وطن عزیز کے بہادر وفادار سپوت تھے ۔لہذا ہمیں فی الفور ان کے لیے آواز اٹھانی ہو گی تاکہ ان مظلوموں کا خون مزید نہ بہایا جا سکے۔آخر میں صرف اتنا کہ وطن عزیز کے ہر باشندے کو چاہیے کہ وہ اللہ پاک کے حضور دست بدعا ہو کر اپنے ان محسنوں کی سلامتی کے لیے خصوصی دعائیں مانگے جو کل بھی پاکستان کے لیے مر رہے تھے اور آج بھی ان کا قصور بس اتنا ہے کہ وہ پاکستان کو بچانے کی جنگ لڑ رہے تھے۔

جمعیت علما اسلام کی قیادت کو سوچنا ہوگا

میرے گذشتہ کالم ''مولانا صاحب ذرا سنبھل کے چل،، پر بعض احباب کی جانب سے ملا جلا رد عمل دیکھنے کو ملا۔ میں ان تمام احباب کا مشکور ہوں جنھوں نے اپنے قیمتی وقت کو صرف کرکے نہ صرف اس کالم کو پڑھا، اسے آگے پھیلایا بلکہ اپنے قیمتی خیالات سے بھی نوازا۔ ان احباب میں کراچی سے میرے واجب الاحترام بھائی جناب مولانا روح الباری صاحب بھی شامل ہے۔ جن کا شکوہ ہے کہ میں نے مولانا صاحب پر تنقید تو کی ہے لیکن ان کے مقابلے میں چیئر میں پاکستان تحریک انصاف عمران کو کلین چٹ دے دی۔ تو اس بارے میں اپنے بھائی کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ میرا مقصد تنقید برائے تنقید ہرگز نہیں بلکہ اس کالم میں جس تنقید کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ تنقید برائے تعمیر ہے نا کہ تنقید برائے تخریب۔ وہ کیسے؟ تو آئیں اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

اس بات میں شک کی گنجائش ہی کیا کہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کی وہ واحد سیاسی جماعت ہے جن کے قائدین کو تو چھوڑیں، عام ورکرز میں بھی علماء کرام کی اچھی خاصی تعداد موجود ہیں۔ جے یو آئی کے بارے میں آپ سمیت ملک بھر کے جید علماء کرام کی ایک بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ یہ جماعت وطن عزیز میں

دینی مراکز کا محافظ ہے۔ ملککی طرف اٹھنے والی ہر میلی نظر کے آگے سیسہ پھیلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے۔ یہ بھی اکثر علماء کرام کی رائے ہے کہ آج جو اس پاک سرزمین پر دین اسلام کے نشرو اشاعت کا کام ہو رہا ہے یہ بھی جمعیت ہی کے دم قدم سے ہے۔ تو بھائی مذکورہ بالا خوبیوں کی حامل جماعت کے اس امیدوار کو جن سے زندگی بھر کوئی نماز قضا نہیں ہوئی ہو، کباب و شباب کے محافل کے وہ قریب بھی نہ پھٹکا ہو، چوری و دروغ گوئی سے اسے سخت چڑ ہو غرض وہ عبادات، معاشرت اور معاملات میں اپنی مثال آپ ہو، وہ ایک ایسے امیدوار سے جن میں کوئی خوبی سرے سے موجود ہی نہ ہو جن کی زندگی کا مقصد عیش اور صرف عیش ہو ،الیکشن میں شکست بلکہ بری شکست کھا جائے۔ تو اس شکست کے عوامل تلاش تو کرنے ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ تلاش کا یہ عمل کون کرے گا؟ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے یہ ذمہ داری محبان جمعیت پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ جمعیت کے ہمدرد ہیں یا نہیں لیکن بحیثیت ایک عالم دین یہ ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوتی ہے کہ آپ ان وجوہات کو ڈھونڈیں جس کے باعث ایک اسلام پسند امیدوار ناکام جبکہ مال، مال اور صرف مال بنانے کی فکر رکھنے والا امیدوار جیت جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری ہر ذی شعور پاکستانی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی کوشش کریں۔

گذشتہ کالم میں میں نے

یہی کیا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک اسلامی ملک میں کے پارلیمان میں اسلام کے نام لیوا پارٹی کا چار، چھ نشستوں سے آگے نہ بڑھنا قابل آفسوس ہی نہیں باعث شرمندگی بھی ہے لہٰذا اس بری کارکرگی سے بچنے کے لیے پیشگی اقدامات اٹھانے ہونگے اور ذمہ داروں کا تعین کرنا ہوگا۔

میں نے جو محسوس کیا گذشتہ امید سحر میں تحریر کرڈالا اور اب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا موجودہ رویہ جمعیت علماء اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے نا کہ فائدہ مند۔ لہٰذا جمعیت کے ہر ہمدرد کو چاہیے کہ وہ مولانا صاحب اور ان کے بعض قریبی رفقاء کی توجہ ان سیاسی غلطیوں کی جانب مبذول کرائے جو وہ ان دنوں تواتر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے پاکستان تحریک انصاف کا، تو میں نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ خان کی جماعت دودھ کی دھلی ہوئی ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ میں نے گذشتہ کالم میں بھی پی ٹی آئی کے منفی پہلو کو اجاگر کیا تھا لیکن شائد بعض احباب نے اس پر توجہ دینے کی کوشش نہیں کی اس لیے وہ یہ سمجھے کہ میرا کام تحریک انصاف کا دفاع اور جمعیت پر بے جا کیچڑ اچھالنا ہے۔

ان احباب کی یہ سوچ منصفانہ نہیں لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اس تاثر سے رجوع کرلیں جو انہوں نے میرے بارے میں قائم کیا ہے۔ آخر میں دوبارہ احباب

جمعیت کے نام یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ جن کمزریوں کے بارے میں میں نے پچھلے کالم میں لکھا ہے، آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس بارے میں غور و خوض کیجیے تاکہ مرض کا بروقت علاج کیا جاسکے نہیں تو بعد میں جمعیت پائندہ باد اور قائد جمعیت زندہ کے نعرے محض نعرے ہی رہ جائیں گے جس کا ہرگز کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

یہ مبارک سعاتیں کہیں غفلت میں گزر نہ جائیں

یہ ہم سب کی خوش قسمتی اور اللہ پاک کا ہمارے اوپر رحم و کرم ہے کہ ایک بار پھر رحمتوں ،برکتوں ،بخششوں اور بندے کو اللہ کے قریب تر کرنے والا مہینہ ماہ رمضان المبارک ہمیں نصیب ہو رہا ہے۔ اہلًا و سہلًا مرحبا، اے ماہ صیام ۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس مبارک مہینے سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ اللہ رب العزت نے تو ہمیں کھلا موقع فراہم کردیا ہے کہ جتنا کچھ اس ماہ میں سمیٹ سکتے ہو سیمٹ لو۔ اگر ہم تھوڑا سا غور کریں اور دل و دماغ کے دریچے کھولراللہ کی مہربانیوں پر کچھ دیر کے لیے نظر ڈالیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص آئندہ کوئی گناہ کرنے سے پہلے کئی بار ضرور سوچ گا۔ یہ اللہ پاک کا ہم پر بے پناہ رحم و کرم نوازی ہے کہ اس ماہ بابرکت میں سرکش شیاطین کو قید کرلیا جاتا ہے اور ہمارے ہرنیک عمل کو کئی درجے بڑھا دیا جاتا ہے۔

اگرچہ رمضان کریم کے فضائل و برکات علماء کرام ہی بہتر طریقے سے بیان اور عوام الناس کو سمجھا سکتے ہیں مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان مبارک دنوں میں نفلی عبادت کا درجہ فرائض کے برابر اور فرائض کا درجہ ستر گنا بڑھایا دیا جات اہے۔ مومن کارزق اس مہینے بے حساب بڑھ جاتا ہے، جو کسی روزے دار کو

روزہ افطار کرائے ''چاہے پانی کے ایک گھونٹ ہی سے کیوں نہ ہو'' اس کا یہ عمل گناہوں کی بخشش اور دوزخ سے نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اس روزہ دار کے ثواب جتنا ثواب بھی اس کو حاصل ہوتا ہے۔

اس مہینے کے پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا عشرہ آگ سے نجات کا ذریعہ ہوتا ہے اور وہ عظیم رات کہ جسے ہم لیلۃ القدر کی نام سے جانتے ہیں وہ اس ماہ مبارک میں اس امت کو عطاء کی گئی اور اس رات میں عبادت کو ہزار مہینوں کے عبادت سے بہتر قرار دیا گیا۔ ان تمام عبادات سے صاف ظاہر ہوتا ہے وہ بے نیاز اور غفورالرحیم ذات چاہتی ہے کہ میرے بندے اس دار فانی سے جب واپس لوٹیں تو کامیاب وکامران ہوں اور آخرت کے اس لامحدود زندگی سے جیسے چاہے لطف اٹھاسکیں۔

ہمارے اس معاشرے کے بیشتر لوگ اس ماہ مبارک سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس کا اندازہ ہم مساجد میں نمازیوں کے بڑھتی ہو تعداد سے لگا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک قابل توجہ اور افسوسناک امر یہ بھی ہے کہ ہم میں سے کئی لوگ اس ماہ مبارک میں اللہ رب العزت کے بے پناہ رحمتوں کو یکسر نظرانداز کردیتے ہیں۔ نفس کے اشاروں پر چلتے ہوئے اس موقع غنیمت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو سرے سے روزے رکھتے ہی نہیں

ہیں۔ ان میں بڑے شہروں کے انڈسٹریل ورکرز، پبلک ٹرانسپورٹ چلانے والے بعض ڈرائیورز اور کنڈیکٹرز، گرم علاقوں کے وہ زمیندار جنہیں زمینوں پر کا کرنا پڑتا ہے اس کے علاوہ ایلیٹ کلاس کے روشن خیال اور سندھ و پنجاب کے اکثر درزی حضرات اس طبقے میں شامل ہیں۔ جو نہ رمضان کو جانتے ہیں اور نا ہی احترام رمضان۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو باقاعدہ سحری کے لیے اٹھتا ہے لیکن سحری کھا کر نماز کا انتظار کئے بغیر مزے کی نیند سوتے ہیں اور سونے سے پہلے اہلیہ کو یہ وصیت کرنا ہرگز نہیں بھولتے کہ بیگم بچوں کو سنبھال کے رکھنا، کہیں آرام میں خلل واقع نہ ہوجائے۔ ایسے حضرات کی آنکھ اگر نماز ظہر کے وقت کھل جائے تو یہ نماز پڑھنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتے لیکن اگر تین چار بجے تک ان کی آنکھ نہ کھلے تو یہ شیطان کو کوستے ہوئے بازار کی طرف چل پڑتے ہیں جہاں سے یہ لوگ حسب استطاعت پھل، پکوڑے، سموسے، مشروبات اور مختلف قسم کی چٹنیاں لے کر افطار سے پندرہ بیس منٹ پہلے گھر پہنچتے ہیں۔ ان پندرہ بیس منٹ میں یہ لوگ افطاری تیار کرتے ہیں اور اس کے بعد ڈٹ کر افطار کرتے ہیں۔ تراویح یہ لوگ اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس وقت ان حضرات کو نیشنل اور انٹرنیشنل صورت حال سے باخبر رہنے کے لیے ٹی وی پر خبریں اور ٹاک شوز دیکھنے ہوتے ہیں۔ اس طبقے میں کون لوگ شامل ہیں، یہ بتانا اس لیے ضروری نہیں کہ آس پاس دیکھنے سے ایسے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نظر آجاتے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جن کا مقصد صرف و صرف تراویح میں ختم قران تک شریک ہونا ہوتا ہے۔

ادھر تراویح میں قرآن مجید مکمل ادھر یہ مسجد سے ایسے غائب جیسے کہ گدھے کہ سر سے سینگھ۔

قارئین کرام ! ذرا نظر دوڑائیں۔آپ کو اپنے آس پاس ایسے بے شمار کردار نظر آجائیں گے جن کا ذکر آپ نے کالم میں پڑھ لیا۔اب یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے ان بھائیوں کی اصلاح کی بھی فکر کریں اور اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم بے تکلف ہوکے مل سکتے ہیں ان کی توجہ ہم خود دلائے ۔البتہ جن کے ساتھ ہمارے تعلقات اس نوعیت کے نہ ہوتو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم محلے کی مسجد کے پیش امام صاحب یا محلے کے بزرگوں کی توجہ اس جانب دلائے تاکہ پیش امام صاحب یا وہ بزرگ حضرات انہیں یہ بتائے کہ بھائی اس مہینے میں بھی اگر کوئی اللہ پاک کے ان ڈھیر سارے انعامات اور اعزازات سے محروم رہاتو اس سے بڑا بدقسمت اور کوئی نہیں ۔اس لیے اس غفلت کو چھوڑیں اور ماہ صیام کے ان برکتوں اور اللہ کی رحمتوں سے بھرپو فائدہ اٹھائیں تاکہ دنیاوی واخروی زندگی میں کامیابی آپ کا مقدر ٹھہرے۔

افغان مہاجرین کا مسئلہ تدبر سے حل کیجیے

یقیناً بڑی خدمت کی ہے ہم نے افغان مہاجرین کی۔ لگ بھگ چار دہائیوں تک ہم نے ان کی میزبانی کی۔ جن کا افغانوں کو احساس بھی ہے اور وہ ہمارے احسان مند بھی ہے لیکن کیا ہم اس وقت ان کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں اور جو رویہ حکومت نے اپنا رکھا ہے وہ مبنی بر انصاف بھی ہے اور کیا وطن عزیز کو اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہو سکتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہر گز نہیں۔ بلکہ اس وقت ہماری حکومت نے افغان مہاجرین کے حوالے سے جو رویہ اپنا رکھا ہے وہ وطن عزیز پاکستان کے لیے سوائے گھاٹے کی سودے کے اور کچھ نہیں ۔ اگر حکومت نے صورت حال کا بروقت ادراک نا کیا تو پھر ہمیں تا دیر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں دہشت گردی کے کئی بڑے واقعات کے تانے بانے افغانستان جا کے ملتے ہیں۔ جس پر ہماری حکومت اور ملکی دفاع کے ضامن ادارے افغانستان سے بارہا احتجاج بھی کر چکے ہیں لیکن تاحال افغانستان نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا کہ جس سے پاکستان مطمئن ہو سکے۔ سچ یہ بھی ہے کہ پاکستان میں مقیم بعض افغان مہاجرین غیر قانونی، غیر اخلاقی اور تخریبی کارروائیوں میں بھی ملوث ہیں۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا افغانستان کی

موجودہ حکومت یا اس سے پہلے کرزائی حکومت کو ہم افغان عام کا نمائندہ حکومت کہے سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ بالکل بھی نہیں بلکہ سچ یہ ہے اشرف غنی ہو یا اس سے پہلے حامد کرزائی دونوں کی حیثیت امریکی کارندوں سے بڑھ کر نہیں ہے۔

اب افغانوں کی نظر میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ ہم ایک عام افغان باشندے کی دل میں امریکہ کے خلاف مزاحمت کرنے والی قوت یعنی طالبان سے محبت دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ یہ عام افغانوں کی امریکہ اور اس کے زیر انتظام چلنے والی حکومت سے نفرت و عداوت ہی تو ہے کہ آج کابل جیسے ہائی سیکیورٹی زون بھی مزاحمتی قوتوں کے حملوں سے محفوظ نہیں۔ اسی لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج اگر افغانستان میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف منصوبے بنانے والوں کو وہاں کی حکومت کا آشیرباد حاصل ہے تو اس میں ایک عام افغانی کا کوئی عمل دخل یا کردار نہیں۔ یہ اس گریٹ گیم کا حصہ ہے کہ جس کے رو سے پاکستان کو دیوار سے لگا کر خطے میں بھارتی بالادستی کو یقینی بنایا گیا۔'' اس بات کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے امریکی سرپرستی میں بننے والا انڈیا، افغانستان اور ایران کا غیر اعلانیہ اتحاد کا مطالعہ قارئین کو ضرور کرنا چاہیے'' لہذا جب بھی افغانستان میں حقیقی عوامی نمائندہ حکومت بنے گی تو پھر ہم دیکھیں گے کہ نہ تو افغان سرزمین پر پاکستان کے خلاف کوئی منصوبہ

تیار ہوگا اور نا ہی وہاں سے کوئی پاکستان پر حملہ آور ہوگا۔

جہاں تک سوال ہے افغان مہاجرین کی تخریبی سرگرمیوں کا تو تقریباً چار دہائیوں سے پاکستان میں رہائش پذیر لاکھوں افغان مہاجرین میں سے بعض کیوں غیر قانونی سرگرمیوں کی جانب مائل ہوئے؟ کیا ہم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے۔ اگر غور کیا بھی ہے تو کیا افغان مہاجرین کو بے دخل کر دینے کے سوا اس مسئلے کا کوئی اور حل سامنے نہیں آیا؟ سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا پچیس، تیس لاکھ مہاجرین سب کے سب دہشت گردوں کے پشتیبان بنے رہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو ایک اور سوال یہاں یہ بھی اٹھتا ہے کہ ہماری حکومت اور ہمارے ادارے کیا کر رہے تھے اور اگر جواب نا میں ہے تو پھر یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکتے جائیں۔ کیا اس بات کا کوئی جواز ہے کہ جرم کوئی ایک فرد یا گروہ کریں اور اس کا نزلہ سب پر گرا دیا جائے۔ بات یہ ہے جو بھی افغان مہاجر کسی جرم میں ملوث ہے تو اسے الٹا لٹکایا جائے لیکن جو بے قصور ہیں ان کو اس وقت تک عزت و احترام سے یہاں رہنے دیا جائے جب تک ان کے ملک سے غیر ملکی افواج نکل نہ جائے۔

نہ جانے حکومت وقت چار دہائیوں پر محیط اپنی محنت اور قربانیوں کو یک دم سمندر برد کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔" حالانکہ اب افغانوں کو ان کی

قربانیوں کا صلہ ملنے والا ہے اور ہمیں چند سال ہی اور ان کے میزبانی کرنی پڑے گی،،
یاد رکھیں ! یہ وقت پاکستان کے لیے نہایت نازک بھی ہے اور اہمیت کا حامل بھی۔
اس وقت وطن عزیز ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں ایک درست فیصلہ ہمیں ایشیا کا ٹائیگر بنا سکتا ہے لیکن دوسری جانب ایک چھوٹی سی غلطی ہمیں نہ صرف خطے میں تنہا کر سکتی ہے بلکہ مسائل کے ایسے دلدل میں پھنسا بھی سکتی ہے کہ جس سے نکلنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ اب ہوش اور دانش مندی کا فیصلہ یہی ہے کہ ہم افغان مہاجرین کے ساتھ روا رکھے جانے والے حالیہ سلوک سے باز آ جائیں۔ ان کو بھرپور عزت دی جائے۔ انہیں یہ باور کرایا جائے کہ پاکستان ہی افغانستان کا حقیقی خیر خواہ ہے جبکہ ہندوستان کی مثال ایک اجنبی جیسی ہے جن کا مقصد صرف اور صرف اپنا مفاد دیکھنا اور پاکستان کو غیر مستحکم کرنا ہے۔ افغان مہاجرین کی ذہن سازی کرکے انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ اگر بھارت افغانستان کو استعمال کرکے پاکستان میں مداخلت کرتا رہا تو پھر امن افغانستان کے لیے بھی ایک خواب بن جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو افغانستان میں ایک ایسی حکومت کے قیام کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے جو افغان عوام کی حقیقی نمائندہ ہو۔ لیکن اگر پاکستان نے اپنا کو موجودہ روش برقرار رکھا اور پچیس لاکھ افغان مہاجرین کو زبردستی بے دخل کر دیا تو پھر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ انڈیا ایسے ہی موقع کے تاک میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ جب دیکھے گا کہ لاکھوں مہاجرین کو ایک دم سے سنبھالنا افغان

حکومت کے بس سے باہر ہے۔ تو وہ افغانستان کو اپنا ہر ممکن تعاون کا یقین دلائے گا۔ وہ ایک طرف واپس جانے والے افغانوں سے ہمدردی جتا کر انہیں یہ باور کرائے گا کہ پاکستان نے مشکل وقت میں آپ کو دربدر کرکے دشمنی کا ثبوت دیا ہے جبکہ ہم آپ کے حقیقی دوست اور ہمدرد ہے۔

دوسری جانب انڈیا افغانستان میں موجود اپنے تربیت یافتہ اہلکاروں کے ذریعے افغانوں کے ذہنوں کو پاکستان سے متنفر کرنے کی پوری کوشش کرے گا اور پھر افغان سرزمین پر بیٹھ کر ہمارے خلاف منصوبے بنائے گا۔ جس کے بعد ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ امریکہ، انڈیا، افغانستان اور ایران کے گٹھ جوڑ کا ہمارے اوپر کیا تباہ کن اثرات پڑ سکتے ہیں۔ایک ایسے وقت میں کہ جب پاکستان کا معاشی نقشہ بدل دینے والے منصوبے پاک چائنہ اقتصادی راہداری پر ابتدائی کام شروع ہوچکا ہے اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ اور ہندوستان اس منصوبے کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔ ایسے میں خطے میں امریکی اور بالخصوص بھارتی اثرات کم کرنے کے لیے پاکستان کو دوستوں کی تعداد بڑھانی ہوگی کیونکہ جب دوست بڑھیں گے تو دشمنوں کا حوصلہ خود ہی ٹوٹے گا۔ لیکن اگر ہم نے اپنے پچیس لاکھ دوستوں کو دشمن تصور کرکے سرحد کے اس پار دھکیل دیا تو پھر یاد رکھیں کہ انڈیا انہیں دوست بنانے کے لیے تیار بیٹھا ہے اور جب دوست دشمن بن جائے تو پھر اس کے کیا اثرات نکل سکتے ہیں اس کے تصور ہی سے روح

کانپ اٹھتی ہے۔

یوم آزادی ایک نئی امید کے ساتھ

خاص برائے 14 اگست

الحمدللہ ! اللہ تعالٰی رب العزت وحدہ لاشریک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم ایک بار پھر یوم آزادی نہایت جوش خروش سے منا رہے ہیں۔ یوں تو ہم 14 اگست کو گذشتہ انہتر سالوں سے بطور یوم آزادی مناتے چلے آرہے ہیں لیکن اس سال یوم آزادی کا جشن ذراہٹ کہ اور خوشی کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ کیوں؟ تو اس لیے کہ گذشتہ کچھ سالوں سے ہم بے لگام گھوڑے کی طرح بے سمت دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارا ضمیر اس قدر بے حس اور مردہ ہو چکا تھا کہ ہم بزرگان تحریک آزادی پاکستان کے وژن وسوچ کو مکمل طور پر فراموش کر کے دشمنان ملک وملت کو صحیح سمجھ کر خود کو ان کے سپرد کر چکے تھے۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی کہ ہر محب وطن غمگین وافسردہ تھا اور وہ دن رات یہی سوچ رہا تھا کہ کیا وطن عزیز کے پالیسی ساز پھر سے واشنگٹن کے بجائے مکہ کو اپنا قبلہ تسلیم کر لیں گے۔

یہ شاید اہل وطن کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ آج وطن عزیز کے کرتا دھرتا مکمل طور نہ سہی لیکن کسی نہ کسی حد تک اپنے سابقہ روش سے رجوع کر چکے ہیں۔ یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ آج ہمارے ملک کی قیادت کی سمجھ میں یہ بات آچکی

ہے کہ ہندوستان سے دوستی کے پینگیں بڑھانا اپنے اکابرین کی روحوں کے ساتھ غداری، کشمیریوں کے ساتھ بے وفائی اور خود کو دھوکا دینے کی سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اقوام متحدہ میں طویل عرصے بعد کشمیر کی گونج سنائی دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ امریکا کی دوست اگرچہ ہماری حکومت آج بھی ہے لیکن یہ بھی مقام شکر ہے کہ اب اعلیٰ سطح پر یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ امریکہ پر حد سے زیادہ انحصار ہمیں مزید تباہی کی طرف دھکیل سکتا ہے۔ دوسری جانب اگر ہم نظر ڈالیں ملک کے اندرونی صورت حال پر تو یہاں صورت حال اگرچہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں۔ مہنگائی کا جن بدستور قابو سے باہر ہے۔ ملک کا مزدور اور ملازمت پیشہ حسب معمول استیصال کا شکار ہے۔ تعلیم کے دروازے غریب کے بچے پر بند ہے۔ بے روزگاری، پانی کی قلت اور بجلی کی لوڈشیڈنگ کا بھی ہمیں سامنا ہے لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ اب قانون کا ہاتھ ہر اس فرد اور گروہ کی جانب بڑھنے لگا ہے جو کہ کسی بھی تخریبی سرگرمی میں ملوث ہو۔ یہ بھی پہلی بار ہی ہورہا ہے کہ سیاسی شیلٹرز میں پناہ لیے ہوئے تخریب کار اور ان کے فنانسرز جو کہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھ رہے تھے اب قانون کی گرفت میں ہیں اور ان کے مزید ساتھی بھی جلد ہی قانون کے شکنجے میں آجائیں گے ۔ یہ ہے وہ عوامل جس کے بنا پر آج کا 14 اگست ہم ایک نئے عزم اور نئی امید کے ساتھ منارہے ہیں اور آئندہ کے لیے بھی ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے حکمرانوں کو یہ توفیق دیں کہ وہ پاکستان کو ایسا پاکستان بنائے کہ جس کا ہمارے اکابرین نے

اس وقت مسلمانان ہند کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ وہ پاکستان کیسا ہوگا تو اس کے لیے ہمیں ذرا ماضی میں جھانکنا ہوگا۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حصول پاکستان کے لیے جدوجہد صرف اس طبقے نے نہیں کی کہ جو پہلے سے اس علاقے میں موجود تھا یا وہ آزادی ملتے ہی ہجرت کرکے پاکستان تشریف لائے۔ بلکہ مسلمانان ہند کا ایک بہت بڑا طبقہ اس وقت ایسا بھی تھا کہ جو پاکستان آ نہیں سکتے تھے اور جنہیں یہ معلوم تھا کہ مسلمانوں کو ایک آزاد وطن ملنے پر وہ ہندوستان میں ہندوؤں کے غیض و غضب سے بچ نہیں سکیں گے لیکن وہ پھر بھی اس امید پر تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے کہ چلیں ہمیں نہ سہی ہمارے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو تو نئے وطن میں اسلام اور اسلامی معاشرے کے وہ ثمرات اور خیر و برکات مل جائیں گے جن کا ملنا ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہتے ہوئے کسی بھی طور ممکن نہ نہیں۔ ان مسلمانوں کا ایسا سوچنا بجا اور برحق تھا کیونکہ اس وقت تحریک کے قائدین نے ان سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ جب ہم آزاد وطن کے حصول میں کامیاب ہوجائیں گے۔ تو یہ کہ نہ صرف نیا وطن مدینہ منورہ کے طرز کا ایک فلاحی اسلامی مملکت ہوگا بلکہ مصیبت کے کسی بھی گھڑی میں وہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ قائدین کے عزم مصمم کو دیکھ ہندوستانی مسلمان نتائج سے بے پرواہ ہوکر یقین کامل کے ساتھ حصول مقصد کے لیے میدان میں کود پڑے اور لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر وطن عزیز کو آزاد کرایا۔

آزادی کے بعد شائد ہماری بدقسمتی تھی

کہ محمد علی جناح جلد ہی دنیا سے رحلت فرما گئے۔ قائد کے انتقال کے بعد ملک اسلامی فلاحی ریاست بننے کی بجائے سیاسی اکھاڑا بن گیا۔ کوئی زبردستی تو کوئی دھونس دھاندلی کے ذریعے وطن عزیز پر مسلط ہوتا گیا اور اپنے اقتدار کو دوام بخشنے جو بھی حربا مناسب سمجھا، اسے اپنانے سے بالکل بھی گریز نہیں کیا۔ مفاد پرستی کے اس کھیل ہی کا نتیجہ ہے کہ وطن عزیز میں آج جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ گناہ سے تو پاک لیکن قرض کا بھاری بوجھ سر پر لیے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ مفاد پرستی کے اس کھیل کا اندازہ ہم اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ 1973 کے متفقہ آئین کے کئی شقوں پر آج تک حکمران طبقے کو عمل کی توفیق نہیں ہوئی کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے ذاتی مفادات پر زد پڑتی لیکن دوسری طرف اگر نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے تو آئین میں کرائے گئے کئی ترامیم صرف و صرف حکمرانوں کے ذاتی اختیارات کو دوام بخشنے کے لیے ہیں نہ کہ عوامی مفاد کے لیے۔ اب ایک لمبے عرصے کے بعد ہمیں اگر عسکری قیادت کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات کے بدولت تھوڑا سا سکون بھی ملا ہے تو ہمیں اسے گنوانا نہیں چاہیے بلکہ ہمیں اپنے رویوں میں تبدیلی لاکر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ جب ہم بدلیں گے تو بدلے گا پاکستان۔

بھارت دھمکیوں کے بجائے مفاہمتی پالیسی اختیار کرے

مقبوضہ کشمیر کے علاقے ضلع بارہ مولا کے قصبے اڑی میں بھارتی فوجی مرکز میں ہونے والے حملے میں تو پھر میں بھارتی فوج کے کئی اہم اراکین ہلاک ہوئے ہیں۔ ورنہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی کتا بھی حادثاتی موت مر جائے تو ہندوستان اس کا الزام بھی پاکستان پر دے ڈالتا ہے۔ جہاں تک بات ہے کشمیر میں بھارتی فوجی مرکز پر حملے اور اس کے بعد اعلیٰ ہندوستانی اہلکاروں کی جانب سے پاکستان کو دی جانے والی دھمکیوں کی۔ تو اس سلسلے میں ہندوستان سمیت پوری دنیا کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیر کی آزادی کے لیے شروع کی گئی تحریک اہل کشمیر کی خالص اپنی تحریک ہے اور اسے کشمیر کے بزرگوں، بیٹیوں اور بیٹوں نے محض اللہ پاک کے رحم و کرم اور اپنے زور بازو پر زندہ رکھا ہوا ہے۔ جہاں تک تعلق ہے پاکستان کا۔ تو دنیا جانتی ہے کہ پاکستان نے روز اول سے ہی کشمیریوں کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی مدد کی ہے اور یہ پاکستان نے کوئی غلط کام نہیں کیا بلکہ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ ہر حال میں کشمیری قوم کو ان کا جائز حق ملنے یعنی ''ہندوستان سے آزادی تک'' ان کا ہر قسم حمایت جاری رکھے۔

پاکستان کے علاوہ اگر باقی دنیا کی بھی بات کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ

دنیا کے ہر ملک کو چاہیے کہ وہ کشمیریوں کی آواز سنے اور ان کی ہر ممکن مدد کریں۔ کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ کشمیریوں کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق اقوام متحدہ نے بھی دے رکھا ہے۔ یہ اب ''مہذب دنیا'' کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلے میں UN کی کردار ادا کریں تاکہ اس قابل ہوجائے کہ اسے اپنے ہی قرارداد پر عمل درآمد کی توفیق نصیب ہوجائے۔ دنیا کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک بعض عالمی طاقتیں دوغلی پالیسی نہیں چھوڑیں گے اور پس پردہ ہندوستان کو شہ دیتے رہیں گے۔ کشمیر تو کیا پورے خطے میں امن کا خواب دیکھنا دن میں تارے دیکھنے کا مترادف ہوگا۔ یہ بات ہر ذی شعور جانتا ہے کہ بزور طاقت، جبر واستبداد کے ذریعے کوئی کسی کو اپنا نہیں بناسکتا مگر یہ بات ہندوستان کو سمجھ نہیں آتی۔

ہندوستانی فوج گذشتہ کئی دہائیوں سے اہل کشمیر پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے تاکہ انہیں زبردستی اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ ہندوستان کو اپنا آقا تسلیم کرلیں۔ سلام ہے کشمیر کے غیور بیٹوں کو کہ شہادتیں دے کر، بہنوں و بیٹیوں کی عصمتیں لٹاکر، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرکے پھر بھی یہ نعرہ لگارہے ہیں کہ ''کشمیر بنے گا پاکستان''۔ اہل کشمیر کو اس نعرے سے باز رکھنے کے لیے ہندو فورسز درندوں کی طرح جب مظلوم کشمیریوں پر ٹوٹ پڑتی ہے تو وہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کیا ہے اور انسانی حقوق کیا ہے۔ کچھ ایسا

ہی حال باقی دنیا کا بھی ہے جن کو جانوروں کے حقوق تو یاد ہیں لیکن شائد وہ اہل کشمیر کو جانوروں سے بھی کم تر سمجھتے ہیں اسی لیے ان پر ہونے والے مظالم پر لب سیے بیٹھے ہیں۔ جب کوئی کشمیری مجاہد ہندوستانی فوج کو آئینہ دکھاتا ہے تو پھر دنیا کا سب سے بڑا جمہوری" اور "سیکولرزم کا علمبردار" ملک فوراً پاکستان پر الزام لگا کر واویلا شروع" کر دیتا ہے اور پاکستان پر الزام عاید کرتا ہے۔

دوسری طرف بعض عالمی طاقتوں کے منافقت کا اندازہ ہم اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کو ذرا سی خراش آنے پر ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن بد قسمتی سے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر عمل کا رد عمل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا سینکڑوں کشمیریوں کی شہادت کے بعد اگر کوئی کشمیری مجاہد دو، چار بھارتی فوجیوں کو جہنم واصل کر دے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جہاں تک بات ہے پاکستان کو ہندوستان کی جانب سے دھمکیوں کی۔ تو ہندوستان کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ پاکستان ایک ایٹمی ملک ہے اور جذبہ جہاد سے سرشار اس کے کروڑوں عوام کسی بھی مشکل گھڑی میں اپنی فوج کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے۔

ہندوستان کو چاہیے کہ وہ گیدڑ بھبکیوں سے باز آجائے، کشمیریوں کو بزور قوت زیر کرنے والی پالیسی چھوڑ کر انہیں ان کی مرضی سے جینے دے، کراچی اور

بلوچستان کے دہشت گردوں پر جو سرمایہ کاری آپ کر رہے ہیں اس سرمایہ سے اپنے ان عوام کی بہبود کے لیے کچھ کر لیجئے تاکہ ان بیچاروں کو دو وقت کی روٹی اور بیت الخلاء جیسی بنیادی ضرورت تو میسر آ جائے۔آپ کا یہ سرمایہ یقینی طور پر ڈوبے گا کیونکہ یہ 1971ء نہیں 2016ء ہے اور آج کے سپہ سالار کو آپ کے ارادے بھی معلوم ہے تو آپ کے کارندوں کے ٹھکانے بھی۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ خطے کا چودھری بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ وہ اس لیے کہ اس خوب کو روس اور اب امریکہ تعبیر سے ہمکنار نہ کر سکیں تو آپ کس کھیت کی مولی ہے۔

ہندستان کے پاس ایک آپشن ہے جس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اپنے عوام کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ وہ پڑوس کے ممالک میں مداخلت کرنا بند کر دیں۔ ملک کے اندر اقلیتوں کو ان کے حقوق دیئے جائیں اور مقبوضہ کشمیر سے اپنی افواج کو نکال کر اس پر اٹھنے والے اخراجات کو اپنے عوام کے فلاح و بہبود پر لگائیں۔ مگر یہ بات عیار ہندو نہ تو پڑوسی ممالک میں مداخلت بند کرے گا اور نہ ہی اقلیتوں کو ان کے حقوق دیں گے اور نا ہی برضا و خوشی کشمیر سے اپنی فوجیں نکالیں گے۔ نتیجتاً زیر قبضہ علاقوں میں علیحدگی کی تحریکیں تیز سے تیز تر ہوں گے اور بھارت کی عوام کی بڑی تعداد تیزی سے سطح غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبو ہو جائیں گے۔ جس کے بعد ہذیانی کیفیت میں پڑوسیوں پر حملے کی دھمکی دیں گے جس سے خطے کا امن داو پر لگ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ اب

عالمی برادری کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھارت کو ان کے خطرناک عزائم سے باز رکھے اور کشمیریوں کو ان کا حق دلانے میں ان کی مدد کریں۔

خیبر پختون خواہ اسمبلی کو مبارک ہو

فضل سبحان (حقیقی کردار کا فرضی نام) کا تعلق کراچی سے تھا اور وہ چند برس پہلے انتقال کر گئے ہے۔ یہ 2001 یا 2002 کی بات ہے جب وہ اورنگی ٹاؤن سے کورنگی انڈسٹریل ایریا میں مقیم اپنے ایک عزیز کے ہاں پہنچ گئے۔ علیک سلیک کے بعد جب دونوں میں باہمی گفتگو شروع ہوئی تو اس میں ایک جانب سے طنز کا عنصر نمایاں تھا جب کہ فضل سبحان کا پوزیشن دفاعی ہی نہیں ذلت امیز بھی تھا، دراصل فضل سبحان نے کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے اس عزیز سے کچھ تیرہ ہزار روپے ادھار لیے تھے لیکن جب مقررہ وقت تک وہ رقم کو واپس کرنے میں ناکام رہے تو اس کے عزیز نے اس قرضے کو سود میں تبدیل کرادیا جو اب ڈیڑھ لاکھ روپے بن چکا تھا۔ فضل سبحان آج منت سماجت اس لیے کر رہا تھا کہ ان کے پاس پورے ڈیڑھ لاکھ نہ تھے جب کہ ان کے عزیز کا اصرار تھا کہ پیسے پورے چاہئیے اور وہ بھی ابھی ابھی۔ تقریباً گھنٹہ بھر بحث و مباحثے کے بعد افضل سبحان اس وعدے پر اپنے عزیز کو منانے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ چند مہینوں کے اندر ہی سارا قرضہ بمعہ سود اتارنے کا انتظام کردے گا بعد میں اللہ پاک نے کرم کردیا فضل سبحان کا وہ عزیز سود سے تائب ہوگیا۔اس نے صرف اپنا اصل رقم فضل سبحان سے واپس لے لیا اور سود کا سارا پیسہ چھوڑدیا یوں فضل سبحان ایک بڑی مصیبت سے نکل آیا۔

قارئین کرام! یہ تو محض ایک کردار کی سچی کہانی ہے ورنہ آس پاس نظر دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ آج کے اس جدید دور میں بھی کئی لوگ ایسے موجود ہے کہ وہ نہ صرف سودی کاروبار کرتے ہیں بلکہ مجبور لوگوں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں سود کی ایسے زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں، جس سے وہ زندگی بھر تگ ودو کے باوجود بھی نہیں نکل پاتے۔ آج ہمارے اس معاشرے میں کئی ایسے افراد موجود ہیں، جو سود خوروں کے غیض وغضب کا نشانہ بن رہے ہیں اور ان کی عزت کے جنازے نکل چکے ہیں لیکن اس کے باؤجود بھی وہ سود سے چھٹکارا پانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔

سود کیا ہے؟ سود اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ ہے۔ اور ہم سب یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کا مطلب دنیا و آخرت کی تباہی کے سبب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تو حدیث مبارکہ میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہے۔ حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود خوری کے ستر حصے ہیں، ان میں ادنی اور معمولی ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرنا، (معارف الحدیث صفحہ 504)

مولانا مفتی محمد عاشق بلند شہری رحمہ اللہ اپنی کتاب تحفۃ المسلمین کے صفحہ 928 پر مشکوۃ المصابیح کے حوالے سے ایک حدیث مبارکہ نقل کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ: حضرت عبداللہؓ بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود کا ایک درہم جسے انسان کھالے اور وہ جانتا ہو (کہ یہ سود کا ہے) تو (اس کا گناہ) چھتیس 36 مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن و حدیث میں سود کی ممانعت اور اس کی تباہیوں کے بارے میں کئی وعیدیں موجود ہیں۔ مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ جو بندۂ خدا سود جیسی لعنت میں پھنس جائے تو پھر اس کا اس لعنت نکلنا محال ہو جاتا ہے اور سود خور کی کڑوی کسیلی باتوں کو روز سننا پڑتا ہے۔ یہ تو ہوئی نجی سود کی بات۔ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے وطن کا پورا معاشی نظام سود پر کھڑا ہے اور شائد یہی وجہ ہے کہ قدرت کے ہر نعمت سے مالامال ہونے کے باوجود بھی ہم ذلیل خوار پھرتے نظر آتے ہیں۔

آفسوس کی بات یہ ہے کہ جب بھی، جس نے بھی اس لعنت کی خاتمے کی کوشش کی ہے، ہمارے ارباب واختیار نے اس سے فوراً چھٹکارا پانے میں ہی عافیت جانی ہے اس سلسلے میں نواز لیگ کا کردار خاصا ''روشن'' کہ وہ سود کے خاتمے کی کوشش کرنے والے وفاقی شرعی عدالت کے ایک معزز جج کو قبل از وقت برطرف کرنے میں ملوث رہے ہیں، یہ شائد ہماری کم بختی ہے کہ آج پھر نواز لیگ وطن عزیز میں اقتدار کے مزے لوٹ رہی ہے لیکن ماضی کی طرح سودی نظام سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کرنے کی بجائے اس کے جڑوں کو مزید پانی دے

رہی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے اور مرکزی حکومت اس کے سائے تلے آرام فرمارہی ہے۔ دوسری طرف خیبر پختون خواہ اسمبلی نے سود خوروں کو انصاف کے کٹھرے میں لانے کے لیے ایک تاریخی بل متفقہ طور پر منظور کیا ہے جس پر خیبر پختون خواہ اسمبلی کے تمام ارکان مبارک باد کے مستحق ہے۔ تفصیلات کے مطابق پاکستان پیپلز پارٹی کے فخر اعظم اور جماعت اسلامی کے اعزاز الملک افکاری سمیت بعض دیگر ارکان کی جانب سے پیش کیے گئے بل کو ارکان اسمبلی نے ایک اہم اور تاریخی بل قرار دیتے ہوئے متفقہ طور پر اس کو منظوری دے دی ۔ اس بل کے رو سے نجی سود یا ان اداروں کے جو نجی سودی کاروبار کرتے ہیں اور مجبور عوام کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، ان پر مکمل پابندی ہوگی اور اگر وہ سود سے باز نہ آئے تو انہیں دس سال قید اور دس لاکھ جرمانے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اسی طرح کسی مجبوری کی بنا پر قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں اگر کوئی قرض دار کو مارتا پیٹتا ہے تو اسے پانچ سال قید اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ کے سزا ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پختون خواہ اسمبلی نے بروقت اقدام کرکے سود خوروں کو قانون کے شکنجے میں کسنے کی اچھی کوشش کی ہے ۔ ضرورت اب اس امر کی ہے کہ اب اس بل پر جو کہ اب تک قانون بن چکا ہوگا فوری عمل درآمد کی جائے ۔ تاکہ اس کے ثمرات سود میں جکڑے مجبور لوگوں کو فوری مل سکے ۔ دوسری صوبائی اسمبلیوں کو

بھی چاہیے کہ وہ پختون خواہ اسمبلی کی تقلید کرتے ہوئے سودی کاروبار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کریں۔اس کے علاوہ وفاقی حکومت کو بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ سے باز آنا چاہیے اور سودی نظام کو خیر باد کہنا چاہیے بصورت دیگر تباہی و بربادی ہی ہمارا مقدر بنے گی۔

معصوم درندہ

سوات پولیس کے لیے یقیناً یہ کیس کسی امتحان سے کم نہ تھا کیونکہ مقتول کو کسی نے دھمکی دی تھی اور نا ہی اس کی کسی سے جائداد کا تنازعہ تھا۔ وہ کسی خاندانی رنجش کا شکار تھا اور نا ہی اس کی کسی سے ذاتی دشمنی تھی۔ وہ تو ایک فرشتہ تھا اور وہ بھی محض تین برس کا۔ جی ہاں! صرف تین برس کے اس معصوم بچے کو جس سفاکیت اور بے رحمانہ طریقے سے قتل کیا گیا تھا اس نے بچے کی لواحقین کے ہی نہیں ہر اس شخص کا دل چیر کرکے رکھ دیا تھا، جس کو اس سانحے کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ اس الم ناک واقعے نے سوات پولیس کو چکرا کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ پریشان تھے اور سوچ رہے کہ کہ آخر یہ معمہ ہے کیا؟ کیونکہ بچے کے والد کی نہ تو کسی سے کوئی دشمنی تھی اور نا ہی اس نے کسی پر دعویداری کی تھی۔ دوسری طرف اہل علاقہ شدید پریشانی کا شکار تھے کیونکہ ان کو بھی یہ خدشہ کالاحق ہوگیا تھا کہ خدانخواستہ کل کو ان کے بچوں کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوجائے۔ لیکن پھر پولیس کی کوششیں رنگ لائی اور انہوں نے قتل کا سراغ لگا لیا۔ یہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کوششوں اور اعلیٰ صلاحیتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے محض ایک ہفتے کے اندر ہی قاتل کو گرفتار کرکے میڈیا کے سامنے پیش کردیا۔ اس حوالے سے ضلعی پولیس آفیسر محمد

سلیم مروت نے اپنے دفتر میں پریس کانفرنس کرکے جو تفصیلات بتائی ہے۔ اس کے مطابق سوات کے تحصیل بریکوٹ کے علاقے پارڑئی میں بے دردی سے قتل کیے گئے تین سالہ بچے حسنین کا قاتل حمزہ کی عمر بھی محض بارہ سال ہے۔ حمزہ نے مقتول بچے حسنین کے دکاندار باپ سے پتنگ کی ڈوری خریدی تھی اور اسے یہ رنج تھا کہ بچے کے باپ نے اسے ڈوری اپنی اصل قیمت سے خاصی مہنگی دی تھی۔ اسی لیے بارہ سالہ قاتل نے تین سالہ بچے کے باپ کو سبق سکھانے کی ٹھانی۔ اس نے تین سالہ بچے کو پتنگ کے بہانے ایک خالی پلاٹ لے جاکر پہلے بے ہوش کردیا اور پھر بلیڈ سے ذبح کرکے اس معصوم فرشتے کے جسم کو کٹ لگائے اور اس کا عضو خاص بھی کاٹ ڈالا۔

قارئین کرام! پولیس نے تو اپنا کام کردیا۔ انہوں نے جس یکسوئی اور مہارت کے ساتھ اس اندھے قتل کا سراغ لگالیا ہے اس پر وہ داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ لیکن سوچتا ہوں کہ کیا ہم اس المناک واقعے سے کوئی سبق سیکھیں گے؟ کیا ہم بحیثیت قوم اپنے حالات کا جائزہ لے کر آئندہ اس قسم کے واقعات سے بچنے کی کوئی سعی کریں گے؟ یا صرف غمزدہ خاندان کے ساتھ تعزیت و ہمدردی کرکے اس واقعے کو ایسے بھول جائیں گے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس ملک میں علماء کرام کا کردار محراب تک محدود ہوجائے، باپ کے راتوں کا بیشتر حصہ دوستوں کے ساتھ گزرنے لگے اور ماں کو ڈرامے دیکھنے سے ہی فرصت نہ ہو، بچے

مرضی کے ویڈیو گیمز اور مرضی کے فلمز دیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیئے جائے تو اس معاشرے میں بارہ سالہ بچہ اگر قاتل بن جائے، دس سالہ بچہ ہیروئین چی بن جائے اور پندرہ سالہ بچہ ڈاکو بن جائے تو اس پر کسی کو کوئی تعجب نہیں ہونی چاہیے۔ مذکورہ بالا کیس کا بھی آفسوسناک پہلو یہی ہے کہ قاتل نے صاف کہدیا ہے کہ اس نے قتل کا طریقہ فلم دیکھنے سے سیکھا تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے باپ، جس کے اولین ذمہ داریوں میں سے ایک بچوں کی تربیت بھی ہے وہ اس قدر لاپرواہ کیوں ہوئے۔ ماں کہ جس کے گود کو شریعت اسلامی نے بچے کے لیے اولین مدرسہ قرار دیا ہے، وہ اس اہم ترین ذمہ داری سے پہلو تہی کیوں کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسلامی تعلیمات سے دوری ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم شدید معاشرتی افرتفری کے شکار ہیں۔ لیکن آفسوس ناک بات یہ ہے کہ جہاں ہمارے مسائل کا حل موجود ہیں، اس طرف ہمارے قدم اٹھتے ہی نہیں۔ ہمارے آج کے اس معاشرے کا المیہ ہی یہی ہے کہ ہم نے آج اپنی ساری توجہ بچوں کی دنیا سنوارنے پر لگا رکھی ہے۔ جو والدین مالی طور پر مستحکم ہیں ان کی یہی کوشش ہے کہ بچہ اچھے سے اچھے سکول میں پڑھے تاکہ تکمیل تعلیم کے بعد وہ کسی اچھے عہدے پر براجمان ہو جائے تاکہ اس کی زندگی سکون سے گزر جائے۔ دوسری طرف ایک طبقہ وہ ہے جو بچوں کو ابتداء ہی سے کوئی ہنر سیکھنے بٹھادیتے ہیں تاکہ وہ ہنر سیکھ کر کوئی معقول روزگار حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے جوان ہو کر بڑے عہدے تو حاصل کرلیتے ہیں لیکن ان کی اکثریت مفید شہری نہیں بن

پاتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کرپشن کو ہنر سمجھنے ،جوان لڑکیوں کے گھر سے بھاگنے کی واقعات کو روشن خیالی سمجھنے کے بعد اب ہم ''معصوم'' قاتلوں سے بھی اشنا ہو رہے ہیں اور نا جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا؟ اگر ہم نے اب بھی اپنی اصلاح کی فکر نہ کی تو آگے جا کر ہم اس سے بھی بڑی تباہی سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین وقت ضائع کیے بغیر اسلامی خطوط پر بچوں کی تربیت کا انتظام کردیں تاکہ کل کو کوئی اور معصوم فرشتہ دوسرے'' معصوم'' درندے کی درندگی کا نشانہ نہ بنے۔ اللہ پاك رب العزت سے دعا ہے کہ وہ تین سالہ حسنین کی لواحقین کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔ آمین

مسیحا

پشاور کے اس بڑے نجی ہسپتال کے احاطے میں اس بزرگ کو میں دیکھا کہ شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ میں نے ان کے پاس موجود اس کے بیٹے سے پوچھا کہ بابا کو اتنی تکلیف ہے اور آپ اس ڈاکٹر کو دکھانے کی بجائے احاطے میں لٹائے بیٹھے ہیں؟ تب اس نے مجھ سے کہا کہ بابا کے دل کی سرجری ہونی ہے۔ ہم جو پیسے ساتھ لائے تھے وہ کم پڑ گئے۔ ڈاکٹر نے مزید پیسہ جمع کرائے بغیر علاج سے انکار کر دیا ہے۔ اب میرا بھائی واپس گاؤں گیا ہے تاکہ مزید پیسوں کا انتظام کیا جا سکے۔